افغانستان میں جدید دری (فارسی) شاعری

ڈاکٹر غلام محمد لعل زاد
ڈاکٹر شعیب اعظمی



قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند
ویسٹ بلاک۔۱، آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی۔110066

Afghanistan Mein Jadeed Dari (Farsi) Shairey

By : Dr. Ghulam Mohd. Lalzad & Dr. Shuaib Azmi

سنہ اشاعت : اپریل، جون 1999 شک 1921

پہلا ایڈیشن : 1100

قیمت : -/80

سلسلۂ مطبوعات : 826

ناشر : ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک-I، آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی-110066

طابع : جے۔ کے۔ آفسیٹ پرنٹرس، جامع مسجد، دہلی-110006

پیش لفظ

"ابتدا میں لفظ تھا۔ اور لفظ ہی خدا ہے"

پہلے جمادات تھے۔ ان میں نمو پیدا ہوئی تو نباتات آئے۔ نباتات میں جبلت پیدا ہوئی تو حیوانات پیدا ہوئے۔ ان میں شعور پیدا ہوا تو بنی نوع انسان کا وجود ہوا۔ اسی لیے فرمایا گیا ہے کہ کائنات میں جو سب سے اچھا ہے اس سے انسان کی تخلیق ہوئی۔

انسان اور حیوان میں صرف نطق اور شعور کا فرق ہے۔ یہ شعور ایک جگہ پر ٹھہر نہیں سکتا۔ اگر ٹھہر جائے تو پھر ذہنی ترقی، روحانی ترقی اور انسان کی ترقی رک جائے۔ تحریر کی ایجاد سے پہلے انسان کو ہر بات یاد رکھنا پڑتی تھی، علم سینہ بہ سینہ اگلی نسلوں کو پہنچتا تھا، بہت سا حصہ ضائع ہو جاتا تھا۔ تحریر سے لفظ اور علم کی عمر میں اضافہ ہوا۔ زیادہ لوگ اس میں شریک ہوئے اور انھوں نے نہ صرف علم حاصل کیا بلکہ اس کے ذخیرے میں اضافہ بھی کیا۔

لفظ حقیقت اور صداقت کے اظہار کے لیے تھا، اس لیے مقدس تھا۔ لکھے ہوئے لفظ کی، اور اس کی وجہ سے قلم اور کاغذ کی تقدیس ہوئی۔ بولا ہوا لفظ، آئندہ نسلوں کے لیے محفوظ ہوا تو علم و دانش کے خزانے محفوظ ہو گئے۔ جو کچھ نہ لکھا جا سکا، وہ بالآخر ضائع ہو گیا۔

پہلے کتابیں ہاتھ سے نقل کی جاتی تھیں اور علم سے صرف کچھ لوگوں کے ذہن ہی سیراب ہوتے تھے۔ علم حاصل کرنے کے لیے دور دور کا سفر کرنا پڑتا تھا، جہاں کتب خانے ہوں اور ان کا درس دینے والے عالم ہوں۔ چھاپہ خانے کی ایجاد کے بعد علم کے پھیلاؤ میں وسعت آئی کیونکہ وہ کتابیں جو نادر تھیں اور وہ کتابیں جو مفید تھیں آسانی سے فراہم ہوئیں۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کا بنیادی مقصد اچھی کتابیں، کم سے کم قیمت پر مہیا کرنا ہے تاکہ اردو کا دائرہ نہ صرف وسیع ہو بلکہ سارے ملک میں سمجھی جانے والی، بولی جانے والی اور پڑھی جانے والی اس زبان کی ضرورتیں پوری کی جائیں اور نصابی اور غیر نصابی کتابیں آسانی سے مناسب قیمت پر سب تک پہنچیں۔ زبان صرف ادب نہیں، سماجی اور طبعی علوم کی کتابوں کی اہمیت ادبی کتابوں سے کم نہیں، کیونکہ ادب زندگی کا آئینہ ہے، زندگی سماج سے جڑی ہوئی ہے اور سماجی ارتقاء اور ذہنِ انسانی کی نشوونما طبعی، انسانی علوم اور ٹکنالوجی کے بغیر ممکن نہیں۔

اب تک بیورو نے اور اب تشکیل کے بعد قومی اردو کونسل نے مختلف علوم اور فنون کی کتابیں شائع کی ہیں اور ایک مرتب پروگرام کے تحت بنیادی اہمیت کی کتابیں چھاپنے کا سلسلہ شروع کیا ہے۔ یہ کتاب اس سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ امید ہے یہ اہم علمی ضرورت کو پورا کرے گی۔ میں ماہرین سے یہ گذارش بھی کروں گا کہ اگر کوئی بات ان کو نادرست نظر آئے تو ہمیں لکھیں تاکہ اگلے ایڈیشن میں نظرِ ثانی کے وقت خامی دور کردی جائے۔

ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ
ڈائریکٹر
قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند، نئی دہلی

فہرست مضامین

حرف آغاز

افغانستان ایک ایسا ملک ہے جو ایشیا میں بڑی وقعت کا حامل ہے زمانہ دراز سے اس کا جغرافیائی محل وقوع بھی قدرت کا بیش قیمت عطیہ ہے۔ یہ خطہ ہمیشہ مختلف النوع تہذیبوں اور ثقافتوں کا گہوارہ رہا ہے۔ اسے تمدن انسانی کا چوراہا بھی کہا جا سکتا ہے ۔ افغانستان کی اسی خصوصیت نے ایشیائی تاریخ کی تکمیل میں نمایاں رول انجام دیا ہے اور دنیا کی سیاسی، اقتصادی اور معاشی تحریک اور تبدیلی میں معاون رہا ہے۔ اس سرزمین کے فعال اور انقلاب آفریں عوام کو یہاں کی قدیم تہذیبی باقیات اور معنوی روایات میں دریافت کیا جا سکتا ہے۔

افغانستان کے اس افتخار کو اس کی پانچ ہزار سالہ قدیم تاریخ پر محیط، مورخین اور جغرافیہ دالوں کی روشن دستاویزات میں دیکھا جا سکتا ہے اسے آریانا، خراسان اور افغانستان میں معروف ناموں سے یاد کیا جاتا ہے اور مشہور افغانی مورخ، غبار کے بقول اس کا قدیم نام افغانستان، اوستائی عہد (دو ہزار سال قبل مسیح) سے ہے جس کا سلسلہ پانچویں صدی قبل مسیح (ڈیڑھ ہزار سال) تک جاری ہے۔ پھر آریانا، نام جس کا مطلب آریاؤں کا مسکن ہے، تیسری صدی مسیحی تک تھا۔ اور پھر خراساں جس کے معنی مشرق اور طلوع آفتاب کا مقام ہے، کا نام پڑا۔ پھر پانچویں صدی مسیحی سے اٹھارہویں صدی تک (ڈیڑھ ہزار سال تقریباً) کے طویل زمانہ میں ملک افغانستان کے نام سے مشہور چلا آرہا ہے۔ دسویں صدی میں دریائے سندھ سے کابلستان تک، کشمیر اور نورستان سے قندھار و ملتان تک کا علاقہ افغانوں کا مسکن تسلیم ہوتا رہا ہے اور آخر آخر انیسویں صدی میں اس کا سرکاری نام "افغانستان" قانوناً

اور تحریری طور پر تسلیم کر لیا گیا ہے۔

لیکن دری زبان کے وجود اور اس کی پیدائش کے بارے میں افغانی فضلا نے ایرانی دانشمندوں کے برخلاف جو جدید فارسی یا پارسک یا پہلوی یا فارسی میانہ پہلوی ساسانی کو پارسی قدیم کے بطن سے پیدا شدہ گردانتے ہیں، تاریخی واقعات اور جغرافیائی حالات کی سند، زبان شناسی اور اس کی اصل کی شناخت کی شہادتوں کی بنیاد میں لکھتے ہیں کہ "دری زبان اسلام کی آمد سے صدیوں قبل، دریائے آمو کے دونوں کناروں کی بستیوں میں شمالی اور اشکانی پہلوی اور تخاری اور سغدی زبانوں کے اثر سے وجود میں آئی ہے۔

معروف افغانی دانشمند استاد عبدالحیٔ حبیبی نے لکھا ہے کہ اوستائی زبان کی منزل جدید، دری، پشتو اور بلوچی کے زمرہ میں شامل ہے اور ان سب میں دری زبان پانچ سو سال قبل مسیح سے لے کر یعنی اسلام کی آمد سے دو سو سال پہلے، بدخشان تخار، بلخ، بامیان و ہرات، یعنی عہدِ حاضر کے افغانستان میں وجود میں آئی اور اسی سرزمین میں پرورش پا کر اور مکمل ہو کر دوسرے نواحی اور پڑوسی علاقوں میں پھیل گئی۔

انھیں تاریخی حقایق اور اسناد کی روشنی میں افغانستان کے ۱۹۶۵ء کے اساسی آئین کے تحت اس کا سرکاری نام "دری" لکھا گیا اور نام کے اس تجدیدی عمل کے ساتھ افغانستان کی دری زبان کا آزادانہ وجود، جو اس سے قبل، دری کابلی. فارسی افغانی، فارسی کابلی اور زبان تاجکی کے نام سے جانا جاتا تھا، اب مسلّم ہو گیا۔

بہر حال افغانستان کی سرزمین، دری ادب کی پرورش گاہ رہی ہے اس کے بادغیس اور ہرات، ختلوں، جامیوں، سرزمین بلخ (اُم البلاد) مولانا بلخی، شہید بلخی، دقیقی بلخی، ظہیر فاریابی... اور اس کا غزنی حکیم سنائی (متصوفانہ شاعری کے بانی) وغیرہ کے مولد و متوطن رہے ہیں۔ چنانچہ فردوسی، عنصری اور فرخی وغیرہ بھی دربار غزنی کے رونق افزا افراد میں شمار ہوتے ہیں۔ سبک خراسانی جو دری فارسی کا اہم ترین دبستان شاعری کہا جاتا ہے، اسی ملک میں وجود میں آیا اور فروغ کی منزل طے کی۔

دری ادب کے ان فانوسوں کی روشنی نے دنیا کو روشن کیا ہے اور ایسے کمتر

افراد ہوں گے جو دری زبان کے الفاظ سے تو واقف ہوں لیکن ان اشخاص کی شہرت اور ان کے ادبی شہ کاروں سے باخبر نہ ہوں۔

عصر حاضر میں افغانستان کا دری ادب طیاروں اور راکٹوں کے حملہ اور ہنگاموں کے نتیجہ میں ملبے اور کھنڈرات اور خرابوں میں نیست و نابود ہو رہا ہے اور شعر ادب کی جوان جہان لیلائے محمل اپنے اسلاف اور بزرگوں کے کاروان ادب کی راہ کھو کر ہندوستان کی دری پرور سرزمین کی سمت میں پہونچ رہی ہے۔ چنانچہ پروفیسر نورالحسن انصاری مرحوم اور استاد محترم پروفیسر سید امیر حسن عابدی کی تشویق اور حوصلہ افزائی پر اس کام کا آغاز ہوا کہ ہندوستان اور افغانستان کے اس ٹوٹتے ہوئے ادبی رابطہ کو 'عہد حاضر کے افغانستان کی دری شاعری' کے عنوان کے تحت لکھ کر دوبارہ مربوط اور مستحکم بنایا جائے۔

قارئین کرام کو یہ واضح کر دینا ضروری ہے کہ ان کے ہاتھوں میں پہونچی یہ کتاب ان افغان باشندوں اور نوجوانوں کے لیے ہے جو اپنے وطن عزیز کو مجبوراً ترک کر کے سرزمین ہند میں مقیم ہیں اور اس دور کی شعری خدمات سے تقریباً بے خبر ہیں اور ساتھ ہی یہ مقصد بھی ہے کہ ہندوستان کی یونیورسٹیوں اور فارسی داں حلقوں میں افغانستان میں عہد حاضر کے دری شعراء اور ان کی ادبی خدمات سے متعلق کارناموں کی وضاحت ہو جائے۔

یہ ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ ادبیات اور پھر شاعری، ملکوں اور قوموں کے اتحاد اور دوستی کا ایک طاقتور وسیلہ ہے لیکن اصل فن نہ فقط دوستی کی ایجاد اور انسانوں کے درمیان محبت کا ذریعہ ہے بلکہ انسان کی بلند آرزوؤں اور امیدوں کو حقیقت پذیر بنانے، بدعات اور قدیم فرسودہ رسموں کو ختم کرنے، پسماندگی اور جہل کے خلاف جنگ کرنے اور ارتقاعی طرز فکر کو مٹا ڈالنے کا ایک اعلیٰ انسانی فریضہ ہے۔

جیسا کہ اس کتاب کے عنوان سے ظاہر ہے کہ یہ موضوع ایسا وسیع ہے کہ کوئی شخص اس بے کراں اور گہرے سمندر سے تمام گہر ہائے آبدار نکال لانے کا دعویٰ نہیں کر سکتا دری شاعری کے ان روشن اور متنوع گوشوں کو پالینا آسان نہیں تھا۔ یہ امر ہماری اپنی کوششوں اور حاصل شدہ شعراء کے مجموعوں اور منتشر کلام تک دسترس

حاصل کرنے سے ممکن ہوسکا۔

یہ کتاب اصلاً ڈاکٹر غلام محمد لعل زاد کے پی۔ ایچ۔ ڈی کے فارسی مقالہ کا اردو جامہ ہے جسے انھوں نے اپنے رہنما استاد کی شرکت میں ترتیب و تدوین کے مرحلہ سے گزار کر ایک مکمل تصنیف کی شکل دے دی ہے۔

آخر میں آن افغانی، ایرانی اور ہندی استادوں اور دوستوں کا بھی تہہ دل سے شکریہ ادا کرنا بھی ضروری ہے جنھوں نے اپنی معلومات اور علمی و ادبی اطلاعات مہیا کرکے اس کتاب کی اہمیت اور گرانقدری میں اضافہ کیا ہے۔ خداوند کریم سے دعا ہے کہ وہ اس کتاب کو افغانستان کے عہد حاضر کی دری شاعری کے شیدائیوں اور مطالعہ کرنے والوں کے لیے ایک اچھے اور کارآمد ماخذ کا درجہ اور ذریعہ عطا فرمائے۔

ڈاکٹر غلام محمد لعل زاد

شعر دری افغانستان معاصر

(کتاب کے بارے میں)

فارسی شاعری اپنی کیفیت و کمیت کے اعتبار سے اتنی وسیع اور عظیم ہے کہ اس کے کسی ایک گوشہ کا احاطہ بھی تفصیل اور طوالت کا حامل ہوتا ہے۔ فارسی شاعری کے آغاز کے سلسلہ میں قبل از اسلام ایران کی تاریخ پر ایک نظر ڈالا جائے تو بے ربط ہی سہی وہ سلسلہ تاریخ کے تاریک دور تک جا پہنچتا ہے اور فارسی شاعری کی تاریخ تقریباً تین ہزار سال پرانی ہو جاتی ہے۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ فارسی شاعری دربار سے وابستہ رہی اور جب طاقت کا مرکز قدیم اور وسیع ایران یا فارس کے کسی ایک گوشہ میں گیا تو وہاں کے مقامی اثرات لب و لہجہ میں نمایاں ہونے لگے، بار بار طاقت کے مراکز کی منتقلی اور تبدیلی سے فارسی زبان و ادب میں وسعت پیدا ہوئی اور بہت سے نئے نئے گوشے کھل گئے۔ جو اگر ایک ہی جگہ جامد رہتی تو یہ پھیلاؤ نصیب نہ ہوتا۔ بعد میں اس نے اس زبان کو اتنی توانائی بخشی کہ کئی صدیوں تک بین الاقوامی زبان ہونے کا امتیاز حاصل ہوا اور شاید "تاریخ کے دور" میں وہ پہلی بین الاقوامی زبان ہوئی ہے۔

افغانستان کی سرزمین کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ غزنین، سبک خراسانی، کی ترویج میں معاون ہوا۔ سلطان محمود کی یہ خواہش کہ اس کے دربار میں اس زمانہ کے علمائ و فضلاؑ و شعراء و ادباء جمع ہوں بظاہر ایک سلطان کی ضد اور راج ہٹ معلوم ہوتی ہے۔ لیکن اس نے دور دراز کے شاعروں اور ادیبوں کو یکجا کرنے کا موقع دیا۔ سمرقند و بخارا اس سے قبل فارسی شاعری کا مرکز رہ چکا تھا۔ اب تمام فارسی داں دانشور کشاں کشاں چلے آئے کچھ نے محمود کی سخت گیری سے اپنے

آپ کو بچانے کی کوشش کی تو سلطان کے ہرکارے ان کو پکڑ لائے۔ اس مرکز نے ہندوستان میں فارسی کے مستقبل کی راہیں کھول دیں۔

اس کے علاوہ بھی مردم خیز افغانستان میں بلخ و ہرات و کابل بڑے مرکز رہے ہیں۔ مولانا جلال الدین رومی کا اصلی وطن بلخ کا ہونا اس کی ضمانت ہے کہ فارسی ادب کے ایک بڑے ستون کی جڑ وہاں ہیں، زرتشت، ناصر، خسرو، سنائی، محمود شبستری، خواجہ عبداللہ انصاری، علی شیر نوائی اور مولانا عبدالرحمن جامی کا نام میں نے اس لیے نہیں لیا کہ ہاتھی کے پاؤں میں سب کا پاؤں۔ جدید دور کی ستم ظریفی دیکھیے کہ افغانستان جو جغرافیائی اور ثقافتی اعتبار سے برصغیر کے اتنا نزدیک اور قریب ہے اور ذرائع ابلاغ و وسائل عامہ کی موجودگی کے باوجود افغانستان اور فارسی دری کے بارے میں ہماری معلومات بہت ہی کم ہیں۔ ہندوستان میں انگریزی دور میں کوشش کی گئی کہ یہاں کے باشندوں کا تعلق براہ راست نہ ہو بلکہ بالواسطہ ہو، اگرچہ آزادی کے متوالوں نے اس "حصار" کو توڑا، پہلی آزاد حکومت ہندوستان کابل میں ہی قایم ہوئی تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ ٹیگور نے اپنی وشوا بھارتی، شانتی نکیتن میں فارسی کی تعلیم و تدریس کے لیے مولوی ضیاء الدین کا انتخاب کیا۔ "مولوی صاحب امرتسر سے تعلق رکھتے تھے۔ اور کابل کے حبیبیہ اسکول میں عربی کے استاد تھے۔ وہاں سے واپسی میں ٹیگور کے کہنے پر فارسی پڑھانا شروع کیا" یہ گویا ٹوٹے ہوئے تعلقات کو دوبارہ جوڑنے کا سبب ہوا۔

زمان حال میں دری فارسی کا منظر نامہ کو مندرجہ ذیل تین دستوں میں بآسانی تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

۱۔ قدامت پسندوں کا دستہ یا متقدمین۔

۲۔ اعتدال پسندوں کا دستہ یا درمیانہ رو۔

۳۔ جدت پسندوں کا دستہ۔

اس دور کی نمایاں شخصیت محمود طرزی تھے، ان کے والد غلام محمد خان طرزی اور یہ خود سید جمال الدین افغانی سے باہمی تعلقات کی بنا پر نئے نئے خیالات اور افکار کے مخالف تو نہیں تھے۔ لیکن پرانی طرز کے پابند۔ بلکہ طرزی خاندان ایک مدت تک شام اور ترکی میں ملک بدر ہونے کی وجہ سے قیام پذیر تھا۔ ان کی تحریروں پر عربی

اور ترکی کا کچھ زیادہ ہی اثر ہوا۔ اگرچہ محمود طرزی نے بہت لکھا ہے۔ سفر نامے۔ تاریخ، سیاست۔ ان کی نثر و نظم دونوں قدیم انداز کی مسجع، مقفٰی اور عربی اصطلاحات سے پُر۔ مجموعاً اگر دیکھا جائے تو محمود طرزی کا انداز بیان اپنے باپ کی مانند نہیں ہے۔ یہ افغانستان میں بیداری لانا چاہتے تھے اور عالم اسلام میں ترقی و اتحاد کے حامی تھے۔ سید جمال الدین افغانی کے افکار و خیالات کی صدائے بازگشت ان کی تحریروں میں نمایاں ہے۔

اس دستہ میں استاد مستغنی، بیتاب، ملک الشعراء قاری، محمد انور خان بسمل، سرور صبا، ہاشم شائق ایک طرح سے سبک ہندی کے پیرو تھے۔ ۱۲۹۷ھ ش سے قبل تو لے دیکے صرف سراج الاخبار اور ایک ہی چھاپہ خانہ مطبع عنایت، تھا جو سردار عنایت اللہ خان کی کوششوں سے افغانستان میں آگیا تھا۔ لیکن اس کے بعد طرزی اور دوسرے حضرات کی کوششوں کے نتیجہ میں صحافت اور پریس نے ترقی کی۔ بہت سارے رسالے اور مجلے اشاعت پذیر ہوئے۔ امان افغان، ارشاد النسواں، مجلہ ثروت، ہرات سے 'اتفاق اسلام' کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ امان اللہ خان کے دور میں تعلیم کی طرف خصوصی توجہ کی گئی۔ مدارس اور مکاتب کھولے گئے افغانی نوجوان طالب علم دنیا کے مختلف ملکوں میں تعلیم حاصل کرنے بھیجے گئے۔ بعض جدید تعلیم یافتہ نے جدت پسندی کی وجہ سے توازن اور میانہ روی کو ہاتھ سے چھوڑ دیا۔ یہاں تک ہوا کہ قدیم دفتروں کو جلا دیا گیا۔ صرف ۱۷ جلدیں ریکارڈ روم میں ترکستان کے مالیات و حسابات کی بچ پائیں۔ تو شاعروں نے کہنا شروع کر دیا کہ "وقت شعر و شاعری بگذشت و رفت" افغانستان کا معاشرہ جدت پسندی کی جانب اس تیز رفتاری کو برداشت نہیں کر سکا اور ردعمل شروع ہوا۔ "بچہ سقا" کے دور میں حبیب اللہ کلکانی نے طاقت اپنے ہاتھ میں لے کر مدارس و مکاتب کو بند کر دیا۔ اخبارات و مجلات پر پابندی لگا دی، صرف حبیب الاسلام کو اشاعت کی اجازت تھی۔

نادر شاہ کے دور میں علمی و ادبی انجمنوں اور سرگرمیوں کا احیاء ہوا۔ دوسرے دستہ کے لوگوں میں ایک طرح کی جھجک باقی تھی۔ وہ افکار و خیالات

تازہ کا تو استقبال بھی کرتے تھے اور ان کو اپنے کلام میں برتنے کے لیے تیار رہتے تھے لیکن قالب اور ہئیت میں کسی تجربہ کی ہمت ان میں نہیں تھی۔ ان کا خیال تھا کہ جو قالب گزشتہ ایک ہزار برس سے ہماری ضرورت کی تکمیل کر رہا ہے۔ وہ آج کے جدید تقاضوں کا بار بھی برداشت کر سکتا ہے۔

تیسرا گروہ جو جدت پسند ہونے کے ساتھ ساتھ انتہا پسند بھی تھا۔ جس کے خیال میں پرانے قالب کو توڑنا ضروری تھا۔ وہ جدید افکار و خیالات کے لیے نئی ہئیت کے قائل تھے۔ اس دور میں معاشرہ کے ایک بڑے حصہ کو ادب میں بھی نمایندگی ملی۔ خواتین جن کے نازک افکار اور شدید احساسات شاعری کے لیے موزوں ترین تھے۔ کئی صدیوں کے بعد ان کو موقع ملا۔ اگرچہ ان کا کلام پڑھنے کے بعد کچھ گھٹن کا احساس ہوتا ہے۔ خانم مستورہ افغانی، خانم مجوبہ ہروی، خانم ساذقہ ہروی، خانم مخفی بدخشی، خانم شیریں سخن ہروی اور لیلیٰ کادیانی کے نام گنائے جا سکتے ہیں۔

"افغانستان میں جدید دری شاعری" کے ذریعہ سے ہم افغانستان کے معاصر ادب تک رسائی حاصل کر لیتے ہیں۔ لعل زاد و پروفیسر شعیب اعظمی مبارکباد کے مستحق ہیں کہ انھوں نے اردو داں حلقہ پر اس دریچہ کو کھولا۔ افغانستان جو اتنا نزدیک ہوتے ہوئے بھی اتنا دور تھا کہ وہاں کی علمی و ادبی تاریخ اور آج کی ادبی سرگرمیوں کے بارے میں ہماری اطلاعات تقریباً صفر کے برابر ہیں، یہ بھی بڑی ستم ظریفی ہے کہ افغانستان جو جغرافیائی اعتبار سے اتنا نزدیک اور تاریخ کے بعض گوشوں میں ہمارا اور اس ملک کا اشتراک بھی ہے۔ پھر بھی جدید دور میں بہت ہی دور نظر آتا ہے۔ امید کی جاتی ہے کہ اس کی اشاعت سے کچھ تشنگی دور ہوگی۔ لعل زاد صاحب اس لیے اور بھی مبارکباد کے مستحق ہیں کہ نہ صرف ایک نئے اور اہم موضوع کی طرف انھوں نے توجہ کی بلکہ افغانستان کے موجود غیر مستحکم سیاسی اور اقتصادی حالات میں اس طرح کا کوئی کام انجام دینا واقعی "جوئے شیر" ہونے کے مترادف ہے، ان کی ہمت قابل داد ہے کہ اس کام کا بیڑا اٹھایا اور پایۂ تکمیل کو پہنچایا۔

اُردو داں طبقے یقیناً اس کی پذیرائی میں کوئی کوتاہی نہیں کریں گے اور جلد ہی اس کی دوسری اشاعت جو اور بہتر اور مکمل تر ہو گی ممکن ہو سکے گی ۔

(پروفیسر عبدالودود اظہر دہلوی)

پہلا باب

حصولِ آزادی، ۱۹۱۹ء سے لے کر انقلاب ثور ۱۹۷۸ء تک۔ افغانستان کے سماجی، سیاسی، اقتصادی اور علمی حالات

(الف) سماجی اور سیاسی حالات

جیسا کہ ہمیں معلوم ہے کہ شعر و شاعری معاشرے کے حقیقی واقعات کا عینی مشاہدہ ہوتی ہے اور شاعر کا ادراک و احساس اپنے گرد و پیش کے سرچشمے سے مواد حاصل کرتا ہے۔ جب کبھی معاشرہ کے افراد کی زندگی خوش حال اور اطمینان بخش ہوگی اور یا پھر مساوات اور انصاف کا دور دورہ قایم ہوگا تو شاعر قلبی اطمینان اور خوش الحانی کے ساتھ ہی معشوق اور چنگ و رباب کا ساز چھیڑے گا اور جب کبھی عوام کے حالات خراب ہوں گے ظلم و ستم کی کارفرمائی ہوگی اور شاعر اگر چاہے تو ان مظالم کے خلاف صدائے احتجاج بلند کر سکتا ہے، انھیں آشکار کر سکتا ہے اور اگر وہ ایسا نہیں کر سکتا ہے تو بالواسطہ بہت کچھ وہ کہتا ہے اور ان واقعات کو در پردہ باری تعالیٰ کی بارگاہ میں بطور فریاد عرض کرتا ہے اور حالات کی بہتری کا خواستگار ہوتا ہے۔ یہی عوامل افغانستان کی موجود شاعری میں کم و بیش منعکس ہیں۔

افغانی معاشرہ کا مرکب کچھ اس طرح ہے کہ اس کی آبادی کا تقریباً نوے فیصد زراعت پیشہ ہے۔ اُن میں سے اسی فیصد کے قریب دیہات

میں سکون پذیر ہو کر کھیتی باڑی کرتے ہیں اور بقیہ بیس فیصد ملک کی چراگاہوں اور فارموں میں بطور زمیندار مشغول زراعت ہیں لہٰذا کمیت و کیفیت کے نقطہ نظر سے افغانستانی سماج کے بنیادی طبقوں کو کسان اور زمیندار تشکیل دیتے ہیں۔

لیکن مدارس اور مختلف صنعتوں کی تاسیس کے ساتھ ساتھ عوام کی بہت بڑی تعداد علمی اور صنعتی کاموں میں مشغول ہو گئی اور آخری سالوں میں زراعت پیشہ لوگوں کا فیصد کمتر ہوتا گیا چنانچہ افغانستان کے آخری سالوں کے زراعتی اعداد و شمار کے بارہ میں ہم کو ذیل کی یہ عبارت پڑھنے کو ملی ہے:

"زراعت از نقطہ نظر مفاد مثبت و ثمر خود نہ تنہا در بہبود وضع اقتصادی ممالک جہان سوم بلکہ بہ حیثیت کلید انکشاف اقتصادی کشور عزیز ما افغانستان کہ تقریباً بیش از (۷۳) فیصد قوای بشری آن بہ صورت مستقیم و غیر مستقیم و در حدود (۸۵) فیصد نفوس آن در شرائط مشکل اقتصادی، اجتماعی و طبیعی بہ تولید زراعتی اشتغال و آشنائی داری ہنوز محسوب میگردد" [2]

مملکت افغانستان کے مشہور مورخ غبار افغانستان کے سماجی نظام زندگی کے بارہ میں:—

"افغانستان با وجود انکشاف مناسبات سرمایہ داری ہنوز مناسبات فیو دالی (جاگیرداری) و نیم فیو دالی اساساً موجود است، در راس قبیلہ خان و در راس دہ (ملک) قرار دارد علاوہ مثل خانہا و ملک ہا نمایندہ ہالی قوہ ہای عمدہ ہر منطقہ بشمار میروند۔ در قسمت حقوقی احکام شریعت مقدم بر قانون است۔ مرد بر زن رجحان دادہ میشود و زن در میراث

---

[1] میر غلام محمد غبار۔ افغانستان در مسیر تاریخ۔ کابل مطبع دولتی سال ۱۳۴۹ شمسی/ ۱۹۶۷ عیسوی صفحہ ۱۲

[2] معلومات احصائیوی افغانستان (۵۶-۱۳۵۴) ۷۷-۱۹۷۵۔ ادارہ مرکزی احصائیہ کابل سال ۱۳۵۷/ ۷۸ ۱۹ء صفحہ ۱۔

نیمہ مرد حقہ میگیرد، در محاکم شہادت دوزن معادل شہادت یک مرد است،
و در فسخ نکاح و تعدد زوجات ہم مرد مختار است" [1]

محولہ بالا سماجی حالات زیادہ تر محمد ظاہر شاہ (۱۹۳۳ تا ۱۹۷۳ء) کے چہل
سالہ دورہ سلطنت سے متعلق ہیں لیکن امان اللہ خان (۱۹۱۹ تا ۱۹۲۹ء) کے
عہد حکومت میں ملک کے اس سماجی حال کو بہتر بنانے کے لیے بہت سی اصلاحات
وجود میں آئی تھیں۔ چنانچہ ہندوستان کے ایک ادیب یوں رقمطراز ہیں :—

"امان اللہ خان کی جدید اصلاحات پردہ کے رواج کو ختم کرنے، شادی
بیاہ میں انتخاب کی آزادی، ایک سے زیادہ بیوی رکھنے پر پابندی لگانا،
ظلم و جبر سے کام لینا اور بردہ فروشی پر پابندی لگانا، شادی کی کم سے
کم عمر کا تعین، ہسپتالوں کا قائم کرنا، اساتذہ کی تربیت کے
مدارس قائم کرنا، پشتو زبان کی اکادمی کا قیام، مجلس قانون ساز
کی تاسیس منتخب شدہ ممبروں کے ذریعہ اور عدلیہ کا جدا کانہ اور
مستقل نظام جیسی چیزوں پر مشتمل تھیں۔ لیکن ملاؤں کی روزی اور
امتیازات ہی کم کیے گئے اور بعض معاملات میں کچھ چیزیں ممنوع قرار دی
گئی۔ امان اللہ کی بڑائی فقط اس میں نہیں تھی کہ اس نے کیا کارنامے
انجام دیے بلکہ اس نکتہ میں پوشیدہ تھی کہ وہ یہ چاہتا تھا کہ
افغانی جو قرون وسطیٰ کے قفس میں مقید تھے، ان کی رہائی کے
لیے کوئی کام کرے۔" [2]

امان اللہ کے بعد افغانستان کی تاریخ کا سیاہ دور حبیب اللہ معروف
بہ بچہ سقہ (جنوری۔ اکتوبر ۱۹۲۹ء) کے دہ ماہہ دور حکومت سے شروع ہوتا ہے۔
اور تاریخ کے بد ترین دور سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس زمانہ میں نہ صرف کہ

---

[1] میر غلام محمد غبار افغانستان در مسیر تاریخ۔ کابل دولتی۔ سال ۱۳۴۶/

[2] Nripindranath Ghosh the Jewels of Asia Amanullah Indian Times, Sep 1977 P.4

ترقی وپیش رفت کی جانب اقدامات نہ کیے جاتے بلکہ اس کے برعکس امان اللہ خان کے اصلاحی اور روشن فکر اقدامات پر پانی پھیر دیا گیا۔

محمد نادر شاہ کی حکومت کا مقابلہ اگرچہ امان اللہ خاں کے اقدامات اور اصلاحات سے نہیں کیا جاسکتا ہے۔ لیکن پھر بھی ملک کی جدید کاری کے لیے قدم اٹھائے گئے چنانچہ ظاہر شاہی اور داؤد خانی دور کی سرکاری کتابیں اور درسی مطبوعات اس دور کے بارہ میں یہ ظاہر کرتی ہیں:۔

"اعلیٰ حضرت غازی محمد نادر شاہ از ہمہ اول تر آرامی وتامین امنیت کشور کوشید سپس متوجہ اصلاحات وترمیم خرابیہای گذشتہ شد مکاتب دوبارہ باز گردیدہ وجرایدیہ نشرات خود آغاز کرد قانون اساسی دوبارہ ساختہ شد شورائی ملی تاسیس گردید" [1]

لیکن نادر خان (جیسا کہ کہا جاتا ہے کہ دہرہ دون اور پنجاب سے دوبارہ افغانستان گیا تھا) کے بارہ میں ابراہیم خلیل یوں لکھتے ہیں:۔

از حدیث نرم نرم ووضع پنجابی خصال
وز تواضع ہای صنعی وملایم قیل وقال
از سلامہا وخمیدنہای صیادی مثال
ای منافق خلق را باپنبہ میسازی حلال
لیکن میدانیم اوضاع پر افسوس ترا
خوب حس کردیم اکنوں ہرت دوں ترا

یا

شاہ مسلول ضعیف وناتوان ومنحنی
صدر اعظم وحشی ویک تنگ کبر دمنی
آمران وکاردانان جملہ اوباش ودنی
کار خلق از ظلم وبی پروائی شان جانکنی

---

[1] دروس اجتماعی، برائی صنف پنجم۔ وزارت معارف۔ کابل سال ۱۳۵۵ھش / ۱۹۷۶ء صفحہ ۱۱۰

ای مهمان وطن روحانیون پاکزاد
عالمان باعمل مردان بس عالی نژاد
عسکر غیور ملت، افسران خوش نهاد
ای گمرده رنجبر، ای شوق مندان جهاد
همت وجدیتی از ظاهر و باطن کنید
تا بفضل ایزدی فقدان این خاین کنید

کہنا چاہیئے کہ شاعر نے ان اشعار کو زیادہ تر بغیر نام کے پوشیدہ طور پر لکھا اور شایع کیا ہے اور خود اپنے دعویٰ کی بنیاد پر اپنی اس آواز کو عوام تک پہنچا رہا ہے۔

لیکن ظاہر شاہ کے چالیس سالہ دورِ حکومت (۱۹۳۳ تا ۱۹۷۳ء) میں افغانستان کی ترقی بہت آہستہ اور غیر اطمینان بخش تھی لیکن سرکاری نشریات اور رسالے اس عہد کے افغانستان کی پیش رفت کو اس طرح سے ظاہر کرتے تھے۔

"تاریخ افغانستان میں پہلی بار افغانستان کی ترقی اور بھلائی کے لیے پنج سالہ منصوبہ وجود میں لایا گیا۔ عام سڑکیں پختہ کی گئیں سرنگیں کھودی گئیں، باندھ اور نہریں تعمیر ہوئے اور کپڑے کی ملیں قایم ہوئیں داخلی اور خارجی تجارت کو بڑھاوا دیا گیا اور خواتین کو دوبارہ آزادی دی گئی۔" [1]

افغانستان کی بساط سیاست پر داؤد خاں کی دوبارہ آمد اور نئے نظام کی تبدیلی کے ساتھ شہنشاہیت سے جمہوریت کے دور تک کئی اصلاحات اور تبدیلیاں معرض وجود میں آئیں۔ بقول کسی جمہوری انقلاب کے بعد سیاسی امور میں، اجتماعی، اقتصادی اور علمی میدان میں ملک کے اندر بنیاد تغیرات رونما ہوئے۔ بعض قوانین اور دستور وضع ہوئے۔ اسی طرح اساسی قوانین کو بنانے

---

[1] ابراہیم خلیل۔ مبلغ الحقائق۔ مجلہ ژوندون۔ شمارہ ۳۹-۳۸۔ جدی، دسمبر ۱۹۷۸/۱۳۵۷ء صفحہ ۳۳

کا کام جاری ہے۔ اُن بے زمین لوگوں کے لیے جن کی اقتصادی حالت اچھی نہیں تھی۔ حکومت کے پروجکٹ کے تحت انھیں زراعتی زمینیں عطا ہوئیں اور بینکوں کو قومیالیا گیا۔[1]

ایک ہندستانی ماہر اقتصادیات کے خیال میں داؤد خان اور لبعد کی اصلاحات قدیم نظام کو الٹ دینے اور اقتصادی اور اجتماعی نظام کے تحت نئی اصلاحات کے وعدہ کے تحت وجود میں آئے۔ داؤد نے ملک کو جدید بنانے کے لیے بہت زیادہ کام کیے اور معاشرہ اور اجتماعی اصلاحات کو زیادہ سے زیادہ باعمل بنایا۔ مثال کے طور پر عورتوں کو اختیار دے دیا تاکہ وہ اپنے بُرقعے (رفع حجاب) اُتار پھینکیں۔

لیکن ۱۹۷۳ء کا انقلاب لوگوں کے ارمانوں اور آرزوؤں کی تکمیل کے بجائے ناکامی اور مایوسی پر اختتام پذیر ہوا اور ملک کے بائیں بازو والے گروہ جنھوں نے داؤد کی مدد صرف ملک میں اقتدار حاصل کرنے کے لیے کی تھی یہ سمجھ لیا کہ وہ اُن سے الگ ہوتا چاہ رہے ہیں۔ چنانچہ یہی چیز ۲۷ اپریل ۱۹۷۸ء کے کودتا (انقلاب) کی تشکیل دہی کرتی ہے چنانچہ جمہوریہ ڈیماکریسی افغانستان کی حکومت کے صدر مملکت نور محمد تراکی نے خود اپنے بیان میں لوگوں کے فلاح وبہبود اور ملک کی سماجی ترقی کے معیار کے بارے میں ڈیماکراٹیک زمینی اصلاحات کا ذکر کیا۔[2]

سیاسی حالات کے نشیب وفراز اور اس کی تبدیلیاں وقتاً فوقتاً شعرا کے طرزِ فکر اور کلام میں بیان ہوتی رہی ہیں۔ ان سب میں سے پروفیسر خلیلی کی دو نظمیں جن میں سے ایک ۱۳۲۹ھ ش / ۱۹۵۰ء اس وقت منظوم ہوئی جب داخلی حالات پر سکون تھے اور شاعر بیرونِ ملک کے واقعات کی طرف متوجہ ہو کر پاکستان کے نام ایک پیام میں، قبائلیوں کے ساتھ اُس ملک کی طرف سے کی گئی سختیوں کے بارے میں لکھ رہا تھا بعد کے پیام کو پاکستان کے موجودہ رہنما کے

---

[1] دروس اجتماعی صنف پنجم ص ۱۱۷ – ۱۱۸

[2] Ram Rahul, Modern Central Asia, Vikas Publication House, New Delhi, 1977 PP. 41-42.

بارے میں اس وقت منظوم کیا ہے جب وہ وطن سے دور ایک آوارہ و بے خانماں انسان کی زندگی بسر کر رہا ہے اور اس ملک اور وہاں کے عوام کو پہلے دشمن قرار دیتا تھا اب ان سے تعاون اور ہمدردی کا جویا ہے۔ اگرچہ یہ دونوں منظومے بہت طویل ہیں لیکن یہاں وہ اشعار جو براہ راست ان حالات سے مربوط ہیں نقل کیے جاتے ہیں:۔

پیام بہ پاکستان ۱۳۲۹

صبا اگر گذرا فتد ترا بہ پاکستان — پیام من بہ بزرگان آن دیار رسان
از آن فسون کہ دمیدی بہ موم بنگال — بر قبایل آزاد شیر گیر خوان
بخواب گاہ پلنگان بہرزہ راہ مجوی — کہ ماندہ ہانتوان کام دل گرفت آسان
دریغ از تو کہ خواہی بمکر و حیلہ و زرق — بنای وحدت اسلام را کنی ویران
مشو مقابل قومیکہ دادہ است بتو — بجای بت کدہ ویت مساجد و قرآن
اگر ترا نشود گفتہ ہای من باور — زجای خویش مرو این گو است این میدان

لیکن اس قوم اور ملک کو جسے ۳۰ سال پہلے مکار بہانہ جو اور اسلام کی بنیاد کو ڈھانے والا جانتا ہے آج اسی کشور کے رہبر اور صدر مملکت کو مسلمانوں کا علمبردار اور جانشین شیر یزداں کہہ کر یوں مخاطب ہوتا ہے۔

پیام بہ ضیاء الحق

شو ضیاء الحق چراغ آرزوی مسلمین — شو علمدار مسلمان، شو ہمین سرباز دین
جانشین شیر یزدان شو در خیبر گشا — در مقام خالدی، میدان محشر آفرین
مسند محمود غازی شہسوار بت شکن — آنکہ میلرزید از وی ہند تا دریای چین

ای تو محمود بزرگ بت شکن را جانشین | پایماں لشکرایں بی خدایان تا بہ کی
ای ضمیر روشنت با پرتو ایمان قرین[1] | حالت امروز ما آینده فردای تست

(ب) اقتصادی حالات

کسی سوسائٹی یا فرد کی اقتصادی زندگی اُس کے طرز زندگی انداز فکر اور طرز بیان پر ایک قطعی اور قابل توجہ اثر ڈالتی ہے۔

اگر لوگوں کے اقتصادی اور معاشی حالات بہتر ہیں تو پھر عیش و نشاط کی محفلوں اور مَی و معشوق کا ذکر لازمی ہے اور اگر سوسائٹی فقر و پسماندگی اور بدبختی سے دوچار ہے تو عوام کی منفلوک الحالی کا رونا ہوگا، غریبی، مفلسی نابرابری اور بھوک کا ذکر زیادہ ہوگا۔

شاعر اور ادیب وہ فکر اور وہ حس جو اُس کے درد مند دل اور طباع ذہن میں ہے، ان حالات اور واقعات سے بہت متاثر ہوتا ہے۔ بہت جلد اور بہتر طریقہ پر معلوم و محسوس کر لیتا ہے اور پھر اپنی تحریر کے ذریعہ اُسے واضح کرتا ہے۔ اقتصادی معاملات بھی ایک سوسائٹی سے دوسری سوسائٹی میں مختلف ہوتے ہیں۔ اور موسس اشتراکیت اینگلز کے بقول اقتصادیات کا ایک مسئلہ کبھی سارے وقتوں کے لیے اور تمام انسانی سماج کے لیے یکساں نہیں رہا ہے بلکہ تاریخ کے ہر دور میں ہر مملکت کے لیے اقتصادیات کے معینہ موجود رہے ہیں۔[2]

مغرب کا دوسرا ماہر اقتصاد " مارشل " انسان پر اقتصادی اثرات کی تشریح اس طرح کرتا ہے۔ " اقتصاد ' انسان کی عادی زندگی کے مطالعہ سے عبارت ہے۔ اور اسی انفرادی اور اجتماعی عمل کو تحقیق کا موضوع قرار دیتا ہے۔ کیوں کہ یہی حاصل شدہ نتائج اور سماج کی فلاح کے پروگرام زیادہ تر نزدیکی رابطہ رکھتے

---

[1] ماتم سرا خلیل اللہ خلیلی، نوروز ۱۳۶۰۔ مارچ ۱۹۸۱
امریکا ۴۶۔۴۷

[2] نظرزادہ، زندگی نوین، چاپ سوم، کابل ۱۳۵۷ش، ۱۹۷۸ء ۱۶۲۔۱۶۳

ہیں۔[1]

جدید افغانستان کے ارباب اقتدار ملک کی اقتصادیات کی اہمیت متوجہ رہے ہیں۔ چنانچہ بعضوں نے ملک کے اقتصادی اور مالی حالات کی بہتری کے لیے قطعی اقدامات کیے ہیں اور ان سب میں ترقی پسند بادشاہ اعلیٰ حضرت امان اللہ خان غازی نے ۲۸ فروری ۱۹۱۹ء کو افغانستان کے عوام کو خطابیہ اعلان یہ فرمایا اور اس مسئلہ کی اہمیت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ وہ کام جو اقتصادیات کی بنیادی اینٹ کو تشکیل دیتا ہے اُسے مکمل طور پر آزادی اور اولیت دی جانی چاہیئے۔ انھیں کے خیال میں جبری محنت اور بیگار زندگی کے تمام میدانوں میں ممنوع اور جرم ہے۔ اُن کی حکومت افغانستان میں وہ اصلاحات کرے گی کہ قوم و مملکت دونوں ہی دنیا کی مہذب قوموں کے درمیان اپنا مناسب اور جائز مقام حاصل کرلے۔[2]

امان اللہ خاں کے دور حکومت میں تمام اقتصادی اصلاحات کے بارے میں اس طرح لکھا گیا ہے:—

امیر امان اللہ خان در مرحلہ نخستین بہ تطبیق اصلاحات خود موفق و کامیاب بود و آن اینکہ او در برابر اکثریت ملت (دہقان و مالدار و پیشہ ور) تحصیلات ثقیل سابق را سبک ساخت شد، ضایع تشویق شد تجارت نیز ساحۂ وسیعتری یافت و در نتیجہ این ریفورمہای انکشاف، سرمایہ داری تسریع گردید. . . . . دولت امانیہ درصدد تورید فابریکہ ہا و تمدید خط آہن در افغانستان برآمد و در لوی جرگہ ۱۳۰۷ھ ش (۱۹۲۸) توضیح نمود کہ دولت برای تہیہ یک فابریکۂ ترمیم طیارات داخل اقدام است و بہ علاوہ فابریکہ موجودہ یک فابریکۂ دیگری برای ساختن باروت سفید دایر می کند ...[3]

---

[1] K.K. Dewell - I.D. Verma, Refresher Course in Economic Theory, S. Chand Co. Ltd. Delhi, 1978, PP.11.

[2] میر غلام محمد غبار، افغانستان در مسیر تاریخ۔ کابل ۱۳۴۶ھ شمسی، ۱۹۶۷ء ص ۷۵۲

[3] ″ ″ ″ ″ ص ۷۹۱-۷۹۲

امان اللہ نے افغانستان کی ترقی کے لیے بہت زیادہ کوشش کی ہے اور اہم بنیادی صنعتوں اور زندگی کی ضرورت والی چیزوں کے کارخانے قایم کیے چنانچہ بدخشاں کے لاجورد کی کانوں، ہرات کے تیل کے کارخانے اور ایک فولادی بھٹی کے کارخانے کا قیام لوہے کی کانوں کی کھوج، کوئلہ، گندھک، ابرق، تباشیر، سنگ مرمر، سفید مٹی اور مختلف رنگوں کی ریسرچ اور تیاری سے متعلق مختلف پروگراموں کی اسکیم بنی، جنگل پاکتیا اور اسمار کی تنظیم و تربیت کے لیے ادارے قایم ہوئے۔ گھوڑوں کی افزائش نسل، قرہ قل کی نسل کو عام بنانے اور ریشم کے کیڑوں کی پرورش کے لیے منصوبے بناتے۔ کابل میں قومی صنعتوں کی نمایش کا اہتمام کیا گیا اور سرکاری ملازمین کے لیے ملک کے بنے ہوئے کپڑے کا لباس لازمی قرار دیا گیا۔ ان اصلاحات کے نتیجہ میں حکومت کی آمدنی پہلے کے مقابلے میں دوگنی ہوگئی۔ اور ۸۰ ملین روپیہ سالانہ سے بڑھ کر ۱۸۰ ملین روپیہ ہوگئی۔ اس وقت افغانستانی روپیہ کی قیمت کابل کا سو روپیہ ہندستان کے ۱۰۰ روپیہ کے برابر تھا۔ اس لیے کہ چاندی کے سکّہ کا وزن ڈھائی مثقال اور سابق چاندی کے سکّہ کا وزن ۲ مثقال (۹ گرام) تھا۔[1]

امان اللہ شاہ کی دس سالہ حکومت (۱۹۱۹) کے بعد افغانستان کی عصری تاریخ زیادہ تر ظاہر شاہ کے چالیس سالہ دورہ سلطنت (۱۹۳۳ تا ۱۹۷۳) کے گرد و پیش گھومتی ہے۔ اس لیے کہ سقاؤ بچہ حبیب اللہ کی حکومت دس مہینے سے کم اور نادر شاہ کی حکومت (ان دونوں سے ۱۹۲۹ تا ۱۹۳۲) تقریباً تین سال سے زیادہ نہ تھی۔

ظاہر شاہ کی سلطنت کے زمانہ میں اقتصادی حالات کی تحقیق اس طرح ہوئی ہے۔ یعنی اس وقت کے افغانستان کی اقتصادی بنیاد کو زراعت مستحکم بناتی ہے۔ حکومت کے اعداد و شمار کے حساب سے ۱۹۶۳ء کے سال میں سرکاری اعداد و شمار کے مطابق ملک کی قابل کاشت زمین تقریباً ۱۴ ملین ہیکٹر تھی ان میں سے صرف ۷ ملین اور ۸ سو ہزار ہیکٹر زمین پر زراعت کی جارہی ہے۔ فی نفر اوسط تقریباً ۱۵۰ کلو گرام غلہ کی پیداوار ہے۔ جب کہ فی نفر اوسطاً ۲۳۵ تا ۲۴۵ کلو گرام غلہ کی پیداوار کی

---

[1] میر غلام محمد غبار۔ افغانستان، مسیر تاریخ کابل، ۱۳۴۶ھ، شمسی، ص ۱۸۱

ضرورت ہے۔

جاگیردارانہ نظام اور قبائلی طرز زندگی نے دیہاتوں میں زراعت کی خامیوں اور آبپاشی کے ناقص اور ناکافی وسائل کی بنا پر زراعتی ترقی کو روک دیا ہے۔ پوری آبادی کا نوے فیصد زراعت میں مشغول رہتا ہے اور ستر فیصد سے زائد عام قومی پیداوار کو زراعت کا حاصل ہی پورا کرتا ہے اور تقریباً ملک کی ساری برآمدات افغانستان کی یہی زرعی محصولات ہے۔

افغانستان میں ملکی اقتصادیات میں باغبانی اور شجرکاری بہت بڑی اہمیت رکھتے ہیں اور داخلی طور پر سالانہ خرچ کے علاوہ تقریباً پچاس ہزار ٹن انگور، کشمش، انار، پستہ، بادام وغیرہ بیرونی ممالک کو بھیجا جاتا ہے۔ کمبل اور قالین بھی افغانستان کی برآمدات میں اہم چیزیں ہیں۔

افغانستان کے بڑے زمیندار خود زراعت کا شغل نہیں کرتے ہیں اور زیادہ تر تجارت ــــ سرکاری عہدوں کا پیسوں کے لین دین کا کاروبار کرتے ہیں۔ منقولہ اور پارچہ جات کے کارخانوں میں زمان شاہ کے عہد کے افغانستان کا تقابلہ اپنے پڑوسی ممالک کے ساتھ اس طرح کیا گیا ہے:ــ

۱۹۶۳ء میں ملک میں برقی طاقت کی پیداوار فی نفر ۱۲ کیلو واٹ ہر گھنٹہ تھی جب کہ ہندوستان میں ۱۔ ۴۵ کیلوواٹ گھنٹہ، پاکستان میں ۵ ــ ۱۵ اور ایران میں ۴۴ کیلوواٹ گھنٹہ تھی۔ اسی طرح سیمنٹ کی پیداوار کا توازن افغانستان میں فی نفر ۹ ــ ۷ کیلوگرام تھا۔ ہندوستان میں یہ نسبتاً ۹ ــ ۱۷ کیلوگرام۔ پاکستان میں ۱ ــ ۱۲، ترکی میں ۳ ــ ۳۰ کیلوگرام اور ایران میں ۲۸ کیلوگرام تھا۔

ملک کی سالانہ آمدنی ۱۹۶۳ء میں پانچ ملیا دار ۳۳۵ ملین افغانی روپیہ تھی۔[1] محمد داؤد کے عہد حکومت (۱۹۷۳ تا ۱۹۷۸ء) میں ملک کی اقتصادی حالت قدرے بہتر ہوئی اور بیرونی ذرائع سے ملک کی اقتصادی ترقی کے لیے امداد برسنا شروع ہوئی، چنانچہ اس کے نتیجہ میں عام قومی پیداوار ۱۳۵۴ شمسی (۱۹۷۵ء) میں ۴ ــ ۱۲۶ ار

---

[1] میر غلام محمد غبار افغانستان در مسیر تاریخ۔ کابل ۱۳۴۹ھ شمسی صفحہ ۱۱ ــ ۳۰

ملیارد افغانی سکہ اور ۱۳۵۵ش (۱۹۷۶ء) میں ۳۸۰۸ ملیار افغانی روپیہ تک پہنچ گئی اور ۱۳۵۴ش میں قومی آمدنی ۲-۸۲ ملیار د افغانی روپیہ اور ۱۳۵۵ش کے سال میں (۴-۸۹) ملیار و افغانی روپیہ تھی اور ۵۶ ش میں (۴۷-۹۶) ملیار و افغانی روپیہ پہنچ گئی ... [1]

انقلاب ثور کی کامیابی کے نتیجہ میں اور نور محمد ترہ کی کے (۹-۱۹۷۸ء) زمانہ میں اقتصاد حزب کے پروگرام کے مطابق توجہ کا مرکز بنا چنانچہ ترہ کی نے پانچ جدی ۱۳۵۷ش (۲۶ دسمبر ۱۹۷۸ء) کو فوجی عہدیداروں کو اس بارے میں ایک خطابیہ بیان میں اس طرح کہا تھا:—

"انقلاب بزرگ ثور قدرت سیاسی را بہ حزب ما انتقال داؤد حزب قدرت بزرگ است ولی اکنون دورہ دیگری آغاز شدہ است کہ از ین ہم مہمتر وار زشمند تری باشد واین دورہ اعمار و ساختمان جامعہ جدید افغانستان است۔ در کشور ما قدرت بدست خلق افتادہ است و نود و ہشت درصد خلق کشور ماست کہ زحمت کشیدہ اند ویا زحمت می کشند زحمت کشان اند، تولید می کنند و در جامعہ افغانستان نقش بزرگ و قاطعی دارند، الذا ما دیگنا توری آنہا را برآں ذردانیکہ خون آنہارا مکیدہ اند، بہ میان می آوریم و این عین دی موکراسی و شکل عالی دیموکراسی است ...... اکنون دہقاناں ما بصورت شعوری و آگاہانہ زمین ہا ہائیشان را آباد خواہند کرد۔ زیرا قبلا فکر میکردند کہ برای کی آبادش میکنند و معاش بہ کی تکیہ میکنند اما حالا کہ ہمہ چیز بہ آنہا تعلق دار دیس در راہ آبادانی کشور خود سہم موثری خواہند گرفت کارگراں ما نیز کہ حزب و دولت و ہمہ چیز از آن آنہا است"[2]

(ج) علمی وادبی حالات

کسی معاشرہ کے علمی وادبی حالات بھی سماج کے دیگر مظاہر کی مانند گردو پیش اور

---

[1] معلومات احصائیوی افغانستان (۵۳-۵۴-۱۳۵۵) - ال ۱۳۵۶ (۱۹۷۷) کابل ص ۴۲۶

[2] مجلۂ ژوندون شمارہ ۳۸-۳۹- ۳ سابر ۱۹۷۸ء کابل ص ۴۲

وقت کے حالات کے تابع ہوا کرتے ہیں اور تبدیلیوں اور انقلابات کے ساتھ بدلتے رہتے ہیں۔ چنانچہ ہمیں معلوم ہے کہ تعلیم و تربیت انسان کے اصل عنصر اور لکھنے پڑھنے کے بنیادی مقاصد کی تشکیل کرتی ہے اور شاعر کے کلام میں یہ عناصر بدرجہ اتم پائے جاتے ہیں یعنی اگر شاعر نے اعلا تعلیم حاصل کی ہوگی، اپنے ملک کی اقتصادی اور سماجی زندگی کو زیادہ بہتر طور پر سمجھے گا اور مربوط و موثر اشعار منظوم کرے گا اور یہی تعلیم و تربیت اُسے اپنے اشعار کو صنایع و بدایع سے مزین کرنے میں معاون ہوگی ورنہ دوسری صورت میں معاملہ اس کے برعکس ہوگا۔

افغانستان میں امان اللہ خاں (۱۹۱۹ء۔ ۱۹۲۹ء) سے قبل تعلیم و تربیت زیادہ تر مذہبی بنیادوں پر قایم تھی۔ اور مدرسوں کی مدد سے دینی مدارس میں اور ملاؤں کے ذریعہ مساجد میں دی جاتی تھی۔ فارسی کتابوں میں سے پنج گنج، تحفہ نصایح، گلستان، بوستان، دیوان حافظ وغیرہ درسی نصاب میں شامل تھیں۔ طبقہ نسواں سرے سے علم جیسی نعمت سے محروم تھا۔ لیکن افغانی مورخ کی تحریر کے مطابق، امان اللہ خان نے برطانوی حکومت سے حساب کتاب کی صفائی کے بعد ملک کی اندرونی اصلاحات میں مشغول ہوگئے۔ افغان عوام جو کہ ترقی اور تجدد کے خواہش مند تھے، مکمل طور پر حکومت کی ہمراہی اور مدد پر آمادہ ہوگئے۔ اور تمام جدید اصلاحات کا استقبال کیا۔۔۔۔۔۔ جدید علوم کی اشاعت میں عوام نے ہر روپیہ پر چند پیسہ ٹیکس "اعانہ معارف" کے نام پر دینا قبول کیا اور یہاں تک کہ ملک کی خواتین نے مقامی مدرسوں میں ارشاد النسواں کی اشاعت اور انجمن حمایت نسواں" کی تاسیس میں جوش و خروش سے حصہ لیا۔ [1]

امان اللہ خان نے افغانستان کی ہمہ جہت ترقی کے لیے مجموعی طور پر علوم کی ترقی میں زیادہ کوشش کی اور بیرونی ممالک سے اساتذہ ملازم رکھے اور متعلمین و متعلمات کو بیرونی ملکوں اور خصوصاً ترکی کو بھیجا چنانچہ "آیندہ" کے مدیر اور مصنف ڈاکٹر افشار لکھتے ہیں:۔

جس وقت افغانستان چالیس بیالیس سال قبل امیر امان اللہ خان بادشاہ

---

[1] میر غلام محمد غبار، افغانستان در مسیر تاریخ۔ کابل ۱۳۴۶ ش ۱۹۶۷ء ص ۷۸۹

آزادی خواہ اور وطن پرست نے انگریز اور امپریلسٹ برطانیہ ہند سے آزاد ہوا (یہ فاضل دوست افغانی ادیب جناب ڈاکٹر سہیل کو جمہوریت نام کی جدید اخبار کے بانی کی حیثیت سے پکارے جاتے ہیں اور ان کے خیالات کو مغربی جرمنی میں افغانستان کی تاریخ کے سلسلہ میں نقل کرتے ہیں چونکہ افغانستان نے اپنی آزادی ۱۹۱۹ میں حاصل کر کے داؤد خان کے ذریعہ ۱۹۷۳ء میں جمہوری نظام کا اعلان بھی کیا کہ آزادی کی ابتدا ہوئے ۵۴ سال گزر چکے ہیں نہ کہ جیسا جناب عالی نے چالیس بیالیس سال لکھا ہے۔ وہ شخص جو کہ تاریخی حقایق کے پردوں سے افغان مورخین اور ادیبوں کے توسط سے شکوہ سنج تھا، اب ہم دیکھتے ہیں کہ وہ خود اس ملک کی آزادی کی تاریخ کو جس نے پہلی بار اپنی آزادی کو مشرق میں استعماری برطانیہ کے طاقت سے حاصل کر لیا تھا اس طرح نادرست بیان کرتے ہیں) اپنے جدید علوم کے لیے ایران سے معلم طلب کیے اور اس ملک سے بہترین تعلقات قایم کیے"۔[1]

اسی طرح "نگاہی بر نقش فرہنگی افغانستان در عہد اسلامی" نامی کتاب میں ۵۴ کتابیں درسی کتابوں کے عنوان کے تحت اور ۲۴ کتابیں مختلف عنوانات کے تحت مذکور ہیں۔ جو اعلیٰ حضرت امان اللہ غازی کے زمانہ میں شایع ہوئی ہیں اور لڑکے لڑکیوں کے مختلف مکاتب اور مدارس کے قایم کرنے کے ذکر کے ساتھ ساتھ پریس کے سلسلہ میں یوں لکھا ہے۔

"مطابع مختلف حروفی دستگی بکار افتاد از آں جملہ است مطبع معارف، مطبعہ امان، شرکت رفیق، ادارہ انیس، شرکت کاظمی وغیرہ"۔[2]

---

[1] دکتر محمد افشار، وقایع نگاری و تاریخ نویسی در ایران و افغانستان بخش دوم، گوہر سال ششم شمارہ دوم۔ اردی بہشت ۲۵۳۷ شمسی، تہران ص ۱۰۸

[2] پوہاند (پروفیسر) ڈاکٹر جاوید نگاہی بر نقش فرہنگی افغانستان در عہد اسلامی وزارت اطلاعات و کلتور مدیریت سالنامہ کابل ۱۳۵۵، ۱۹۷۶ء ص ۱۴۲-۱۴۷

ملک کی علمی کیفیت اُن اعداد و شمار سے جو کہ شاہ کے زمانہ میں شایع ہوئی ہیں بہ خوبی ظاہر ہوتی ہے اور جیسا کہ غبار نے لکھا ہے کہ عام تعلیم و تربیت وزارت تعلیم کے تحت ہے ۔ حکومت کے حساب کے مطابق افغانستان میں ۱۳۴۰/۱۹۶۱ء میں دس فیکلٹیاں اکتیس روایتی مکاتب، بائیس اعلا مدارس، باون مڈل اسکول پانچ سو تینتیس ابتدائی اسکول اور سات سو اٹھاسی دیہی مدارس یعنی مجموعی طور پر ایک ہزار چار سو چھتیس مکتب قایم ہیں جن میں دو سو بینتیس ہزار اور تین ایک طالب علم (لڑکے لڑکیاں) تعلیم پا رہے تھے ۔ طالبات کا تناسب طلبہ کی تعداد کے مقابلہ میں تقریباً ایک اور سات کا تھا ۔ علاوہ ازیں تقریباً ۳۶ مذہبی ادارے افغانستان میں موجود ہیں جو تقریباً تین ہزار طالب علموں کو اسلامی فقہہ اور حفظ قرآن کا درس دیتے ہیں۔ افغانستان کی آبادی کے حساب سے متعلمین کی تعداد کا تناسب دو فیصد ہے ۔ ہندستان میں ۹ــ۹ فیصد، پاکستان میں ۳ــ۷ فیصد اور ایران میں ۸ فیصد ہے ۔ افغانستان میں پڑھے لکھوں کی تعداد ملک کی پوری آبادی کا فیصد ۴ سے بھی کم ہے [1]

چونکہ مطبوعات اور پریس اب تک ۱۳۴۳/۱۹۶۴ء کاملاً حکومت کے ہاتھ میں ہیں لہٰذا سارے رسالے، ماہنامے، روزنامے حکومت کے نقطۂ نظر کا اظہار کرتے ہیں ۔ سیاسی اور سماجی حصوں میں تبلیغ کا سلسلہ یک طرفہ پروپگنڈہ کے مترادف ہے۔ ملک کے جوان ادیب و شاعر بھی سیاست کے آداب و مراسم اور چہاردیواری میں قید ہیں ۔ اس لیے کہ حکومت کی سخت پابندیوں نے یہ اجازت نہیں دی ہے کہ جو کچھ دیکھتے ہیں یا جانتے ہیں اُسے آزادانہ بیان کر سکیں ۔ اسی کے ساتھ ساتھ ملک کا ادب انقلاب کی محرکات کے مرحلوں کے ساتھ گزشتہ دور سے نئے دور میں داخل ہو گیا ہے [2]

بعد کے دو دہوں (۱۳۴۳/۱۳۵۳/۱۹۷۴ء) کی تعلیمی کیفیت جب کہ افغانستان میں جمہوریت کے آغاز کا آخری سال تھا، نے اپنی ترویج و ترقی کو باقی رکھا اور نسبتاً

---

[1] میر غلام محمد غبار، افغانستان در مسیر تاریخ کابل، سال ۱۳۴۶/۱۹۶۷ء صد ۱۵

[2] 〃 〃 〃 〃 〃 〃 〃 〃 صد ۱۰

پیش رفت ہی کی اور حکومت کے محکمہ تعلیم میں علوم کی تحقیق کے لیے خصوصی بجٹ کا خیال رکھا گیا۔ چنانچہ وزارت تعلیم کا مجموعی بجٹ ۱۳۵۳ میں ۹۹۸۸ ملین افغانی (ان سالوں میں تقریباً افغانستان کا چھ روپیہ ہندوستان کے ایک روپیہ کے برابر تھا۔ ۱۳۵۴ کے سال میں ۱۲۳۸-۸ ملین اور ۱۳۵۵ میں ۱۶۶۳-۲ ملین افغانی اور اعلا تعلیم کی وزارت کا بجٹ انھیں سالوں میں علی الترتیب ۲۱۶-۸، ۲۸۹-۱ اور ۳۱۵-۷ ملین افغانی روپیہ رہا ہے[1]

ان موجودہ سالوں میں ۷۰۰۳۰۰ دانش آموز لڑکے اور ۱۱۴۳۰۶ طالبات اور ۷۴۹۱۳۶ طالب علم اور ۱۲۳۷۴۴ طالبات اور ۱۳۵۵ میں بھی ۸۰۴۹۳ طالب علم لڑکے اور ۱۲۲۳۹۳۷ طالبات لڑکیاں تعلیم میں مصروف تھیں۔ باوجودیکہ ان میں اعلا تحصیلات (یعنی کالج) کی تعداد شامل نہیں ہے[2]

۱۳۵۹/ ۱۹۷۷ء میں طالب علموں کی تعداد بڑھ گئی اور مزکر طالب علموں کی تعداد ۸۲۴۲۵۰ اور لڑکیوں کی تعداد ۱۵۲۱۱۲ تک پہنچ گئی[3]

---

[1] معلومات احصائیوی افغانستان (۵۴-۱۳۵۵) وزارت پلان کابل سال ۱۳۵۹ ص ۲۰۴

[2] " " " " ص ۳۰۶

[3] " " (۱۳۵۶-۵۴) " ص ۴۵۸

دوسرا باب

جدید دری شاعری کی خصوصیات

شعر و ادب اپنے عہد اور زمانہ کا حاصل اور سیاسی اور اجتماعی تغیرات کا نمایندہ ہوتے ہیں اور وہ تاریخی گردش جو افغانستان کے عوام اور خصوصاً شعرا پر اپنے اثرات چھوڑ گئی وہ اعلا حضرت امان اللہ خاں غازی کے زمانہ میں ۱۹۱۹ء میں افغانستان کی آزادی حاصل کرنا تھا۔ اگرچہ اس سے قبل بھی شاعروں نے اپنے تاریخی ورثہ کے مطالعے اور استعماریت کے خلاف اپنے مخالفانہ جذبے اور پھر عوام کی آرزوؤں کا احساس کرتے۔ قوم کے ان جذبات کو رزمیہ اشعار لکھ کر اور کچھ وہ اشعار جو عوام کے اندرونی جذبات کی عکاسی کرتے تھے لوگوں کو جوش و خروش دلایا۔ حمید کشمیری نے اکبر نامہ نامی کتاب۔ امیر دوست محمد خاں کے لڑکے وزیر محمد اکبر خاں کی بہادری اور لڑائیوں کے وصف میں تصنیف کی جو اُس نے انگریزوں کے خلاف لڑی تھی اور جسے افغانستان کے ۱۹ ویں صدی کا شاہنامہ کہا جا سکتا ہے[1] حمید نے انگلستان اور افغانستان کے درمیان پہلی جنگ اور پھر انگریزی فوج کی شکست برنس کی سرکردگی کے بارے میں اس طرح لکھتا ہے :—

شنیدم کہ گردان کابل زمین	چو کشتند برنس بہ شمشیر کین
برستند از دشمن بد گہر	بیفتا د در دست شان سیم و زر
دلیران کابل چو شیران مست	بغل بر کشودہ بر آوردہ دست
بہ بندوق و شاہین تیر و تبر	جہان را نمودند زیر و زبر[2]

---

[1] دیوان حمید کشمیری اکبر نامہ سال ۱۳۲۰ شمسی، ۱۹۵۱ء چھاپ کابل۔

[2] اسد اللہ حبیب ادب، شمارہ چہارم سال ۱۳۵۶/۱۹۷۷ء ص ۶

دوسرے معاصر شاعر غلام محمد طرزی افغان جو سید جمال الدین افغانی کے ہم عصر رہے ہیں، افغانستان کی اس قومی اور علمی شخصیت کے بارے میں یہ اشعار لکھے ہیں:۔

جمال الدین نام آور، سخن فہم و سخن پرور
خردمند ہنر گستر فلک قدر و ملک سیما
تو نور افغانستان اخگر تو عود افغانستان مجمر
تو جان افغانستان پیکر، تو روح افغانستان پیکر
نہ ماہ مصر و شام ہستی، کہ خورشید تمام ہستی
تو افغان را تمام ہستی زرای روشن والا[1]

جیساکہ ہم جانتے ہیں کہ شاعری ایسی ہو جو معاشرہ کے واقعات کی عین عکاسی ہو۔ شاعر زندہ، حساس اور سماجی کشمکش کا خلاق ہوتا ہے اور عوام سے ذاتی تعلق کے علاوہ اُس کا ایک فنی رشتہ بھی ہوتا ہے اور یہ قلبی تعلق اس کا باعث بنتا ہے کہ اس کی شاعری میں لوگوں کا دکھ درد اور اُن کا اجتماعی احساس اپنا راستہ بناتا رہتا ہے اور وہ شاعری سے ایک سیاسی موقف بناتا ہے۔ چنانچہ یہی وجہ تھی کہ پہلی بار ۱۲۹۲ھ ش مطابق ۱۹۱۱ء میں محمود طرزی نے سراج الاخبار کی اولین اشاعت میں، افغانستانی شاعری میں انقلابی انداز اختیار کیا جب کہ وہ اپنی نثر و نظم میں مکمل طور پر روایتی طرز سے بالکل مختلف لکھا کرتے تھے۔ کیوں کہ انھوں نے اب اس طرز کی پیروی کی جو عروض اور صنایع کی تابع نہیں تھی اور عوام کے لیے بھی آسان فہم تھی اور اس طرح افغانستان میں نئی یا جدید شاعری محمود طرزی اور ان کے "سراج الاخبار" کے ذریعہ شروع ہوئی اور پھر آزادی کے حصول کے بعد بھی "امان افغان" جو سراج الاخبار کی جگہ شایع ہوتا شروع ہوا تھا، کے ذریعہ جاری رہی اور طرزی ہمیشہ کوشش کرتے رہے کہ اپنی شاعری کو سادہ طرز ۔

---

[1] محمد عثمان صدقی سیر ادب در افغانستان۔ کابل ۱۳۴۰ھ ش، ۱۹۶۱ء ص ۶

اجباری انداز اور عام فہم زبان میں لوگوں کے ذوق کے لیے فراہم کرتے رہے اور
اسی وجہ سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ طرزی کی شاعری سادگی اور روانی کے نقطۂ نظر
روزانہ کی شاعری ہے اور ایک ایرانی دانشمند محمد حقوقی کے بقول کہ آج کے حقیقی
شاعر نے اکثر قدما اور اساتذہ کے برخلاف دانستہ طور پر شاعری کو پیچیدہ
نہیں بنایا ہے تاکہ اپنی موجودہ دنیا کی خصوصیت سے نزدیک تر ہو جائے اور اس پر
قدرت حاصل کر لے۔

افغانستان کی سیاسی اور اجتماعی زندگی کی بنیادی تبدیلیوں نے، ادبی تجدد
کو لہرا دیا اور اُسے نئی سمت اور ترقی یافتہ راہ کا رخ دے دیا۔ جس کا نتیجہ ادبیات
کا ظہور تھا اور اُن سب میں جدید دری شاعری کا خاص مرتبہ تھا۔ اگرچہ مضمون
کی تازگی اور موضوع موجودہ صدی کے روز اول ہی سے دری شاعری کا جز قرار
پایا تھا لیکن ہیئت کی تبدیلی اور شاعری کی عمارت مراحل طے کرتی رہی اور کئی
سال بعد وجود میں آئی اور آج بھی ایران کی نوجوان اور پختہ فارسی کے مقابلہ میں
طفل مکتب ہی رہی۔ اس کا سبب بھی ایران کے شاعر کی خوشحال تر زندگی اور
مغرب کے محیط سے آشنائی اور اس دیار کے جدید افکار سے واقفیت
ہے جب کہ افغان کا شاعر اُن تمام نعمتوں سے بہرہ ور ہی نہیں ہے۔ اسی
طرح سے علم اور تحصیل علم کا معیار بھی ان دونوں ملکوں میں برابر نہیں ہے۔
اور ایرانی سوسائٹی جہاں پڑھے لکھوں کی تعداد زیادہ ہے اور دنیا اور روزانہ
کے واقعات سے زیادہ باخبر ہو کر اپنے شاعر کو زیادہ واقفیت دے سکتی
ہے اور جو کہ مطالب کی گہرائی کی طرف متوجہ ہو کر اپنے شعر کے بلند معیار کی
حفاظت بھی کرتی ہے۔ لیکن افغانی شاعر جو کہ مطالب کی تفہیم کے لیے سادہ
بیانی کی ضرورت محسوس کرتا ہے، اس امر کے لیے مجبور ہے کہ اپنے عوام
کو شعری صنف کی ماہیت کی طرف توجہ دیے بغیر حادثات کے درمیان عامیانہ

لہ ڈاکٹر جعفر مؤید شیرازی شعر فارسی از مشروطیت تا امروز تہران
سال ۱۳۵۷، ۱۹۷۸ء صـ ۲۷

شاعری کرے اس لیے کہ ایک دوسرے ایرانی دانش مند محمود کیانوش کے بقول شاعر دور کا آئینہ ہے۔ ایک طرف تو معاشرہ کے رو برو اور اُس کے نشیب و فراز اور دوسرا رُخ اپنی نفسیات اور احساسات کی جانب ہوتا ہے [1]

جیسا کہ دیکھا گیا ہے کہ عصری شاعر اور اس کی شاعری بھی کلاسیکل دری شاعری کے مانند تازہ اور اچھوتے موضوعات، ملک کی سماجی اور تہذیبی زندگی کی جھلکیوں، متعدد جماعتوں کے ممتاز افراد کی زندگی کے پہلوؤں، امپیریلزم کے مخالفانہ جذبات، آزادی نسواں، امن و صلح اور خصوصاً نغمہ موسیقی و ترنم اور بہت سے روایتی موضوعات کو شاعری میں طرح طرح سے شامل کر لینے کا از حد طرفدار ہے۔ اور اگر ہم محمود طرزی کو افغانستان کی موجودہ دری شاعری کا قافلہ سالار مان لیتے ہیں تو ہم یہ دعوا بھی کر سکتے ہیں کہ وہ اس پیمبری اور رہبری میں تنہا نہیں ہیں اور بہت زیادہ شاعر اس کے کارواں کے ساتھی ہیں یا تو اُن کی پیروی کی ہے، مثالاً افغانستان کے اور دوسرے معاصر شعرا میں سے رحمت طرزی کے مانند لوگوں کو اپنے طرز و فکر میں انقلاب لانے اور عمل اور کوشش کرنے کا شوق دلاتے ہیں:۔

ای عزیزان تا بہ کی وصف لب میگوں کنید
ذکر خوبی ہای لیلیٰ قصّہ مجنوں کنید

یکدمی با خویش بنشنید در فکر وطن
لعل از سنگ آورید از خاک زر بیروں کنید [2]

ایرانی شاعر ادیب الممالک مرزا صادق خان امیری اسی مضمون میں ایک قصیدہ لکھ گئے ہیں جو کہ افغانی شاعر کے شعر سے پہلے (۱-۱۹-۱۹۲ء) شائع ہو چکا ہے۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ رحمت نے اپنے اشعار نظم کرنے سے قبل یا اس کو نظم کرتے وقت اس قصیدہ کو پیش نظر رکھا ہے۔ جو اس طرح ہے:۔

---

[1] ڈاکٹر جعفر مؤید شیرازی، شعر فارسی از مشروطیت تا امروز تہران سال، ۱۳۵-۱۹۷۸ء ص۴۹
[2] خستہ معاصرین سخنور، کابل ۱۳۳۹ ش/۱۹۶۰ء ص۲۷۷

قصۂ قیس و غصۂ لیلی ‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌ حرف محمود و سرگذشت ایاز
کہنہ شد این فسانہا یکسر ‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌ کن حدیث نوی زسر آغاز
گر ہوائی سخن بود بسرت ‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌ از وطن بعد ازین سخن گو باز[1]

نئی دری شاعری اب اپنی پوری مہارت اور خلاقیت کے ساتھ کلاسیکل دری کی اچھی روایتوں کے کچھ ٹکڑوں اور پہلوؤں سے بھی بہرہ ور ہے انسانی دوستی کا رجحان، انسانی اخوت، ریالیزم، وطن پرستی، زیبائی، جوانمردی، اور زمانہ سازی جیسے موضوعات اپنی جگہ مخصوص اچھائیوں میں ہیں۔ یہ کہنا چاہیئے کہ جدید دری شاعری کا وجود بنیادی طور پر مضمون میں جدت پسندی سے وابستہ ہے جو کہ بیسویں صدی سے شروع ہوئی ہے لیکن بدایع کی مہارت کو نو جوئی کی موثر شاعری میں ضروری قرار دیتے ہیں۔ اس میں دوام حاصل نہیں کر سکی ہے بلکہ ایک معاون عامل کی حیثیت سے اس کی تکمیل اور تداوم میں دوسرے درجہ کی اہمیت کے مانند باقی رہی ہے۔

جب شاعر خود اور اپنے عوام کے ساتھ اپنے عہد کے ساتھ رہ کر مشاہدہ کرتا ہے اور اسی روایتی شکل کو بھی اپناتا ہے تو پھر اپنی شاعری کو عوام تک اور اپنی فریاد کو خدا تک پہنچاتا ہے اور کہتا ہے:۔

نور تمدن کہ علم بر فراخت ‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌ دیدہ ما را از چہ روشن نساخت
قافلہ شد وا پسی ما بین ‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌ ای کسی ما بیکسی ما بین[2]

اور ایک اور شاعر اسی قالب میں خلق کے بارے میں کہتا ہے، دعا کرتا ہے:۔

نیست گر منفعت خلق مرام من و تو ‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌ کامیابی ز جہانست حرام من و تو[3]

---

[1] حبیب الرحمن جدید فارسی شاعری مسلم یونیورسٹی علی گڑھ ۱۹۵۹ء ص ۸۲

[2] ضیاء قاری زادہ' پیام باختر، کابل، ۱۳۳۰/۱۹۵۱ء ص ۱۵

[3] ابراہیم خلیل لنگاہی، ادبیات معاصر افغانستان از م ج. تدول کابل ۱۳۳۷/۱۹۵۸ء ص ۱۰۰

موجودہ عہد کا شاعر جس وقت وطن کی فکر کرتا ہے تو پھر اس کے متعلق اپنے احساسات اور عشق کا اظہار یوں کرتا ہے :۔

ای میہنم ، ای میہنم
ای عشق بی ہمتای من
ای گوہر یکتای من
بادا فدادیت جان من
ای رونق فردای من
گو با تو باشم می رسد
تا کہکشاں پرواز من
گر بیتو باشم وای من [1]

یہاں دوبارہ نئے افکار کی پیدائش کی ابتدا ہے جو کہ موجودہ دری شاعری کا جز بنا اور جدید دری شاعری کے باوا آدم محمود طرزی کے خیالات کو ہم اپنے موضوع بحث کے سلسلہ میں بیان کرنا چاہیں گے کہ کس طرح شاعر زمانہ جنگ میں استعماریت کے خلاف لوگوں کے احساسات کو آزادی کی طلب اور اس کے بعد کی آرزوؤں کی نشاندہی کرتا ہے اور چوں کہ وہ تو بھی اسی سوسائٹی کے ایک فرد کی حیثیت سے بھی ان احساسات سے بے بہرہ نہیں رہا ہے اس لیے آزادی کی راہ میں شہید ہونے والے کا یہ قول دہراتا ہے :۔

شہیدان ظلم فرنگین ما بخون وطن لالہ رنگین ما

یا پھر وہ جس وقت ایجادات اور انکشافات کے بارہ میں سنتا ہے اور یہ جانتا ہے کہ پتھر کا کوئلہ بھی جدید علم کی برکتوں کی بدولت ایک قابل استفادہ مادہ بنا لیا گیا ہے تو وہ کوئلہ کی تعریف و توصیف میں یوں رطب اللسان نظر آتا ہے :۔

انوارہا پدید شدہ از زغال سنگ ظلمت ز ما بعید شدہ از زغال سنگ

---

[1] فضل حق فطرت ، مجلہ آواز شمارہ ۲۔ سرطان ، ۱۳۵۰/۸/۱۹۷۰ء کابل ص ۲۸

ظلمت کجا و نور کجا ایں چہ حکمت است　　تاریک شب سفید شدہ از زغال سنگ[1]

- - - - - -

یہی وجہ ہے کہ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ شاعری کو معاشرہ کا خدمت گار ہونا چاہیئے.
اور سماج کی مشکلات اور انقلابات اور لوگوں کی آرزوؤں کا مدّعا ہونا چاہیئے جس
وقت لوگ جنگ کے خلاف اپنی نفرت اور غم وغصہ کا اظہار کریں تو شاعر کو اپنے
فرائض انجام دینا چاہئیں اور وہ جنگ کے خلاف قلم کو جنبش دے۔ چنانچہ جنگ
کے بارہ میں شاعر اپنے احساسات کو اس طرح نمایاں کرتا ہوا جنگ کو انسانیت
کے خلاف ایک سنگین جرم قرار دیتا ہے:۔

نغز گفت بہ ایں مردم عالم انسان　　تا یکی را بدگر تیغ کشیدن باقیست[2]

حساس شاعری کا نازک دل جنگ وخونریزی سے بہت جلد مجروح ہو جاتا
ہے اور یہاں تک کہ وہ تمدن اور شہریت سے بھی بیزار ہو جاتا ہے اور وہ تہذیب
جو کہ شورش اور خونریزی کا سبب بنتی ہے اُس پر وحشت اور بے تہذیبی کو ترجیح
دیتا ہوا کہتا ہے :۔

رفتہ آرامش زعالم یادی از شبگیر صلح　　نیست راحت گر نباشد درمیان توقیر صلح
نوع انسان خستہ شد از ظلمت عفریت جنگ　　طلعتی بنما جہاں روشن کن ای تنویر صلح
گر تمدن را نتیجہ در جہاں شور است وجنگ　　وحشتی ای چرخ تا مارا دہد تاثیر صلح

دوسرا افغانی شاعر عبدالکریم منشی جنگ کے بارہ میں اپنی تشویش
کو جنگ کے بارہ میں ظاہر کرتا ہے اور مملکتوں کے سربراہوں سے صلح کا تقاضا کرتا
ہے اور انھیں یہ سمجھاتا ہے کہ جنگ ساری دنیا میں کیسی ہلاکت اور تباہی پر ختم
ہوتی ہے:۔

خدا کند کہ نمایند قایدین دول　　مصالحت کہ نیاید ظہور جنگ وجدل

---

[1] خستہ، معاصرین سخنور، کابل، ۱۳۳۹ شمسی / ۱۹۶۰ء ص ۱۸
[2] گلچین از آثار وشرح حال ابراہیم خلیل

بشرق، غرب وشمال وجنوب عنصر خاک   اگر مدار بہ گردوفتد ہزار خلل [1]

افغانی شاعر باوجودیکہ اُس کی اقتصادی زندگی کی ضمانت نہیں ہوئی ہے اور اس نے شاعری کو اپنا حرفہ نہیں سمجھا ہے پھر بھی پردہ فاش کیا ہے اور جب ملک میں جمہوری حکومت آئی تو اُس کی تعریف وتحسین کا قصیدہ پڑھا اور اُس کے بعد دہقانوں اور مزدوروں کے ارمانوں اور آرزوؤں کا ذکر بھی کیا ہے۔ مثلاً جمہوریت کی کامیابی کے موقع پر:-

الا اے شیپور پیروزی
نوا کن مست، چوں تندر
کہ جمہوری بہ خوشگامی
علم افروخت در کشور
فغان کن چابک وتازہ فگن درعالم آوازہ
کہ درد ملت افغان
رسید آخر بہ درمانگر
بگو با زیروبم ہردم
بہ لحن تغز و مستحکم
برآمد مردم ماہم ز قعر تیرہ روزیہا [2]

جیسا کہ ہم نے کہا کہ شاعر ہمیشہ جدید سماجی، سیاسی اور اقتصادی رجحانات کے اثر کے تحت اپنی شاعری کو گرد وپیش اور زمانہ کے تقاضوں سے ہم آہنگ کرتا ہے اور یہ لکھتا ہے:-

بامید فردای این مرز وبوم کہ آتش زند حلق برخاک شوم [3]

---

[1] شعر از احرار معاصرین سخنور ۱۳۳۹ شمسی ۔ ۱۹۶۰ء ص ۱۷۱ - ۱۸۰

[2] الہام مجلہ میرمن شمارہ پنجم ۱۳۵۲ شمسی ۱۹۷۳ء کابل صفحہ ۳۶

[3] سلیمان لایق، بادبان، کابل ۔ سال ۱۳۶۰، ۱۹۸۱ء ص ۳۹، ۴۰

یہاں تک جو کچھ ہم نے کہا ہماری زیادہ تر بحث دری شاعری کے مضمون سے رہی ہے۔ اب چاہیئے کہ تھوڑا بہت اس کے فارم اور بدایع کے بارہ میں گفتگو ہو جائے۔ فارم اور ہیئت میں جدیدیت کچھ دیر سے پیدا ہوئی اور قالب اور فارم میں یہ تبدیلی اس بات کا باعث بنی کہ دری شاعری کے میدان میں عروضی روایت کے بہت سے اصول جو صدیوں تک بڑے مقدس تھے اور جس میں کسی قسم کی تبدیلی نا قابل قبول گردانی جا چکی تھی اب اس میں تبدیلی ہوئی کہ وہ سادہ ہو، بدلی جائے اور بنیادی موضوع کے تابع ہو۔ نئی شاعری کلاسیکل روایات سے کاملاً استفادہ نہیں کرتی ہے اور کرنا بھی نہیں چاہیئے اور اس طرح دری شاعری میں جدیدیت کی ترقی پذیر بنیادی روایات سے تخلیقی استفادہ کرنے کی شکل پیدا ہو رہی ہے۔

اگرچہ ابتدا میں یہ جدیدیت نامانوس اور ناپسندیدہ نظر آتی ہے۔ کیوں کہ ایراتی شعر نو کے بانی نیما یوشیج کے بقول:۔

شعر خوب مثل طفل زندہ بالفعل است با فکر ملت رشد
میکند اگرچہ در زماں تولد خود مردود واقع شدہ باشد[1]

اس طرز فکر میں نیما ہی اکیلے نہیں ہیں اور دراصل "شعر نو" کی اصطلاح کو پہلی بار ملک الشعرا بہار نے ایران میں اس سے قبل ایک قصیدہ میں استعمال کیا ہے اور یوں کہا ہے:۔

بہار اہمتی جو اختلاطی کن یہ شعر نو کہ رنجیدم ز شعر انوری و عرفی و جامی
مکرر گر ہمہ قند است، خاطر را کند رنجہ زیادا م بدا یدلبس کہ خواندم چشم ہا دامی[2]

جس طرح کہ ایران میں شاعر مضامین، الفاظ اور تراکیب کی تکرار سے تھک گیا تھا اور اس قسم کی شاعری کو بے کیف سمجھا تھا اور اسی لیے نو آوری کی آرزو رکھتا تھا، افغانستان میں بھی برابر شعرا نے یہی آرزوئیں اپنے اندر پائی ہیں اور کلاسیکل شاعری کے کہنہ قصر کی تخریب اور نو آوری کے لیے کوشش کی ہیں۔ مثال کے طور پر

---

[1] دکتر جعفر مؤید شیرازی، شعر فارسی از مشروطیت تا امروز، تہران سال ، ۱۳۵۰، ۱۹۷۸ء صفحہ ۲۷۷
[2] مسائل ادبیات نوین ایران ، م، حسینوف ، ترجمہ: صدیق ، انتشارات دنیا ، تہران ۱۳۵۴، ۱۹۷۵ء صفحہ ۳۲

موجودہ افغانستان کے شاعر مایل ہروی تقریباً یہی پیغام اپنی شاعری میں دیتے ہیں:۔

زمن بشاعر عصر قمر بگو یہ ادب
کہ شعر خوب نہ آنست کو شرر زانیست
بخوں دل سخن خویش آب و رنگ بدہ
اگر ز دل نخورد آب شعر گیرا نیست

مصرعی از قطرۂ خونی بساز
بیتکی از ساز قانونی بساز

مگو ز سبک خراسان دعقند و طرز عراق
پیچ در پی تجنیس و صنعت ایہام
بمقتضی زماں شعر را دگر گون ساز
مباش پیرو اشعار انوری و خیام

ای تو مشتاق نظیری و ظہیر
شعر را یک پردہ بالاتر بگیر[1]

لیکن جیسا کہ دیکھا جاتا ہے کہ مندرجہ بالا موضوعات کے بارہ میں کیا افغانی شاعر اور کیا ایرانی شاعر اس کے باوجود کہ ان کے سروں میں نو آوری کے جذبات پرورش پاتے رہے ہیں انھوں نے فارم کے نقطہ نظر سے اپنی شاعری میں کوئی تبدیلی نہیں کی اور انھیں پرانے سانچوں میں نئی جنس کو پیش کیا ہے۔

لیکن پھر بھی موجودہ دری شاعری افغانستان میں ان آخری سالوں کے دوران (محمد ظاہر شاہ کے عہد اور اُس کے بعد) انقلابات اور کودتاؤں کے واقعات کے بارہ میں نئی روش پیدا کرنے میں کامیاب رہی ہے اور اس نے زیادہ صحیح اور جاتا بوجھا راستہ اختیار کیا ہے اور انھیں شاعروں نے اپنے عقاید اور نظریات کو زیادہ جرات کے ساتھ پیش کیا ہے اور اُن کی شاعری اکثر اُن کے سیاسی نظریات اور شعار کا محور قرار پائی ہے۔ انھوں نے مزدوروں

---

[1] خستہ۔ معاصرین سخنور، کابل، ۱۳۳۹ شمسی، ۱۹۶۰ء صـ ۱۴۲۔۱۴۳

کسانوں اور محنت کشوں کی مانگوں کے ذکر کے ساتھ استبداد اور ناانصافی کے خلاف قلم کا علم بلند کیا۔

فارم کی تبدیلیوں کی اس کشمکش میں جدید شاعری بھی اور استوار ہوئی اور

همرهان

ای همرهان آرزو
مست من سازید
بایک بادۂ سوزندہ آتش پروری
از شراب پختہ جوش، از جامهالی دیگری
ساز از تار دلی ساقی، جنوں را رہبری
بادبان خواہد، رفیقان
ناخدای دیگری ..... [1]

اوریا

امشب کہ از فراسوی پرہول سخرہ ہا
فریاد مرگ میجہد از میلہ تفنگ
در ہر ہجوم لشکر دہقان بہ قصر خان
چوں آذرخش میپرد آتش ز لپشت سنگ [2]

بعض افغان دانش مند شعر تو سے دوسرے نتائج اخذ کرتے ہیں۔ چنانچہ استاد صلاح الدین سلجوقی اُس مقدمہ میں جو انھوں نے خلیل اللہ خلیلی کے دیوان پر لکھا ہے، اس بارہ میں لکھتے ہیں کہ ہمارے وطن کی آیندہ شاعری کا نوشتہ

---

[1] برگزیدۂ شعر معاصر افغانستان۔ انتخاب محمد سرور مولائی۔ از انتشارات د ز، تہران ص ۱۴۶

[2] اسداللہ حبیب در کوچہ ہای سرخ شفق۔ ناشر، شورای فرہنگی، پوہنتون کابل ۱۹۸۱ء ص ۱

ہماری مستقبل کی موسیقی کے سرنوشتہ سے مربوط ہے اور مجھے امید ہے
کہ یوروپی موسیقی جلدی اس دیار میں معروف ہو جائے گی۔ اس وقت
شاعری بھی جدید رنگ اختیار کر لے گی ....[1]

اسی طرح دانش مند فاضل سلجوقی، خلیلی کو جن کے تقریباً سارے اشعار کلاسیکل طرز پر منظوم ہوئے ہیں۔ افغانستان کی نئی شاعری کا کاروان سالار سمجھتے ہیں اور یہ لکھتے ہیں :-

"اگر شعر جدید آمد نیست د باید بیاید و خوش میآید۔ از خامہ استادان
بادانش و باہنر باشد۔ چنانچہ دیدہ میشود کہ خلیلی نیز تبوبت خود بنائی آنرا
گذاشتہ است و سارباں نیست کہ کاروان را جانب دنیای جدید شعر
میراند ...[2]

اور خلیلی کے اس شعر کو نئے مضمون کی نظر سے دیکھتا ہے اور کہتا ہے:-

طبیعت ہر چہ باشد نغز و زیبا — چو آزادی نباشد سخت زشت است
جہان در پرتوی آزادی و مہر — اگر زشت است و گر زیبا بہشت است[3]

کیونکہ صاحب موصوف کے کہنے کے مطابق قدیم شعرا فطرت اور بہار کو بغیر کسی قید اور شرط کے سراہتے تھے لیکن ہمارا شاعر چاہتا ہے کہ قدرتی اور فطرتی نظام کے متوازی ادبی اور اجتماعی نظام کو بھی پہچانے اور فطرت کی شادابی کے ساتھ حاصل کی ہوئی سعادت کو بھی ملاحظہ کرے اور ہر اعتبار سے معنوی حسن کو صوری حسن پر برتری دے ارسطو کا بھی یہی عقیدہ ہے کہ ظاہری حسن معنوی حسن کے ساتھ جڑا ہوا ہو۔
دوسری جانب نوآبادی کے موجودہ دور میں دری شاعری کے فارم اور

---

[1] دیوان خلیل اللہ خلیلی، محمد ہاشم امیدوار ہراتی، چاپخانہ حیدری تہران سال ۱۳۴۱ شمسی ص ۲۹
[2] " " " " " ص ۲۸
[3] " " " " " ص ۳۱

مواد میں ایسے شاعروں کا وجود بھی ہے کہ عوامی احساس کے دوسرے پہلو کو جو کہ اُن کا مذہبی پہلو ہے، برتری دیتے ہیں اور وحدت اور اتحاد کو مذہب اور اسلام کی یگانگت میں تلاش کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اگر ہم اسی اصل کے تحت اتفاق باقی اور قایم رکھیں تو ہر میدان میں ترقی کر سکتے ہیں جس طرح معاصر شاعر قاری زادہ " عوامی ترانہ " کے عنوان کے تحت یوں کہتا ہے:۔

گر کاتب کمینه ور از سلک عسکریم　　گزارع غریب وگر اہل دفتریم
گر پست وگر بلند اگر پا اگر سریم　　گر پیر وگر جوان اگر سایہ یا بریم
باہم برادریم کہ باہم برادریم　　چون مومنیم و تابع دین پیمبریم
ماکردہ ایم بستہ بہ ومرانگی کمر　　ماداده ایم دست تعاون بہ ہمدگر
ماپیش میرویم بہ اُمید داد گر　　درراہ حفظ خاک وطن دادہ ایم سر
باہم برادریم کہ باہم برادریم [1]　　ماروح زندہ ایم بہ یک زندہ پیکریم

موجودہ دری شاعری کے مختلف پہلوؤں کی تحقیق و تحلیل کے بعد ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ مضمون میں اُس تنوع اور تغیر کی خصوصیت اور مضمون اور اسلوب کی ارزش یہ ہے کہ محمد ظاہر شاہ (۱۹۵۹ء) کے جدید اساسی قانون کے اعلان کے ساتھ اس کا نشو ونما اور تکامل زیادہ تیزی کے ساتھ ہوا اور شعرا نے کوشش کی ہے تاکہ عوام کے تخیلات کی فضا کو پہچانیں اور اُس میں اثر پیدا کریں اور پھر اُن سے دنیا کو ناپیدا کنار اور واضح تر بنائیں اور اگر ممکن ہو سکے تو اپنے آپ کو عوامی پارٹیوں کی زبان گو یا بنالیں اور ایرانی فاضل کے کہنے کے مطابق جو کہ افغانستان کی موجودہ دری شاعری کے بارہ میں صادق آتا ہے، اسے سچ کر دکھائیں :۔

" شاعر واقعی امروز، برخلاف اغلب ناظمان، تعمد اً شعرا پیچیدہ نکردہ است بلکہ برآن بودہ تا بہ دنیائی با خصوصیات خاص خود نزدیک شود دوست یا بد۔ " [2]

---

[1] ضیا قاری زادہ، مجلہ آواز شمارہ پنجم و ششم، سال ۱۳۵۸ش، ۱۹۷۹ء صـ ۳۰
[2] محمد حقوقی، شعر نو از آغاز تا امروز، تہران ۱۳۵۷، ۱۹۷۸ء صـ ۱۴

تیسرا باب

اب اُن شعرا کے طبقہ کے بارے میں گفتگو ہوگی جنھوں نے روایتی شاعری کے منظوموں کے فارم اور ہیئت کی تبدیلی میں واضح نقوش چھوڑے ہیں۔ چونکہ اس گروہ کے شعرا کی تعداد اس نسبت سے کہ دری شاعری کا ایک طویل دور آن سے مخصوص رہا ہے، زیادہ رہی ہے، اور انھوں نے زیادہ اشعار لکھے ہیں اس بنا پر اگر اُن کا اور اُن کی شاعری کی قدر و قیمت کا تعارف زیادہ طویل بحث کا باعث ہو جائے تو یقیناً یہ ایک قدرتی بات ہوگی۔

اس حصّہ میں دو شاعرات حاذقہ اور تجویہ کو مستثنا کرتے ہوئے اور ایک شاعر دہقان کو نظر انداز کرتے ہوئے کیونکہ اُن کے کلام کی عدم دستیابی بہت مختصر بحث پر ختم ہوئی ہے اور دوسرے شعرا جن میں سے ہر ایک اپنے مقام پر خود بہت بڑا شاعر ہے یا استادی کے مرتبہ پر فائز ہے، حتی الامکان اس بات کی کوشش کی گئی ہے تاکہ اُن کا یہ حق اُن کی شاعری کے مختلف اقسام کے تعارف کے ساتھ ادا ہو جائے اسی کے ساتھ یہ بھی کہنا ضروری ہے کہ اس حصّہ کے بیشتر صفحات کی تعداد شعرا کے اشعار سے صرف اُن کی شہرت، بزرگی اور اُستادی کی تائید کے لیے بطور معیار اور سند پر کی گئی ہے بلکہ اُن کے دواوین اور شایع شدہ اشعار کی حصولیابی اس بارے میں زیادہ قابل قدر نقوش کی حامل رہی ہے۔

اُن کے تعارف کی ترتیب بھی ایک حد تک تقدم زمانی پر منحصر ہے نہ کہ مصنف کے فیصلہ یا دوسرے اقتباسات کی روشنی میں۔ اب یہاں ہم اس حصّہ میں ۱۵ شعرا کو ترتیب وار اپنے نقد و نظر کا موضوع بنائیں گے۔

محمود طرزی

محمود طرزی پسر غلام محمد خان طرزی ۱۲۸۵ / ۱۹۰۵ء میں کابل میں پیدا ہوئے

اور ۱۳۵۳ ہجری قمری استنبول میں راہی ملک عدم ہوئے ۔ طرزی جدید اور ترقی پسند شاعر ہے اور افغانستان کے ادبی حلقہ میں اس دور کے دری شاعری میں باوا آدم کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس نے مجلہ سراج الاخبار اور فرانسیسی ادیب ژول ورن کی نفسیات کی اشاعت اور تراجم کے بعد لوگوں کو نئے سماجی اور سیاسی افکار سے اور خصوصاً مغربی اور مشرقی تصورات سے آشنا کرایا اور اپنی شاعری میں انقلاب کا خواہاں تھا تاکہ شاعری کو عام اور روایتی قالب سے باہر نکال اسے جدید شکل دے کر بسیط اور عام فہم بنائے ۔

اس کی شاعری میں آزاد خواہی کا جذبہ اور استعمار کے خلاف نفرت پوشیدہ ہے، وہ آزاد خواہوں اور اصلاح طلبوں میں شمار ہوتا ہے۔ اس نے لوگوں کو کام کرنے اور علم حاصل کرنے کی دعوت دی ہے ۔ طرزی ایک اخبار نویس، مصنف، شاعر، مترجم، مورخ اور جغرافیہ داں، مدبر اور سیاست داں غرض سبھی کچھ تھا، قبل اس کے کہ وہ وطن لوٹے ۔ شام اور ایشیائے کوچک جیسے عرب ممالک میں شام، برِ صغیر اور مغربی تمدن کی آخری تہذیب اور شام، ترکی اور مصر کے انقلاب کی تحریکوں کا نزدیک سے مطالعہ کیا تھا۔[1]

محمود طرزی افغانستان کے عصری ادب میں اس لحاظ سے ممتاز حیثیت رکھتا ہے کہ اس نے سادہ اور سلیس انداز کو ادب میں متعارف کر کے نظم و نثر کی دنیا میں ایک انقلاب برپا کر دیا اور اس کے کلام کے مختلف نمونے اس دعویٰ کو بخوبی ثابت کرتے ہیں:۔

شہیدان ظلم استعمار

شبی بود تاریک چون زلف یار — زیک جنگلی مینمودم گذار

پر جنگل مہیب و مخوف و سیاہ — درختان سرکش چو عفریت بیشمار

زمین پرز خون وہوا پر دمہ — بہر سو جسدہائی خونین نثار

---

[1] م ۔ ح ژوبل نگاہی بادبیات معاصر افغانستان، کابل، ۱۳۳۷/۱۹۵۸ء صفحہ ۵

[2] استادان شعر معاصر افغان، ح نعمت اللہ لیف ورحیم ہاشم ۔

بترس و بلرز و باندوه و فکر — باہستگی میشدم رہسپار
رسیدم به یک مقبر سهمگین — ز اندیشه و غم شدم بیقرار
ز بیم و ز اندوه در ماندگی — نشستم که یکدم شوم رستگار
نیاسوده بودم دمی از تعب — که شد حالت دیگری آشکار
صدای حزینی بگوشم رسید — که میگفت با ناله اش زار زار

شهیدان ظلم فرنگیسم ما
بخون وطن لاله رنگیسم ما

شنیدم که گفتند باید که — که ما را چرا کشتند این وحشیان
بیائید تا بهر اخلاف خویش — خصوصاً به اخوان افغانیان
وصیت نویسیم و آگه کنیم — که غافل نباشند از مکر شان

شهیدان ظلم فرنگیسم ما
بخون وطن لاله رنگیسم ما [له]

اس نظم کی اہمیت شاعر کے کلام کی پختگی اور صنایع شعری کو استعمال میں نہیں ہے لیکن معنی اور انتخاب مضمون کے نقطہ نظر سے اور پھر عوام کی توجہ کی کشش کا باعث اس لیے ہے کہ اس میں انگریزوں کے مظالم اور کشتار کا صحیح نقشہ کھینچا ہے جو اہم ہے۔ مندرجہ ذیل چند اور ابیات میں لوگوں کو اس قسم کی کوشش اور عمل کی دعوت دیتا ہے :-

وقت شعر و شاعری بگذشت و رفت — وقت سحر و ساحری بگذشت و رفت
وقت اقدام است و سعی و جد و جهد — غفلت و تن پروری بگذشت و رفت
عصر، عصر موتر و ریل است و بس — گامهای اشتری بگذشت و رفت
کیمیا از جمله اشیاء زر کند — وقت اکسیر آوری بگذشت و رفت
تلگراف آرد خبر از شرق و غرب — قاصد و نامه بری بگذشت و رفت
شد هوا جولان گاه آدمی — رشک بی بال و پری بگذشت و رفت

له استادان شعر معاصر افغان۔ ح نعمت الله ایف و رحیم ہاشم طبع مرکز وزارت مدنیت تاجیکستان ص ۵۰-۵۱

گفت محمود این سخن را و برفت   سعی کن تنبلگری بگذشت رفت[1]

طرزی نے نوع انسانی کے اوصاف کے بارے میں نظمیں لکھی ہیں جن کی شرح یوں ہے:-

نوع انسان شریف و برتر شد   بر ہمہ ذی حیات افسر شد
عوض چنگ تیز شیر و پلنگ   مالک تیغ و تیر و خنجر شد
فیل و اشتر فرس و وحش و طیور   جملہ اور امطیع و چاکر شد
کرہ ارض با ہمہ مخلوق   زیر فرمان او مسخر شد
ذی حیات و جماد و نوع نبات   دائرہ گشت او چو محور شد
در اوائل چو پوست می پوشید   رفتہ رفتہ چنان توانگر شد
کہ ز دیبا و اطلس و مخمل   ساخت پوشاک و زیب آور شد
گوشت میخورد خام گشت چنان   کہ طعامش ز شیر و شکر شد
عوض جملہ قوت و قدرت   کہ دیگر نوع را میسر شد
بہر انسان کہ بود نوع ضعیف   قوہ عقل یار و رہبر شد
عقل اور ابرای جمعیت   کرد ارشاد و حکم گستر شد
ہیئت اجتماعی ملت
نام او سلطنت شد و دولت[2]

وہ بنی نوع انسان کے اوصاف بیان کرتے ہوئے کہتا ہے کہ تمام موجودات کا حاکم انسان ہے، سارے حیوانات، نباتات، جمادات اس کے گرد و پیش منڈلاتے ہیں، تابع اور فرمانبردار ہیں۔ وہ آدمی جو ابتدا میں جانور کی کھال پہنتا تھا اور کچا گوشت کھاتا تھا آج لذیز ترین غذاؤں کا استعمال کرتا ہے اور

---

[1] نگاہی بادبیات معاصر در افغانستان ہم، ح ژوبل، کابل، ۱۳۴۷، صفحہ ۱
[2] غستہ معاصرین سخنور، کابل۔ ۱۳۳۹ شمسی ۱۹۶۰ء ص ۱۹، ۱

اگرچہ جسمانی طور پر تمام حیوانات سے کمزور ہے لیکن عقل کی بے پناہ طاقت سے اُن پر حکم فرما ہے اور اپنی خواہشات کے مطابق سیاسی اور سماجی نظام وجود میں لایا ہے۔
طرزی ایک عام بیداری، حرکت اور جدوجہد کا خواہاں ہے اور کاہلی سے بیزاری کا اظہار کرتا ہے اور اسی بنا پر اس کی بیشتر شاعری اپنے ہم وطنوں کو بیدار کرنے کے لیے ہوئی ہے۔ مثال کے طور پر مندرجہ ذیل رباعی میں اسی نقطۂ نظر کی پیروی کی ہے:۔

ای جوانان وطن فی وقت خواب وغفلت است
موسم بیداری ومردانگی وغیرت است
ماکہ افغانیم ما رانَنگ افغانی سزد
زانکہ بی ننگی بہ افغان بی نہایت خجلت است [1]

ان اشعار کی تشریح کے لیے بہتر ہے کہ سراج الاخبار میں خود موصوف کی شایع تحریروں کو مدنظر رکھیں تاکہ اس کی نثری خوبیوں سے بھی محروم نہ رہیں محمود طرزی نے ایک جگہ لکھا ہے کہ اگر تم چاہتے ہو اور آرزومند ہو کہ زندوں کے درمیان مردوں کی طرح زندگی نہ بسر کرو بس جینے کا طریقہ اور سلیقہ سیکھو کیوں کہ ایک غیرت مند قوم کے شایان شان یہ حال سازنہیں بھاگو ہمت کی کمر باندھ کر، کوشش کرو، بے حسی اور افسردگی کو چھوڑ دو، بس اے بھائیو کاہلی کا زمانہ چلا گیا۔ متحرک اور فعال ہو جاؤ کیا یہ افسوس کا مقام نہیں ہے کہ دنیا کی تمام قومیں اپنی قومی عظمت کی نگہبانی اور زندگی کی حفاظت کے لیے معروف عمل ہیں لیکن ہم افغانی اب بھی غفلت کی گہری نیند میں اطمنان کی جھپکیاں لے رہے ہیں [2]
محمود طرزی کی تالیفات اور وہ تراجم جو سراج الاخبار میں چھپتے رہے کابل کے مطابع اور مخصوصاً مطبع عنایت میں چھپے اور جن سے افغانستان میں ادب

---

[1] دکتور سامیہ عبادی مجلہ میر من شمارہ (۵) ۱۳۵۲ شمسی ۱۹۷۲ء کابل ص ۳۱
[2] ״ ״ ״ ״ ״ ״ ص ۳۱

کے میدان میں جدیدیت کا آغاز ہوا، اُن میں سے بہترین کی فہرست یوں ہے۔

۱- جغرافیائی منظوم افغانستان
۲- از ہر دہن سخنی واز ہر چمن سمنی (مجموعہ مقالات واشعار)
۳- پراگندہ (اُن کی نثر و نظم کا مجموعہ)
۴- روضۂ حکم
۵- سیاحت درسہ قطعہ روی زمین (ایشیا، افریقہ اور یورپ کی سیاحت کی یادداشتیں۔
۶- علم و اسلامیت
۷- آیا چہ باید کرد
۸- ادب در فن (فنی، صنعتی اور حاکمانہ اشعار)
۹- توحید
۱۰- جغرافیائی عمومی
۱۱- سیاحت دور زمیں در ہشتاد روز — ژول ورن کا ترجمہ
۱۲- سیاحت در جو ہوا — 〃 〃
۱۳- جزیرہ پنہان — 〃 〃
۱۴- سیاحت در زیر بحر — 〃 〃
۱۵- جنگ روس وجاپان پانچ جلدوں میں — 〃 〃
۱۶- اضافہ از پنجصد مقالہ در سراج الاخبار — 〃 〃[۱]

خلیلی

پروفیسر خلیل اللہ خلیلی افغانستان کے شعرا کے منتخب افراد میں شمار ہوتے ہیں اور نظم و نثر دونوں ہی میں کامل دسترس رکھتے ہیں۔ اُستاد نہ صرف اپنے ملک میں مشہور ہیں بلکہ ایران، تاجیکستان اور ہندستان کی ادبی محفلوں

۱؎ نگاہی بادبیات معاصر در افغانستان از رم۔ ح ژوبل، ۱۳۳۷، کابل ص ۵۱-۵۳

میں بھی غیر معروف نہیں ہیں ۱۲۸۵ھ شمسی کے سال میں کابل میں جہاں آرا نامی محلہ میں متولد ہوئے (بنیاد فرہنگ ایران، تہران کی طرف سے مطبوعہ دیوان خلیلی میں ان کا سال پیدائش ۱۹۱۰ء درج ہے اور خود انھوں نے ۲۴ جون ۱۹۸۲ء میں بی بی سی، لندن کو گذشتہ ارسی میں ایک انٹرویو دیتے ہوئے اپنا سال پیدائش ۱۹۰۷ء بتایا ہے چنانچہ یہی تاریخ جس کا ذکر خود انھوں نے کیا ہے قرین قیاس ہوسکتی ہے۔

اپنے ہی دیار میں عربی، فقہ اور تفسیر کی تعلیم حاصل کی اور دری ادب اور شاعری ملک الشعرا بیتاب مرحوم سے سیکھی۔ اُن کا پہلا مشغلہ تعلیمی تھا۔ بعد میں کابینہ میں سکریٹری جنرل، کابل یونیورسٹی میں معاون و پروفیسر، وزارت مطبوعات، وکیل شوریٰ، سفارت جدہ جیسے عہدوں پر مامور رہے اور فی الحال بغداد میں دولت جمہوری افغانستان کے (قبل از انقلاب ثور) سفیر رہے اور کچھ دنوں بعد آج کل سفیر غیر مقیم کی حیثیت سے دمشق، کویت، اردن اور خلیجی امارات میں کام کر رہے ہیں [2]

خطابات و انعامات

کابل کی جانب سے معارف اول کا اور فرانس سے اکادمی کا اول انعام پایا ہے۔ افریقی، ایشیائی ادیبوں کی انجمن کے ممبر ہیں اور اسی طرح انجمن تاریخ افغانستان کے ممبر ہونے کا افتخار حاصل ہے [3]

تالیفات و تصنیفات

۱۔ آثار ہرات ۳ جلد طبع ہرات

---

[1] برگزیدہ شعر معاصر افغانستان، انتخاب محمد سرور مولائی، تہران سال ۱۳۵۰ش، ۱۹۷۱ء صفحہ

[2] دیوان خلیلی چاپ بنیاد فرہنگ، ایران۔ تہران ص ۸

[3] " " " " ص ۹

۲ - احوال و آثار سنائی — طبع کابل

۳ - سلطنت غزنویاں — 〃

۴ - تفسیر قرآن کریم (۳۰ اجزاء، اول و آخر) — 〃
(شیخ الہند محمود الحسن کی اُردو تفسیر کا ترجمہ ہے)

۵ - فیضان تقدس (شرح احوال بیدل) — طبع کابل

۶ - یمگان (ناصر خسرو کے مقبرہ سے متعلق)

۷ - آرام گاہ بابر — طبع کابل

۸ - یک نسخہ مخطوطہ از کلیات سنائی — 〃

۹ - نی نامہ (شرح حال مولانا روم) — 〃

۱۰ - از بلخ تا قونیہ — 〃

۱۱ - عقاب زرین — 〃

۱۲ - دیوان اشعار جلد اول — طبع تہران

۱۳ - رباعیات با ترجمہ انگلش و عربی — طبع بغداد

۱۴ - پیوند دلہا — طبع تہران

۱۵ - منظومہ ستارگان — طبع کابل

۱۶ - نورہا — 〃

۱۷ - ابن بطوطہ فی افغانستان (عربی) — طبع بغداد

۱۸ - الفقہہ المعانیون (عربی) — 〃

۱۹ - ہرات د آثار ہا و رجالہا، تاریخ جہاں، عربی — بغداد

۲۰ - مقالات ادبی۔ تاریخی، سیاسی، تنقیدی (افغانستان، عراق، شام، ایران اور ترکی کے رسالوں میں طبع ہوئی)

پریس میں

- رویت ہا و روایت ہا (۲ جلد)
- دوشنبہ نامہ (شعر)

- بلخ در ادب عرب
- ابوزید بلخی
- سغرائی افغانستان (از محمود تا محمود) ....[1]

سبک کلام

پروفیسر خلیلی شعر کی ہر صنف میں روانی اور سادگی سے شعر کہتے ہیں۔ اگر وہ ایک طرف مسلماً سبک خراسان کے نمایندہ شمار ہوتے ہیں تو دوسری جانب صنف شاعری میں جدّت اور شعر میں نئی طرزیں پیدا کرنے میں کم مہارت نہیں رکھتے ہیں۔ پروفیسر خلیلی کے قصاید کا مطالعہ انسان کو سبک خراساں اور سبک ہندی کے ممتاز سخنوروں کے کلام کی یاد دلاتا ہے۔ اُن کے قطعات دلکش، مثنویاں تمثیل سے پُر اور اُن کی دوبیتیاں کمل بدیع ہوتی ہیں غزل میں سبک عراقی کے جانب رجحان ہے اور دوسری زبان کے شعرا کا ترجمہ بھی کرتے رہے ہیں۔ اُن کی نثری تالیفات سلاست، پختگی اور رواتی سے اُتنی ہی بھرپور ہیں جتنی ان کی شاعری[2]

قبل اس کے قدیم اُستاد خلیلی کے خرمن اشعار سے اور اُن کے کلام اور ان کے فن سے خوشہ چینی کا ارادہ کریں بہتر یہ ہوگا کہ ہم متعدد فضلا کے خیالات سے اُن کی پختگی کلام اور ادبی شخصیت کی تائید میں نمونہ کے طور پر چند مثالیں پیش کریں :—

در شعر و ادب داد ہنر داد خلیلی	از پیشروان پیشتر اُفتاد خلیلی
پرسند اگر امروز کہ استاد سخن کیست	گوییم ہمانگ کہ استاد خلیلی
تا نام ز افغان وز ایران بجہان است	نام تو بتاریخ بماناد خلیلی[3]

(حبیب یغمائی)

---

[1] دیوان خلیلی، چاپ بنیاد فرہنگ ایران

[2] برگزیدہ شعر معاصر افغانستان۔ محمد سرور مولائی، چاپ تہران، سال ۱۳۵۰ش ۱۹۷۲ء ص ۵۱

[3] محمد ہاشم اُمیدوار ہراتی، دیوان خلیل اللہ خلیلی۔ تہران، سال ۱۳۴۱ش ۱۹۶۲ء ص ۱۶

ای خلیل اللہ از مقام خلیل — بینوا را نوا فرستادی
سحر مطلق بشیوۂ ہاروت — نہ کنون بارہا فرستادی
کعبہ آرائش است ومردہ شمال — این سخن کز صفا فرستادی
گردن شاہدان فطرت را — زیور پربہا فرستادی[1]

(پروفیسر فروزانفر)

اُن کا ہر مصرعہ اور بیت سننے اور پڑھنے والے کو غزنین کے دربار کے بزرگ فارسی شعرا کی یاد دلا دیتا ہے اور عنصری، فرخی، کسائی اور عمارہ مروزی کو زندہ کر دیتا ہے ۔

خلیلی کے استادانہ مہارت کا بہترین موازنہ اُن کی دو بیتوں اور قطعات میں کیا جا سکتا ہے جو نئی طرز میں منظوم ہیں اور واضح ہو جاتا ہے کہ یہ زبردست شاعر جس قدر فارسی ادب کی قدیم روایات کی پیروی میں فطری قدرت رکھتا ہے تو جدت طرازی میں بھی ان لوگوں کے لیے نئی سمتیں وا کرتے ہیں جو اس میدان میں تازہ تازہ وارد ہوئے ہیں ۔ اُن کی نثر کے فصیح و بلیغ اور سلیس نمونے ہمیں اُن چند معدود سخن سرایوں کی یاد دلاتے ہیں ۔ جو بڑی حد تک نظم و نثر کے مرتبہ اور سرمایہ دونوں ہی سے بہرہ ور تھے[2] (سعید نفیسی)

افغانستان کے ایک اور دوسرے دانش مند اُن کے بارہ میں یوں اظہار عقیدت کرتے ہیں :—

" واگر شعر جدید آمدنیست و باید بیاید و خوش میاید از خامہ اُستادان با دانش ، نیز باشد چنانچہ دیدہ می شود خلیلی نیز بنوبت خود بنائی آنرا گذاشتہ است وسارا یا نیست کہ کاروان را جانب دنیای جدید شعر میسر اید " شاعریست کہ بوی مینازم و گمان نمیکنم بعصرہا مانند او شاعری بوجود آید " [3] (علامہ صلاح الدین سلجوقی مرحوم)

---

[1] چاپ بنیاد فرہنگ ایران دیوان خلیلی ۔ تہران ص ۱۱

[2] سعید نفیسی ۔ دیوان خلیل اللہ خلیلی سال ۱۳۴۱ش ۱۹۶۲ء ص ۲۸ — ۳۲

[3] محمد ہاشم امید معاہراتی ۔ دیوان خلیل اللہ خلیلی سال ۱۳۴۱ش ۱۹۶۲ء ص ۲۸ — ۳۲

"شاعر افغانی از درہمہ چیز آزادی فکر و عقیدہ دارد جہانی از جہان طبیعت زیبا تر خلق
زیبا تر خلق می کند اشعارش مانند ابیات جلال الدین محمد دل، ابر قص
میاورد و مانند سنائی با احساسات آدمی انس و آمیزش دلپذیر دارد۔"[1]

(دکتر لطفعلی صورتگر مرحوم)

خلیلی شاعر امروز و دیروز	شدہ در شعر از فردا فرا تر
اگر شعر است کشور اوست شاہش	اگر شعر آسمانست اوش اختر
حدود کشور زر تشت دہر مرزد	ندارد ہیچ زو آتش زبان تر[2]

(عبدالرحمان پژواک)

نمی توانم کہ از عہدہ تحلیل سبک خراسانی آن بر آیم کہ براستی در آن
وادی یکتا فرد است ومنہ تادرم بہ تحلیل لحن افغانی آن بپردازم
کہ الحق بی انباز است[3]

(دکتر رضا زادہ شفق مرحوم)

ہیچ کسی را نتوان سراغ کرد کہ شعر خلیلی را بہ علاقہ مندی نہ نگرد
ویا عیب جوئی نماید"

(گل پاچا الفت پشتو شاعر افغانستان)

ای کلام تو متین وای کمالت بی قرین	ای بیانت دل نشین ای نباتت دلنواز
اوستاد ار جمند و فخر حی و فضل عصر	شخص ملک صدر جمع و مرد شعر و اہل راز

(محمود فرخ ایرانی)[4]

پروفیسر خلیلی نے اپنی آواز کو اس گنبد آسمانی میں منعکس کیا اور مجھے یقین ہے
کہ اس کی گونج بہت دنوں تک لوگوں کے کانوں میں سنائی دیتی رہے گی اور

---

[1] محمد ہاشم امیدوار ہراتی، دیوان خلیل اللہ خلیلی سال ۱۳۴۱ش/۱۹۶۲ء صہ ۳۲
[2] چاپ بنیاد فرہنگ ایران، دیوان خلیلی، تہران صہ ۱۳
[3] محمد ہاشم امیدوار ہراتی دیوان خلیل اللہ خلیلی، چاپ تہران سال ۱۳۴۱ شمسی ۱۹۶۲ء صہ ۲
[4] چاپ بنیاد فرہنگ ایران، دیوان خلیلی تہران صہ ۱۴

سامعہ اور عالمغہ کو نوازتی رہے گی لے

(شمس الدین مجروح دانشمند افغانی)

بیک مراد نامہ جانپر در تمرا	آور دور یخت خرمن گل درکنار من
یک آسمان ستارہ ویک کاروان گہر	افسانہ برہمین من دبر لیسار من ؎

(رہی معیری، دانشمند شاعر ایرانی)

خلیل اللہ خلیلی جنھوں نے فرخی کا چراغ روشن کیا ہے بلاشبہ قدما کے اسلوب میں صفِ اول کے شعرا میں ہیں اور میدان شاعری میں استاد ہیں اُن کے کلام کے مطالعہ سے غزنین کی قدیم عظمت اور جلال کی خوشبو مشام جان کو معطر کرتی ہے ۔ خلیلی کی ترکیبیں اور جملہ بندی فرخی کے کلام کی ہم پلہ ہیں اُن کی تشبیہا اور تخیلات بھی اسی طرز کی ہیں اور ساتھ ہی استاد خلیلی کے کلام اور تصنیفات میں موجودہ زمانہ کے تازہ افکار کا حامل بھی ہے ۔ خلیلی نثر و نظم دونوں پر قادر ہیں اور خصوصًا نثر میں گذشتہ دور کی متانت اور سنجیدگی کے حامل ہیں ؎

(محمد عثمان صدقی دانشمند افغانی)

وشاعر خلیل اللہ وشی خمیلتہ	حیاہا الدیع المطلق حسن بنات
تخیر من اعلی اللغات بیامن	والقی علیہ سحرہا نغمات
الافضل ذی علم وابدع شاعر	احیابنی قومی ہدیٰ وصفات ؎

(محمد بجۃ الاثری شاعر عرب)

ذاک لان عالماً جلیلاً
وشاعراً نابغۃً اصیلاً

لے چاپ بنیاد فرہنگ ایران، تہران ص ۱۴

ؔ " " ص ۱۵

ؔ " " ص ۱۵

؎ محمد عثمان صدقی سیر روب در افغانستان، کابل سال ۱۳۴۰ش ۱۹۶۱ء ص ۱۳-۱۱

ؔ بنیاد فرہنگ ایران، تہران، دیوان خلیلی، ص ۱۵

مستوعیاً من کل علم فنا
وکم لشعر الادیب غنی[1]

(جعفر خلیلی شاعر عرب)

قصاید

قصیدہ نگاری میں خلیلی افغانستان میں اپنا ثانی نہیں رکھتے ہیں۔ اُن کے قصاید شاندار، طویل اور شاعرانہ صنایع و بدایع سے پُر ہوتے ہیں جس سے ہر پڑھنے والا سرشار اور مست ہوجاتا ہے۔ خصوصاً وہ لوگ جو شعری اور ادبی نزاکتوں سے باخبر ہوتے ہیں اور تعلم کی اچھائی بُرائی کی تمیز کرتے ہوئے اُن کے قصاید کا مرتبہ متعین کر سکتے ہیں۔ "آہ آتشبار" قصیدہ جو نسبتاً خاصا طویل ہے اس کی مثال ہے اور اس کے سارے ابیات کو یہاں پیش کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی ہے۔ ایک قصیدہ کی تشبیب میں اپنے زمانہ کے عوام اور حالات سے ناخوشی اور خصوصاً سیاستدانوں سے پریشانی کا اظہار کیا ہے ارباب اقتدار کو ظالم، جنگ افروز اور ریاکار گردانا ہے اور آخر کار اپنی اس پریشانی کو اپنے ملک کے لیے پریشان کن بتایا ہے اور اپنے ہم وطن عوام کی بہادری کو استعمار پسندوں اور توسیع پسندوں کے خلاف ظاہر کیا ہے۔ وہ اپنے اس قصیدہ کو "امید روشنی و صبح" پر ختم کرتا ہے۔ شاعر کے اس قصیدہ کو بعد از انقلاب ثور عصر حاضر کے افغانستان کے موجودہ حالات کے بارہ میں پیشین گوئی کا مرتبہ دیا جا سکتا ہے اور ایک حد تک الہام کی حیثیت رکھتا ہے یہ انقلاب کے سال سے تقریباً چودہ سال قبل لکھا گیا مگر پھر بھی آج کے افغانستان کے حال کے عین مطابق ہے۔

---

[1] بنیاد فرہنگ ایران، تہران، دیوان خلیلی، ص ۱۸۱

آه آتشبار

شامگاهان چون به بالین برنهم رخسار خویش
تا سحر سوزم ز آه گرم آتشبار خویش

آه آتشبار من گر سر کشد زی آسمان
آب گون انجم فرو ماند از رفتار خویش

تا دل شب باز گویم با دل خود رازها
خود چو دریا نالم و خود بشنوم گفتار خویش

تا دماغ کس نسوزد زین پیام آتشین
بعد ازین با اشک شویم دفتر اشعار خویش [1]

این دل بیدار من بی پرده می بیند کنون
آنچه را پوشند زیر پرده پندار خویش

محرمان را رشته از دور پیوندد به حق
در حرم بیگانه مانند شیخ با چل تار خویش

آن نگاه آشنا آتش به بنیادم فگند
مردم از اغیار می نالند و من از یار خویش

در جهان ما کنون آتش فتاده هر طرف
گر درینجا گل شود آنجا نماید کار خویش

آتش افتاده ولی در کلبه بیچارگان
آنکه عمری سوخته در سردی ادبار خویش

آتشی از جنگ افروزند مردم در جهان
این سیاست پیشگان شوم با افکار خویش

---

[1] دیوان خلیلی - چاپ بنیاد فرهنگ، ایران، تهران، ص ۵۶

آشتی پیش ما از آشتی لاقند اما در کمین
گرمتر سازند هردم عرصهٔ پیکار خویش

ظالمان را گنج گوهر کی کند قانع کرکس
گر به گلشن جا کند جوید همان مردار خویش

اهل همت سر نمی‌آرند پیش کس فرود
کی شود عنقا فرود از قلعهٔ کهسار خویش

تنگ ظرف سفله را گر چرخ بنوازد مرنج
چون زوال مور آید پر کشد از غار خویش

این تکبر پیشگان با یک دو کرسی بلند
خویش را نزدیک‌تر سازند سوی دار خویش

این ریاست‌ها نسازد مرد کوچک را بزرگ
خر نگردد اسب اگر از زر کند افسار خویش

شام شد، خورشید عمرم زرد گردید ای دریغ
کاروان در منزل و من بر نبسته بار خویش

در پی این کاروان جز نقش پا چیزی نماند
کس نگفت از رفتگان حرفی به ما از جنازه خویش

چون درخت میوه‌دار از بار غم پشتم خمید
کس نمی‌چیند که پیشش عرضه دارم بار خویش

این درخت غم گرفته زیاد باغبان
کافگند آنرا برون از عرصهٔ گلزار خویش

ای خوش آن لحظه که رفتم سایه آسا بر زمین
در فروغ آفتاب روشن دیوار خویش

بوسه‌ها بستانم از خاکی که پرورده مرا
در کنار مهر جان افزای مادروار خویش

زان عقاب سالخورده باز پرسم قصه ها
تا سر آید شب به من از قصه اعصار خویش
باز گوید تا چها کرده بر آن مرز کهن
آسمان نیلگون با ثابت و سیار خویش
باز گوید زان وطن خواهان که همچون خاره سنگ
تن سپر کردند پیش دشمن خونخوار خویش
شد هزاران سر لبسان گوی غلطان بزمین
لیک نگذشتند چون شیر از سر یک تار خویش
خرد شد در پای کهسار عظیم شاخش
سیل دشمن با طلسم شوم استعمار خویش
تا بکجا ای طبع آشفته. بخاموشی گرای
صبح می خندد بر رویت بس کن از گفتار خویش
روشنی پیغامها دارد به دنیای امید
خیز و بر راهش بیفشان گوهر شهوار خویش[1]

(طالیف اسد ۱۳۴۵ - ۱۹۶۷ء)

"نگارستان چین" نامی قصیدہ میں چین کی قدرتی خوبصورتی کو منظوم کیا ہے۔ جس کے مناظر کے مشاہدہ اور حسینان چین و گل رخان چین کو دیکھ کر اُس کی شاعرانہ فطرت اس قدر جوش میں آجاتی ہے کہ "گلزار مانی" کا سماں پیدا کر دیتی ہے۔ ہاں حقیقتاً گلزار مانی کا جو کہ چین کے معروف و مشہور نقاش کا شاہکار تھا۔ چین کے چائے کے سبز کھیتوں کا ذکر کرتا ہے، دریائی "شیخو" کے بہتے ہوئے پانی اور اُس دریا کے کنارے چینیوں کے ذریعہ بنائے ہوئے خوبصورت مناظر کی تعریف کرتا ہے اور چین کی تاریخی دیوار کے بارہ میں گفتگو کرتا ہے اور اسے اژدر کا نام دیتا ہے وہ دیکھتا ہے ہولناک حادثات

---

[1] دیوان خلیلی چاپ بنیاد فرہنگ ایران، تہران صفحہ ۵۹ - ۶۰

بھی اس میں دراڑیں نہیں ڈال سکے ہیں۔

خلیلی کے قصاید کی خوبیاں بیان کرتے وقت بہتر ہوگا کہ ہم بہت سے دانش مندوں کے اقوال بہ حیثیت دلیل اور سند پیش کریں۔ اُن میں سے ایک ایرانی فاضل جناب نوح سمنانی اُن کے قصاید کے مطالعہ کے بعد لکھتے ہیں: —

"البتہ پارہ از آثارش را در برابہ و مطبوعات ایران خوانده بودم ولی قصاید عزائی او را کہ خوانده رابی اختیار بیاد فرخی سیستانی و مسعود سعد میانداز د ندیده بودم ..... ۔آوازشاعر زماں و مردم زماں خویش است۔" لہ

نگارستان چین

۱۳۴۵ شمسی کے خزاں کے سال شاعر نے جمہوریہ چین کا ایک سفر کیا اور وہاں ایک قصیدہ نظم کیا جس کے مندرجہ ذیل چند ابیات پیش ہیں: —

ای بہارستان فطرت ای نگارستان چین
ای خزانت را ہزاران باغ گل در آستین
مہوشاں گلرخ خنداں خاموش ترا
چین ہا در ہر کجا دیدم مگر چین بر جبین
طبع معنی باز من صد نقش نو بندد نگار
از نگارین لوح این گلزار مانی آفرین ٢ه
تنگ چشم نازنینی گفت در گوش دلم
گل ببین در گلشن چین لیک برگی زان مچین
آں گیاہ سبز راہ دیدم کہ باوی سالہا
عمر را بر دم بسر گر شاد بودم گر غمین

لہ محمد ہاشم امیدوار ہراتی، دیوان خلیل اللہ خلیلی، تہران ۱۳۴۱۔ ۱۹۶۲ء صـ۲۹

٢ه دیوان خلیلی، چاپ بنیاد فرہنگ، ایران، تہران صـ۹

در دیار من به سیم و زر خریدندش مردو زن
وندرین جا چون گیاهی هرزه روید بر زمین [1]

این فروزان آب در شیشو بود چون آئینه
کز کف حوری شکسته او فتاده بر زمین

چینیان بر دور این آئینه قابی ساختند
از گیاه سبز و گلهائی بنفش و آتشین

سینه مالیده به تیغ کوهسارش اژدری
کز حوادث خم نخورده در خم و تیچ سنین

رخنهٔ نفگند در وی یادهائی هول خیز
جنبشی نفگند در وی سیل هائی سهمگین [2]

جیسا کہ پہلے اشارہ کیا گیا کہ خلیلی اپنے وقت کا شاعر ہے اور مختلف اصناف شعر میں، سیاسی، سماجی، عشقی موضوعات پر اس نے بہت کچھ منظوم کیا ہے اور اُن کی ایک سماجی مثنوی کو ہم اُن کی مثنویوں کے حصہ سے بحث کرتے وقت بطور نمونہ پیش کرنے پر اکتفا کرتے ہیں۔

اس مثنوی میں خلیلی نے رشوت خوروں، اسمگلروں اور اُن کے دوسروں سے ہڑپ کیے ہوئے مال و دولت پر حملے کیے ہیں اور انھیں اُن لوگوں میں شمار کیا ہے جو "عوام کا خون" پیتے ہیں اور گدھوں سے بھی بدتر ہیں اُن کے خلاف

رشوه ستان قاچاق بر

ای مهین خواجه فلک درگاه   کاخت از خاک سر کشیده بماه
ای که سودی تو ملتی فرسود   در زیان کسان چه جوئی سود

---

[1] چین کی چائے کی طرف اشارہ ہے۔
[2] دیوان خلیلی۔ چاپ بنیاد فرہنگ، ایران، تہران ص ۹۱

چشم بر مال دیگران تا چند — تشنهٔ خون این و آن تا چند
شهره گشتی به رشوه در آفاق — چاق گشتی ز خوردن تا چاق
هر که از خون خلق شد فربه — نزد ارباب حق ازو خر به
قصرها از ستم بپا کردی — همه از اشک و خون بنا کردی
تا کجا این همه تپیدن ها — این تپش ها و این دویدن ها
این جهان بر مثال مرداریست — مایه رنج و نکبت و خواریست
کرگسان دور او هزار هزار — همه مردار خوار و مرده شکار
میزنند شام تا سحر منقار — این مر آن را برای یک دینار
آخر الامر بر پرند همه — حسرت زندگی برند همه
از همه باز ماند این مردار — وقنا ربنا عذاب النار[1]

رشوت ستانی کے بارہ میں افغانستان ایران کے معاصر شعرا نے بہت زیادہ نظمیں لکھی ہیں۔ ان سب میں سے عصر حاضر کی ایرانی شاعرہ پروین اعتصامی نے "دزد و قاضی" کے عنوان سے ایک مثنوی لکھی ہے جس کے چند ابیات بطور موازنہ پیش ہیں:—

برد دزدی را سوی قاضی عسس — خلق بسیاری روان از پیش و پس
گفت قاضی این خطا کاری چه بود — دزد گفت از مردم آزاری چه سود
تو قلم بر حکم داور میزنی — من ز دیوار و تو از در میزنی
میبرم گر من ره خلق ای رفیق — در رهٔ شرعی تو، قطاع الطریق
می برم من جامهٔ درویش عور — تو رباح در رشوه میگیری بزور[2]

دونوں شعرا کے کلام میں رشوت ستانی اور اس کے سماجی فساد اور لوگوں کے فریب اور مکر سے نفرت اور ضد کا اظہار ملتا ہے اور وہ سماج کے ان اصلی دشمنوں کا چہرہ عوام کے سامنے رکھتے ہیں۔

---

1. دیوان خلیلی، چاپ بنیاد فرہنگ ایران، تہران ص ۱۷۵ – ۱۷۶
2. شعر فارسی از مشروطیت تا امروز، دکتر جعفر موید شیرازی، تہران، ۱۳۵۰ شمسی ۱۹۷۸ء ص ۶

مسدس

استاد خلیلی کا ایک خوب صورت مسدس جو انھوں نے امیر خسرو کی شان میں لکھا تھا
اور اسے ۱۳۴۲ش/۱۹۶۳ء میں امیر خسرو کے سالانہ عرس منعقدہ دہلی میں پڑھ کر
سنایا تھا، ذیل میں اپنی تفصیل کے ساتھ درج ہے۔
خلیلی نے اپنی اس مسدس کو تاریخ کے گذشتہ ناموروں سے متاثر ہوکر
شروع کیا ہے۔ پہلے عشق خدا، خصلت درویشاں اور درویشوں کے بوریائے
استغنا کی بات کی ہے کہ یہی بزرگ ہیں جنھوں نے ہمارے راستے میں دین کی
شمع روشن کی اور ہمارے لیے بادشاہوں کا خزانہ فراہم کیا ہے۔ اُن کے
بے لوث دل، پاک اور روشن ضمیر کے بارے میں وضاحت کرتے ہیں اور اُن کی
بندگی فوقیت اور برتر مقام اور پاک عشق کی باتیں بتا کر تاکید کرتے ہیں اور اپنی
اس مسدس نظم کو "شبستان سنائی" "حریم مولوی" اور "دیار آشنائی" کے ہدیہ
کے ساتھ امیر خسرو کی بارگاہ میں پیش کرتے ہیں۔ یہ مسدس بہت خوب صورت
ہے اور انسان کے شعری ذوق و احساسات کو برانگیختہ کرتا ہے:۔

سالگرہ امیر خسرو

ہدیہ استاد بہ مناسبت سالگرہ ی امیر خسرو کہ
کہ در شب عرس بر مزار وی خوانده شد

در شکنج قرن ہا در عصرہای بی شمار
محو شد ہنگامۂ چندین شکوه و اقتدار
شہسواران ماند ند از کف زمام اختیار
تاجداران را ز سر افتاد اکلیل وقار

اینک از آن کاروان ها نقش پای مانده است
داستانی بر لب دستان سرای مانده است
آنچه محکوم حوادث نیست انوار خداست
بارگاه بندگان ناز دار کبریاست
کشور آشفتگان ژنده پوش بی قباست
عالمی دارند کز سیر جهان ما جداست
عالمی دارند کان در بند سال و ماه نیست
ماه و خورشیدی در آن غیر از دل آگاه نیست

نزد اینها کعبهٔ دل آسمان دیگر است
صد هزاران کهکشان و ماه در وی مضمر است
عشق در دنیای ایشان آفتاب انور است
سینهٔ این عاشقان هم باختر هم خاور است
آفتاب عشق ازین جا نور افشانی کند
بوریای کار صد اورنگ سلطانی کند[1]

این بزرگان در رهٔ ما شمع دین افروختند
بر بساط دیگران چون شمع خود را سوختند
آنچه را خود از دبستان ازل آموختند
همچو گنج خسروانی بهر ما اندوختند
خازن این گنج پنهان سینه‌ها کانند و بس
محرم این راز سر پوشیده پاکانند و بس

---

[1] دیوان خلیلی چاپ بنیاد فرهنگ ایران - تهران صـ ۲۴۲

از شمیم ہر گلی پیغام جان بشنیده اند
در دل ہر قطره بحر بیکرانی دیده اند
در بہای یک نگہ کون و مکان بخشیده اند
این حریفان بر متاع جسم و جان خندیده اند
تا نجم گان سینۂ ہر ذره را بشگافتند
در دل ہر یک ہزاران ماه و انجم یافتند

میدمد از خاک ایشان تا ابد آواز عشق
میرسد زین پرده در گوش دل ما ساز عشق
بر سر این کنگره پر میزند شہباز عشق
ہر غبارش میرود تا عرش با پرواز عشق
پایۂ این ره نشینان از دو عالم برتر است
ہر که قانع شد به خشک و تر شہ بحر و بر است

خسروا در بارگاہت ارمغان آورده ام
از شبستان سنائی داستان آورده ام
از حریم مولوی چندین نشان آورده ام
از ریاض آشنائی بوی جان آورده ام
این حدیث جانفزا بشنو که آواز دل است
بشنو این آواز روح انگیز کز ساز دل است[1]

مخمس

خلیلی نے "آفتاب و سایہ" کے زیر عنوان طائف میں بارگاہ

---

[1] دیوان خلیلی، چاپ بنیاد فرہنگ ایران، تہران صفحہ 224

محمدی میں حاضری کے وقت ایک مخمس نظم کیا ہے جسے پڑھ کر ہر مومن کا دل لرز جاتا ہے اور دراصل حضور محمد صلعم کی اُس پر مشقت سرگذشت کی یاد دلاتا ہے جو انھوں نے اسلام کی تبلیغ و دعوت اور پھر بعد میں اُس کی اشاعت کے راہ میں برداشت کیں اور جس نے دنیا کے ستمگاروں کے محلوں کو لرزہ براندام تھا۔ دری کے قدیم شعرا اور خصوصاً سبک خراسانی کے پیشوا خاقانی نے کعبہ میں "حرز الحجاز" کے عنوان سے ایک قصیدہ لکھا تھا ——— جو شاعر کے احساسات اور جذبات کی سرشاری کا مظہر اور اس کی پختگی کا آئینہ دار بھی تھا۔ خاقانی ایک طویل تشبیب کے بعد مدح کی جانب رجوع ہوتے ہیں جس کا مطلع "شب رواں چوں رخ صبح آئینہ سیما بینند" ہے۔ قصیدہ کس طرح آگے بڑھتا ہے :۔

گر بمکہ فلک و نور مجزا دید تد ... در مدینہ فلک و عرش معلا بینند
خاکیان جگر آتش زدہ از باد سموم ... آنچو خاک در حضرت والا بینند
مصطفیٰ پیش خلائق فگند خوان کرم ... کہ مگس راں وی از شہپر عنقا بینند
بندہ خاقانی و درگاہ رسول اللہ از آنکہ ... بندگان حرمت ازیں در گہ اعلیٰ بینند[1]

اگرچہ خاقانی اور خلیلی کی مدحیں بہت زیادہ شباہت نہیں رکھتی ہیں لیکن بارگاہ پیغمبر اسلام میں مختلف زمانوں میں اُن کی حاضری مشترک احساس کی حامل ہے اور جسے اب ذیل کے مخمس میں ملاحظہ فرمایا جا سکتا ہے :۔

آفتاب و سایہ

"طائف میں جہاں حضور صلعم کو سایہ میں بیٹھنے کی اجازت نہیں دی گئی روٹی اور پانی مہیا نہیں کیا گیا اور اُن پر پتھر برسائے گئے لیکن اُن کے ثبات اور استحکام کو ختم نہ کر سکے"

---

[1] انتخاب قصاید انوری خاقانی ناشر، محمد احمد خاں، دہلی ص ۶۷

شاہد است این کوه ہا این دشت ہا این خار ہا
شاہد است این آسمان این ثابت و سیار ہا
آن عقاب تیزبین از قلۂ کہسار ہا
شاہد است این سنگ ہا در پشت این دیوار ہا
ز آنچہ بر ذات شریفش رفت از آزار ہا

سنگ اینجا بر گرامی گوہر فطرت زدند
خاک اینجا بر فروزان چشمہ رحمت زدند
طعنہ بر مسندنشین کشور عزت زدند
بر طلوع شمس ما خفاش ہا تہمت زدند
در رہ سلطان گل پیدند فرش خار ہا

نور بینش تافت اما کس بہ چشمش جا ندا د
آفتابی را بزیر سایہ کس ماوا ندا د
ہیچکس یک جرعہ آبی ندر آن دریا ندا د
جلوہ ہا دیدند و کس آواز آمنا ندا د
نور حق دیدند افزودند در انکار ہا[1]

آن مودت ہا رفت اما قلب وی از جا نشد
بر جبین انورش چینی ز غم پیدا نشد
یک نفس برق تبسم دور از آن لب ہا نشد
خم بر آن ابروی جان بخش طرب افزا نشد
بلکہ حظ ہا برد آزار دہندہ، یار ہا

بر سر این سنگ ہا دنیای نو بنیاد شد
بر بنای آدمیت صد جہان آباد شد
زین شکیبائی براندہ قلب گیتی شاد شد
در کہن تاریخ عالم فصل نو ایجاد شد

---

[1] دیوان خلیلی، چاپ بنیاد فرہنگ ایران ص ۲۹

تاج ہا برخاک افتاد از سر سر دار ہا
لرزہ در کاخ ستمکاران دنیا در فتاد
رعشہ در بازوی شاہان توانا در فتاد
از زمیں آوازہ حق تا ثریا در فتاد
سرکشاں را پایہ ی اجلال از پا در فتاد
خاکساری زد علم بر مسند جبار ہا[1]

ترکیب بند

شاعر خلیلی نے صنف نظم میں دوسری اصناف کی مانند "کعبۂ اقبال" کے عنوان کے تحت ایک ترکیب بند لکھا جس میں پہلے "محفل عاشقان اقبال" سے مخاطب ہیں، اقبال صدی میں شرکت کی آمد اور اُن کے روضہ کی خاک "بہ رصد بوسہ" دینے کے از حد اشتیاق کا ذکر ہے اور پھر اقبال کی تصنیفات "رموز بیخودی" اور "اسرار خودی" کے مطالعہ کا تذکرہ کرکے اور پھر سنائی مولانا روم اور افغانستان کے اُن عارف شعرا کا ذکر کرتے ہیں پیام دیتے ہیں. جن کے اقبال خود معتقد رہے ہیں اور اُن کی شان میں ارادت مندانہ اشعار کہہ گئے ہیں۔

ان مراسم میں حصہ لینے کی آرزو اور اشتیاق کی سرشاری کا جذبہ لے کر شاعر سفر حج سے مشرف ہوتا ہے اور کعبہ کے جلال اور مدینہ کے شکوہ اور مراسم حج کی ادائیگی کا ذکر کرتا ہوا یہ دعویٰ کرتا ہے کہ اگر اقبال کی خاک اُس کا یہ اعتذار پہنچا دیا جائے تو "اُن کی تربت" سے اُس کی تائید اور تحسین کی صدا آئے گی اور اس بات سے خوش ہوں گے کہ "خلیل تیگر" (خود شاعر مراد ہے جو تمام شعرا کی

---

[1] دیوان خلیلی چاپ بنیاد فرہنگ ایران۔ صـ ۳۰ (مخمس ۱۶/ اسد ۱۳۴۵ش/ ۱۶ اگست ۱۹۶۶ء کو طائف میں لکھا گیا تھا۔

مانند اپنے ذہن میں بت اور صنم تراشا ہے) "خلیل بت شکن" یعنی خانہ کعبہ کی بارگاہ میں باریاب ہوا اور اسی ضمن میں مبارکبادیں بھی دیں گے۔

کعبہ و اقبال

"ثور ۱۳۴۵/مئی ۱۹۶۶ء میں لاہور کے فضلا نے شاعر کو دعوت دی تھی کہ وہ علامہ اقبال صدی تقریبات میں شرکت کرے لیکن چوں کہ اسی زمانہ میں حجاز کا سفر در پیش تھا اور زیارت حرمین شریفین کا شوق تھا اس لیے اس تقریب میں شامل ہونے سے معذرت کی اور یہ ترکیب بند بھیجا[1]

ای محفل عاشقان اقبال — وی مجمع دوستان اقبال
بودم بہ آرزو کہ امسال — آیم بہ آستان اقبال
صد بوسہ زنیم از سر شوق — بر خاک سپہر شان اقبال
اسرار خودی ز سر بخوانیم — در نامۂ جاودان اقبال
بو ئیم رموز بیخودی را — بار دگر از زبان اقبال
راز دل دردمند گوئیم — با مردم راز دان اقبال
بینیم کہ باز شہر لاہور — گردیدہ مدیحہ خوان اقبال
بینیم کہ باز آن کہن شہر — نازد بہ دل جوان اقبال
گوئیم پیام از سنائی — ہر روز بگوش جان اقبال
توائیم ز مولوی سخن ہا — تا مست شود روان اقبال
بودیم بدین امید شادان
کامد خبری ز کشور جان[2]

---

[1] دیوان خلیلی، چاپ بنیاد فرہنگ ایران، تہران ص ۳۴۶

[2] " " " " "

گفتند حرم درش گشاده | بر خلق صلای عام داده
لیلای سیاه پوش کعبه | از چهره نقاب بر گشاده
آنجا که هزار ماه و خورشید | سر بر در عزتش نهاده
آنجا که امین وحی جبرئیل | دربان صفت از ادب ستاده
آنجا که کلاه فخر شاهان | بر خاک نیاز اوفتاده
بر گردن سرکشان گیتی | پنهاده شکوه وی قلاده
آن مهد مهین که خاک پاکش | رشک مه و آفتاب زاده
یعنی که جمال نور احمد | زین طور جلال جلوه داده

زین قله همای فخر و اقبال
بگرفته جهان جان تهِ بال

این مژده چون آفتاب یکبار | تابید به کلبهٔ دل تار
هم حافظه رخت بست و هم هوش | هم دست فتاد و هم دل از کار
عشق آمد و شد بیک تجلی | سلطان قلمرو دل زار
احرام حریم شوق بستیم | پرواز کنان بسوی دلدار
مالیدیم رخ نیاز بر در | سودیم سر ادب به دیوار
پروانه صفت طواف کردیم | بر شمع برین خانهٔ یار
این عذر من ادب خاک اقبال | ای با خبران کنید تذکار
از تربت او صدا بر آید | کاحسنت باین خجسته کردار
چون یافت خلیل بت گر ما | در کوی خلیل بت شکن بار

این خلعت نو مبارکش باد
وین تاج ترا ز تارکش باد[1]

قطعات

خلیلی اپنے ایک قطعہ موسوم ''دختر گدا'' میں سماجی نا برابری پر کراہتا

---

[1] دیوان خلیلی چاپ بنیاد فرہنگ، ایران، تہران صہ ۲۵

ہے اور اس بے مایہ اور نادار لڑکی کے درد دل کی تشریح کرتا ہے جو کہ اپنی تکلیف دہ زندگی پر اپنے مالدار مگر بد اخلاق نفس ہمسائیوں کی سخاوت اور خیرات کشی کا شکوہ کرتی ہے۔ اس موضوع پر افغان کے دوسرے شعراء اور خصوصاً آقاری زادہ شاعر نے بھی نظمیں لکھی ہیں لیکن یہاں موازنہ کے طور پر اس قطعہ کے بعد ہم ایرانی شعراء میں سے بہار اور پروین اعتصامی جیسے شعراء کے قطعات بطور مثال پیش کریں گے۔

عیدی بہ دختر گدا

گفت ای تو اہر صبا گیر ند عید	دختران اغنیا در کوی ما
می کشند آن جامہ ہای رنگ رنگ	ہمچو شاخ گل سحر بر روی ما
کودک ہمسایہ می خندد صبا	چون کہ بینند پینہ بر زانوی ما
بر سلام ما نگوید کس علیک	کس نیاید از نگاہی سوی ما
شانہ بر فرقم نیاید راہ خویش	یخ گرفتہ تار تار موی ما
گشتہ انگشتان ما یکسر کرخت	بسکہ بارد برف بر بازوی ما
بوی این خوراک ہای رنگ رنگ	می رباید ہر نفس نیروی ما
لقمۂ نانی بہ ما روزی نداد	تاجر ہمسایہ بدخوی ما

یہاں کے عصری شاعر ملک الشعراء بہار بھی " دختر فقیر " کے عنوان سے ایک نظم لکھ گئے ہیں جس میں ایک معصوم بچی کی داستان بیان کی ہے جو اپنے معذور والدین کی زندگی اور نگہداشت کے لیے دست سوال دراز کرنے پر مجبور ہے۔

---

[1] دیوان خلیلی چاپ بنیاد فرہنگ ایران، تہران ص ۶۱

دختر فقیر

دختر خرد دیدم بگدائی مشغول — کرده در جامۂ صد پارہ نہاں پیکر خویش
حبہ ای سیم بدو دادم و بگذشتم و سوخت — برق چشم تر او خرمنم از آذر خویش
شامگاہان بیکی بیشہ شدم بر لب رود — ناگہاں دیدم اش آنجا بسر معبر خویش
با لبی خندہ زناں میشد و میخواند سرود — بخلاف لب خشکیدہ و چشم تر خویش
گفت دارم پدر عاجز و مامی بیمار — کہ نیارند بپا خاستن از بستر خویش
ہست این خندہ ام از بہر دل خود لیکن — گریہ ام بود برای پدر و مادر خویش[1]

لیکن پروین اعتصامی " قلب مجروح " نامی ایک منظوم قطعہ میں تقریباً یہی مفہوم جو خلیلی کے قطعہ کا ہے ، بیان کرتی ہیں ، اس میں بھی ایک یتیم بچہ اپنی زندگی کی مجبوریوں سے نالاں ہیں اور اپنی فقیری اور دوسروں کی آرام دہ زندگی اور سماجی نابرابری اس کو پسند نہیں ہے ۔ چنانچہ اپنی ماں کے دامن کو پکڑ کر روتا ہوا کہتا ہے : ۔

قلب مجروح

دی کودکی بہ دامن مادر گریست زار — کز کودکان کوی بمن کس نظر نداشت
طفل مرا ز پہلوی خود بیگناہ راند — آن تیر طعنہ زخم کم از نیشتر نداشت
امروز اوستاد بدرسم نگہ نکرد — مانا کہ رنج و سعی فقیران ثمر نداشت
ہمسایگان ما برہ و مرغ میخورند — کس جز من و تو قوت ز خون جگر نداشت

---

[1] ڈاکٹر منیب الرحمان ، برگزیدہ شعر فارسی معاصر ج اول علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ۱۹۵۸ء صـ۱۲۰

خندید و گفت آنکہ بہ فقر تو طعنہ زد — از دانہ ہائی گوہر اشکت خبر نداشت
بس رنج برد و کس نشمردش بہ ہیچکس — گمنام زیست آنکہ دہ و سیم و زر نداشت
نساج روزگار دریں پہن بارگاہ — از مہر ماقماشی ازیں خوب تر نداشت [1]

شاعر بڑھاپے کو باد خزاں سے تشبیہ دیتا ہے اور زندگی کے باغ و بہار کو تباہ کر دینے والی بیماری قرار دیتا ہے اور یہی نہیں اسے سرطان کی بیماری کے مماثل قرار دیتا ہے جسے انسان دیکھتا اور پہچانتا ہے۔ لیکن علاج نہیں کر سکتا۔

پیری چو یکی پیل خراماں زدہ آمد — برباد شدم آنچہ بجابد زجوانی
کردہ است دریغا بہ من ایں رہزن پیری — آنگونہ کہ با باغ کند باغ خزانی
یا ہمچو عقابی کہ بہ چنگال بگیرد — مرغی کہ نیارستش دگر ہیچ رہانی
چنگال فرو بردہ چو خرچنگ در اعظام — زخمش ہمہ پیدا بود و درد نہانی
آری مرض پیری ہمچوں سرطان است — کش بینی و بشناسی و درمانش ندانی [2]

ایرانی شاعر فرمان بختیاری پیری کے عنوان پر ذیل کی غزل لکھتے ہیں :—

رسید پیری و افسانۂ شباب گذشت
چناں گذشت کہ گوئی مگر بخواب گذشت
بہائی عہد جوانی شناختم روزی
کہ پیری آمد و نیرو شد و شباب گذشت
بہ جستجوی پل اندر کنار جو ماندم
ولیک عمر بدیوانگی ز آب گذشت
حساب سود و زیاں را چہ حاصل است امروز
کہ در شکستم و کار من از حساب گذشت

1۔ ڈاکٹر منیب الرحمان۔ برگزیدہ شعر فارسی معاصر ج ۱۔ ص ۲۱۶ - ۲۱۷
2۔ دیوان خلیلی۔ چاپ بنیاد فرہنگ ایران، تہران۔ ص ۱۰۲

ہوائی خواندن افسانۂ حیاتم نیست
چرا کہ فصل دل آویز این کتاب گذشت [1]

خلیلی غیروں کے تمدن کے بارہ میں محتاط و مشکوک ہیں اور وہ اس تہذیب کے پوشیدہ زہر اور مکر دونوں سے دور رہنے کی وصیت کرتے ہیں :-

اینک آمد کارواں غیر چشمت باز دار
زشت و زیبایش ببین اینش بگیر آنش مگیر

علم وی تحصیل کن از مکروی دوری گزین
چشم بگشا گوش بر الفاظ بیجائش مگیر

شہد وی با زہر مخلوط است تحلیلش نما
شہد شیرینش بنوش و زہر پنہانش مگیر

این کتاب عصر ما باشد معمائی شگفت
ہوش کن این درس دشوار است آسانش مگیر [2]

خلیلی افغانستان کے سابق بادشاہ محمد ظاہر شاہ کے عقیدت مند تھے اور اسی قربت کی بنا پر افغانستان کے روشن فکر حلقوں میں زیادہ تر "درباری شاعر" کے نام سے پکارے جاتے ہیں۔ شاعر اپنے خیر خواہانہ جذبات و احساسات جو کہ وہ بادشاہ سے رکھتا ہے، اس طرح ظاہر کرتا ہے :-

بہ پادشاہ افغانستان اعلیٰ حضرت محمد ظاہر شاہ

گر گویم عمرت از ہزار افزون باد — قولیست خطا
ور گویم کاخ دشمنت واژون باد — این نیست دعا

---

[1] دکتر منیب الرحمان۔ برگزیدہ شعر فارسی معاصر ج۔ ۱۔ ص ۶۹
[2] دیوان خلیلی چاپ بنیاد، فرہنگ ، ایران ، تہران ص ۱۱۱

امید من آنست کہ در روز جزا | در پیش خدا
نامت بشمار عادلاں مقرون باد | ایں است بجا[1]

شاعر کو لیننگراد شہر کا حسن اس قدر اسیر کر لیتا ہے کہ وہ آرزومند ہو جاتا ہے کہ اس بہشت کے نورانی پھولوں، سبزوں اور منور راتوں کو دیکھنے کے لیے ہزار دل ہوتے اور ہر دل میں ہزار نگاہ ہوتی تاکہ اس چمن کی سیر سے زیادہ سے زیادہ لطف حاصل کیا جا سکتا۔

(شب ہای سپید لیننگراد)

دیدہ ام بشہری کہ شامہای سیاہ
سپید تر بود از روز ہای — نورانی
نمی شود دل خورشید تا خرامد زود
ازیں بہشت بخلوت سرائے پنہانی
بہ روی سبزہ بود آب و روشنی چنداں
کہ آسماں و زمینش تو فرق نتوانی
ہزار بوسہ فرستد بہ ہر نفس خورشید
بہ روی ہر گل با قطرہ ہای نیسانی
درین محیط بیک دل چہ میتوانی کرد
ہزار دل باید در سینہ ہا بہ پنہانی
ہزار دل در ہر دلت ہزار نگاہ
کہ سیر ایں چمنت سہل گر و دار زانی[2]

---

[1] دیوان خلیلی، چاپ بنیاد، فرہنگ ایران، تہران۔ ص ۱۱۱
[2] دیوان خلیل اللہ خلیلی۔ محمد ہاشم امیدوار ہراتی۔ تہران ص ۲۴۳

مستزاد

شاعری کی قدیم دوسری اصناف کی طرح خلیلی نے مستزاد بھی لکھا۔ یوں تو خلیلی نے اپنے ملک کی سیاسی پریشانی اور سماجی بدحالی پر متعدد مستزادات لکھے۔ اُن میں "ملل متحد"، "پیام به ملت ایران" اور "پیام به ضیاء الحق"، ابھی حال ہی میں اُن کے صاحبزادہ مسعود خلیلی نے امریکہ سے شایع ہونے والے ایک رسالہ میں چھاپے ہیں۔ خلیلی کے مستزادات ایرانی شاعر اشرف کے ہمسایہ ہیں۔[1]

ذیل کے مستزاد "نوروز آوارگان" میں شاعر نوروز کے جشن کو خونین کفنان، ماتم زدگان، کشور آتش زدہ اور خانہ ویران جیسی مملکت میں منایا جانا مناسب نہیں سمجھتا ہے۔ وہ دشمن کے ظلم و ستم کی شرح بیان کرتا ہے اور افغانستانی عوام کو مخاطب کرتا ہوا کہتا ہے کہ نہ تو تاج کسی کام آئے گا اور نہ ہی سرمایہ جو غالباً تلمیحاً افغانستان کے سابق بادشاہ محمد ظاہر شاہ اور سرمایہ داروں کے لیے اشارہ ہے اور یہ فقط عوامی طاقت ہے جو کامیاب ہو سکے گی اس مستزاد کے بند حسب ذیل :۔

نوروز آوارگان

گوئید به نوروز که امسال نیاید   در کشور خونین کفنان رہ نگشاید

بلبل بچمن نغمۂ شادی نسراید   ماتم زدگان را لب پر خندہ نشاید

خوں میدمد از خاک شہیداں وطن وای

ای وای وطن وای[2]

---

[1] دیوان خلیلی، بچاپ، بنیاد فرہنگ ایران، تہران صفحہ ۹۲

[2] خلیل اللہ خلیلی، ماتم سرا۔ نوروز ۱۳۶۰ش / مارچ ۱۹۸۱ء نیوجرسی امریکا صفحہ ۲۴۲

گلگون کفناں راچہ بہار و چہ زمستان خونیں جگراں راچہ بیابان چہ گلستان
در کشور آتش زدہ در خانہ ویران کس نیست زند بوسہ بر خسار یتیمان
کس نیست کہ دوزد بہ تن مردہ کفن وای
ای وای وطن وای
جز لالۂ خونبار کہ روید ز زمینت کس نیست نہد گوش بہ فریاد حزینت
جز نام خدا نیست دگر نقش نگینت تاریخ زند بوسۂ عزت بہ جبینت
ای کار تو زینت دہ اعصار و زمن وای
ای وای وطن وای
نی تاج بکار آیدت امروز نہ اورنگ نی صاحب سرمایہ کہ با سوداگراں سنگ
تو ن دل تو خوردہ بہ صد حیلہ و نیرنگ کس نیست کہ فیر وز شود جز تو دریں جنگ
ای بازوی رزمندہ زنجیر شکن وای
ای وای وطن وای

اور تقریباً یہی خیال ایرانی شاعر اشرف کے مستزاد کے بندوں میں ہے جس میں وہ اپنے ملک کی حالت پر توجہ کرتا ہے:-

ای وای وطن وای

گردیدہ وطن غرقہ اندوہ و محن وای	ای وای وطن وای
خیزید روید از پی تابوت و کفن وای	ای وای وطن وای
از خون جواناں کہ شدہ کشتہ دریں راہ	رنگین طبق ماہ
خونین شدہ صحرا و تل و دشت و دمن وای	ای وای وطن وای
کو ہمت و کو غیرت و کو جوش فتوت	کو جنبش ملت
در ما کہ رسید از دو طرف سیل فتن وای	ای وای وطن وای

لہ یحییٰ آرین پور، از صبا تا نیما، ج ۲، تہران، صفحہ ۴۳

تنہا نہ ہمین گشت وطن ضایع و بدنام   گمنام شد اسلام
پژمرده شد این باغ و گل و سرو سمن وای   ای وای وطن وای

غزلیات

فارسی شاعری کی قدیم اور محبوب صنف غزل بھلا خلیلی سے دامن بچا سکتی تھی۔ چنانچہ خوب خوب طبع آزمائی کی ہے۔ جس وقت وہ غزل لکھتے ہیں خود اپنے کہنے کے مطابق اُن کے اشعار کے ہر حرف سے نکہت گل کی آمد آمد ہوتی ہے اور پھر صناعات کے لیے استعمال الفاظ و معانی کے بیان میں اُن کی استادانہ مہارت قابل داد ہوتی ہے۔ چنانچہ ذیل کی غزل کا جادو ملاحظہ ہو۔

سرو روان

بوی یار آورد با خود از جلال آباد باد[1]
چشم نرگس باد روشن، خاطر شمشاد شاد

ای خوش آنشب کز شمیم زلف تو جان یافتم
کی رود تا صبح مرگم لذت آن شب زیاد

نکهت گل میدمد از حرف حرف شعر من
تا بر آن دست چو شاخ گل لبم بوسی نهاد

لال گردم تا سرایم پیش تو حرفی ز عشق
من که بودم در ادای لفظ و معنی اوستاد

بندهٔ چشم تو گشتم ورنه میدانی که چرخ
فطرت شوریده ام را از ازل آزاد زاد

---

[1] افغانستان کے مشرق میں موسم سرما کی تفریح گاہ اور ننگرہار صوبہ کا مرکز

آسمان گر از سر من دست الفت بر گرفت
سایہ سرو روانت از سر من کم مباد[1]

خلیلی کی غزلوں کا مضمون صرف اس کا محبوب ہی نہیں بلکہ اُن کی غزلیات میں گہرے سماجی مفاہیم اور نصیحت آموز مطالب پنہاں ہیں خلیلی ہر علت کے لیے معلول اور جاندار جذبہ کا خواہش مند ہے چنانچہ بے سواد انسان کو "چشم نابینا" اور بے حرکت قوم کو مُردہ ، بغیر عشق کی زندگی کو "شمع بی تابش" بغیر خواہش کے دل کو "بنجر زمین" اور وہ شاعری جو اندرونی درد، حرکت اور تلمیحوں کے اظہار سے عاری ہو۔ وہ "بے مایہ سخن" ہے ۔چنانچہ ذیل کی غزل میں یہ سب کچھ ملاحظہ ہو :۔

چشم نابینا

هر مرد که سنجشی ندارد
چشمی است که بینشی ندارد

چون مرده بگوی زندگان است
هر قوم که جنبشی ندارد

بازی است که مرغ خانگی وار
پر دارد و پرشی ندارد

صد درد به هر رگش نهفته
خود جرأت نالشی ندارد

بی عشق حیات آدمی زاد
شمعی است که تابشی ندارد

باشد چو زمین شوره بی بر
هر قلب که خواهشی ندارد

---

[1] محمد ہاشم امیدوار ہراتی ، دیوان خلیل اللہ خلیلی چاپ تہران ۱۳۴۱/۱۹۶۳ء ص ۔۷۶۔۷

بی تلخی درد گفتن شعر
حرفی است کہ ارزشی ندارد[1]

جب خلیلی ہر چیز کو اپنی خواہشات کے بالکل برعکس پاتے ہیں تو فریاد کرتے ہیں اور پھر نالہ، طاعت اور قسمت تمام چیزوں کا شکوہ کرتے ہیں اور جس وقت وہ کمینوں کے غرور و نخوت کو بلند و بالا دیکھتے ہیں تو معرکہ آرائی اور تلوار کے جوہر پر افسوس کرتے ہیں:—

تابش شمشیر

آہ ای نالہ تراقوت تاثیر چہ شد
آنکہ گفتی شکنم حلقہ ی زنجیر چہ شد

بر در پیر مغاں جبہہ طاعت سودم
آں غباری کہ کند خاک من اکسیر چہ شد

بخت با من سرکیں دارد و گردون سر جنگ
من چہ میخواستم از طالع و تقدیر چہ شد

کوہکن داشت شب ہجر چہ خواب شیرین
غافل از گردش ایام کہ تعبیر چہ شد

ناز پرور دل آوارہ ز من گشتہ جدا
کس نداند کہ در آں زلف گرہ گیر چہ شد

گردن نخوت دوناں شدہ تا چرخ بلند
صفدر معرکہ را تابش شمشیر چہ شد

ماہ من دررہ تو سر بہ کف و جان در لب
روزہا منتظرم علت تاخیر چہ شد

---

[1] دیوان خلیلی۔ چاپ بنیاد فرہنگ ایران، تہران، ص ۳۳
[2] ” ” ” ” ص ۹۱

رباعیات

خلیلی کی رباعیات اس قدر با معنی اور پختہ ہیں گویا اپنے اندر ایک دنیا اور مکمل داستان چھپائے ہوئے ہیں۔ اُن کی جوانمرد فطرت "مردان راہ خدا" کی اس قدر شیفتہ و شیدائی ہے کہ وہ ایسے ہی مردان راہ خدا کے درمیان دفن ہونے کی آرزو کرتے ہیں:۔

آرزو

یارب بکسانی کہ جگر سوختہ اند — یک عمر متاع درد اندوختہ اند
خاکم بہوای آن جوانمردان کش — کز ہر چہ بجز تو دیدہ بر دوختہ اند[1]

جہانگیراں

شاعر جہانگیری کی اور شہرت طلبی کی بری عادت اور اُس کے نتائج کو برسرِ عام افشا کرتا ہے اور اُن کی منحوس گردنوں کے نیچے ہزاروں بیگناہوں کا خون بہتا ہوا دیکھتا ہے:۔

شہرت طلبی چند بہم ساختہ اند — چوں گرگ گرسنہ در جہان تاختہ اند
کردند بزیر پا ہزاران سرو دست — تا گردن شوم خود برافراختہ اند[2]

وہ ایسی نماز کو بے فائدہ سمجھتا ہے جس میں انسان کا دل و دماغ خدا کے حضور میں حاضر نہ ہو تو پھر ایسی نماز میں "دل شرک کے غبار سے آلودہ ہوتے" کے مترادف ہے۔ چنانچہ شاعر کہتا ہے:۔

نماز بی حضور

مقصد ز نماز ما صف آراستن است
یا دل ز غبار شرک پیراستن است

---

[1] محمد ہاشم امید وار ہراتی، دیوان خلیل اللہ خلیلی، تہران ۱۳۴۱/۱۹۶۲ء صـ ۲۱۷
[2] ایضاً

چوں نیست حضور دل چو بوزینہ چہ سود
زین خفتن و خم گشتن و برخاستن است[1]

ایک اور رباعی میں خلیلی نے اپنے معشوق کو عریاں دیکھا ہے اور اُسے بتایا ہے کہ باوجود حجاب کے وہ اُس کے وجود کو سر سے پیر تک مکمل دیکھ رہا ہے:۔

یار برہنہ

دیدی کہ تراچوں گل زیبا دیدم
مانند گہر در دل دریا دیدم
تو گوشہ ی رخ زمن نہاں میکردی
من شاخ گل ترا سراپا دیدم[2]

بی خبر

چوں برہ کہ گرگ می دود از پی وی
بیچارہ بشر دوان و مرگش از پی
از بیم ندانست کہ چوں رفت بہار
وز ہول نفہمید کہ کی آمد دی[3]

شاعر انسان کو موت سے اس قدر خوف زدہ پاتا ہے کہ موت کے اس ڈر سے گویا بہار اور خزاں کی آمد سے بھی بے خبر ہو جاتا ہے۔ اسی لیے وہ شجاعت اور مردانگی کی تعریف کرتا ہے اور انسان کو بہادری اور مردانگی کی تلقین کرتا ہے اور "لیموں" کے تاز اٹھانے سے پرہیز کی تعلیم دیتا ہے:۔

---

[1] دیوان خلیلی چاپ بنیاد فرہنگ ایران، تہران ص۴
[2] " " " " ص۶۹
[3] " " " " ص۸۶

خلیلی ایک دردمند افغانی ہی نہیں بلکہ ملت اسلامی اور دنیائے اسلام کا شیدائی ہے۔ وہ سارے عالم اسلام کو ایک وحدت میں پرونا چاہتے ہیں۔ وہ ملت اسلامی کو ایک درخت سمجھتے ہیں لیکن آپس کے تنازعات اور مخالفت پر تنگ آکر یہ کہنے پر مجبور ہوئے۔

این ملت توحید کہ ازیک شجراند
وزفیض بہار یک چمن جلوہ گرند
دارند بہ خلق درس یکرنگی و خود
چوں مرغ قفس درشکن یک دگرند[1]

ایرانی، افغانی اور عرب مصنفین اور شعرا کے تبصروں اور فیصلہ کے علاوہ خلیلی کی شاعری اور اُن کی کتابوں کے مطالعہ کے بعد ہم اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ وہ خود اپنے زمانہ کا زبردست شاعر ہے۔ میدان شاعری کا شہسوار ہے انتہائی دلنشین اور خوب صورت شعر لکھتا ہے۔ اس کی شاعری عام فہم اور آسان ہے۔ دلچسپ تشبیہات اور ترکیبات استعمال کرتا ہے۔ شاعری میں تلمیحات کا بکثرت استعمال خلیلی کا تاریخ اور داستانوں پر دسترس رکھنا ثابت کرتا ہے۔ اس نے سبق آموز مثنویاں بھی زیادہ منظوم کی ہیں۔

خلیلی سبک خراسانی اور خصوصاً سبک فرخی سیستانی کے زیادہ پیرو ہیں۔ لیکن اسے غزنی دربار کی شاعر نوازی اور عنصری اور فرخی، جیسے درباری شعرا کی خوشحالی زندگی اُسے میسر نہیں ہے چنانچہ فرخی کا یہ تفاخر:۔

از فضل خداوندی واز دولت سلطان
امروز من از دی بہ او امسال من از پار
توانگرم بہ غلام و توانگرم بہ ستور
توانگرم بہ نشاط و توانگرم بہ سرور[2]

---

[1] دیوان خلیلی چاپ بنیاد فرہنگ ایران، تہران صفحہ ۱۹۳
[2] برگزیدہ شعر معاصر افغانستان صفحہ ۹۳

لیکن خلیلی اپنی زندگی سے مطمئن نہیں ہے ۔ درد حرمان اور رنج کا شکوہ کرتا ہے :—

ہیچکس بار من از خاطر من دور نکرد
بر سر بار نہادند ہماں بار دگر

اور یا پھر :—

درد آمد و رنج آمد و حرماں آمد
ابر آمد و باد آمد باراں آمد
شد خانۂ زندگی ز بنیاد خراب
من خفتہ کہ سیل خانہ ویران آمد[1]

خلیلی اگرچہ بڑھاپے اور کمزوری کا شکار ہیں ۔ شکوہ سنج ہیں مگر زندہ دلی سے باز نہیں آتے :—

پیری چو یکی سیل خراماں زرہ آمد
برباد شدم آنچہ بجا بد ز جوانی[2]

اور یا پھر :
پیری تو اگر زار و تباہم کردی
محکوم جفای سال و ماہم کردی
اینہا ہمہ سہل است ولی حیف کہ تو
محروم ز لذت گناہم کردی[3]

جوان ہمتی سے برخوردار ہونے کی بنا پر اس طرح کہنے کا حوصلہ رکھتے ہیں :—
مرا زاد ما در چو شہباز علوی
تمتع ز چون تو غرابی نخواہم

---

[1] دیوان خلیلی ، چاپ بنیاد فرہنگ ایران ، تہران ص ۹
[2] " " " " ص ۱۰۲
[3] " " " " ص ۲۶

بدین طبع زاینده چون بحر مواج
مدد از فسون سرابی نخواهم[1]

ایک طرف تو وہ سماجی نابرابری کی مذمت کرتے ہیں، اپنے رنج وغم کا اظہار کرتے ہیں لیکن دوسری طرف نئے سماجی نظاموں اور افکار کو محتاط ہو کر مگر منافقت اور مخالفت کا اظہار کر کے استفادہ کرتے ہیں:۔

اینک آمد کاروان غیر چشمت باز دار
زشت وزیبایش ببین دانش بگیر آنش گیر

شهدوی باز هر مخلوط است تحلیلش نما
شهد شیرینش بنوش و زهر پنهانش گیر[2]

خلیل کا یہ بہت بڑا وصف ہے کہ جو شاعری اندرونی جذبات کا مظہر نہ ہو اور درد وشور سے عاری ہو وہ کسی لائق نہیں ہے۔ چنانچہ کہتے ہیں:۔

بی تلخی درد گفتن شعر
حرفی است که ارزشی ندارد[3]

خلیل

محمد ابراہیم خلیل ولد مرزا افضل احمد خان ولد مرزا محمد جان خان ولد سعید احمد خان (احمد الہامی زندہ پیلی) کے سلسلہ سے ہیں۔ خلیل اصلاً کابل کے رہنے والے ہیں اور اُن کی تاریخ پیدائش، اُس عہد کے مشہور شاعر اور خطاط قرمی نے ذیل کے قطعہ میں منظوم کر دی ہے:۔

بمرزا افضل احمد خان عطا کرد ایزد منان　　بوقت سعد ولیل جمعہ و نصف مہ شعبان

---

[1] دیوان خلیلی، چاپ بنیاد فرہنگ، ایران، تہران ص115
[2] 〃 〃 〃 〃 ص
[3] 〃 〃 〃 〃 ص

یکی فرزند کو لوح جبینش می تواند خواند — کہ خواہد گشت در علم و ہنر علامۂ دوراں
نمودندش مسمی محمد ابراہیم و میخواہم — برایش زایزد اقبال بلند و عمر جاوداں
چو قرصتی خواست سال این ولادت را زغیب — کہ یکجا کن پسر را با پدر تا پی بری باآں
نمودم بی تکلف جمع نام والد و مولود — سنہ بیروں شد وگشتم ازیں اسرار حق حیراں

ماہ و تاریخ پیدائش فضل احمد (۹۶۳) محمد ابراہیم (۳۵۱) دونوں کا جمع (۱۳۱۴) ھ ق سے بنتا ہے [1] چھ سال کی عمر سے اپنی والدہ سے ابتدائی پڑھنا شروع کیا جیسا کہ خود اس کا اعتراف کیا ہے:۔

وقتیکہ بہ شش رسید سالم — دادند بدرس اشتغالم [2]

بعد میں کابل کے مدرسہ سراجیہ میں مکتب کی تعلیم حاصل کی اور خوشخطی اور خطاطی اپنے والد بزرگوار سے سیکھنا شروع کیا چنانچہ ملک الشعرا قاضی اس وصف کے بارہ میں یوں کہتے ہیں:۔

باشد ار روش خلیل نیکو چو پدر — در خط خوش و نگارش از حسن سیر
خط خوشش از شعر نکو تر خوانم — یا شعر روانش بود از خط خوشتر [3]

وہ خود اس بارہ میں اس طرح کہتے ہیں:۔

در خطہ خط خضر رہم بود پدر — وز شوق چو جامہ پا نمودم از سر
تا با روش نکو بہ آن رہ بردم — بی منت و احتیاج دیگر رہبر [4]

خلیل نے ۱۲ سال کی عمر میں مکتب سے فراغت حاصل کی اور اسی زمانہ میں محاسبی اور دفترداری کے دفاتر میں داخل ہو کر اس فن کو بھی حاصل کر لیا اور ۱۳۳۷ھ ق حکومت میں عہدہ داری پر مامور ہو گئے۔ امان اللہ خان غازی کے

---

[1] گلچیں۔ آثار و شرح حال محمد ابراہیم خلیل۔ چاپ در تہران، ۱۳۴۱، ش ص ۶

[2] 〃 〃 〃 〃 〃

[3] 〃 〃 〃 〃 〃

[4] 〃 〃 〃 〃 ص ۷

دوسرے سال حکومت میں وزارت خارجہ میں بہ حیثیت کاتب کام کیا اور ایک سال بعد ہندستان میں افغانی قونصل خانہ میں کتابت کی ذمہ داری سنبھالی[1] پھر افغانی سفارت خانہ واقع لندن اور پھر پیرس کے سفارت خانہ میں بھی اسی عہدہ پر فائز رہے اور امان اللہ خاں کے یورپ کے سفر کے وقت اُن کی بیگم ملکہ ثریا منشی کی حیثیت سے اور اُن کے صاحبزادہ رحمت اللہ خان کے معلم کی حیثیت سے شریک سفر ہوئے۔

اعلیٰ حضرت محمد نادر شاہ کی حکومت کے زمانہ میں مغربی انتظامیہ میں محاسبی کے صدر کی حیثیت سے اور پھر قومی بینک کے قیام کے وقت اُس کے ایک شعبہ میں کام کرتے رہے اور پھر نادر شاہ کے قتل کے بعد دوسروں کے ساتھ سیاسی قید کا شکار ہوئے اور دس سال کا سخت زمانہ جیل میں گزارا اور وہیں، منطق معانی، حدیث اور دیگر علوم کی تحصیل میں مشغول رہے[2]

۱۳۲۶/۱۹۴۷ء میں قید سے رہائی کے بعد مکتب لیلیہ کابل میں ادبیات اور خطاطی کے معلم ہوئے بعد میں وزارت تعلیم میں شعبہ مالیات کی سربراہی کی۔ بہ حیثیت معلم ادبیات مالی دلداری کورس کے کی اور انھوں نے بعد وہ دارالمعلمین میں ادبیات کے استاد کی حیثیت سے پڑھایا ہے۔ وہ سرکاری ملازمت کے ساتھ ساتھ تدریس بھی کرتے تھے۔ اور اس کے بعد ۱۳۲۱ سے ۱۳۳۹، ش تک سرکاری نمایندہ کی حیثیت سے انجمن تاریخ کے پانچ سال تک ممبر رہے ہیں۔ اور ساتھ ہی سرکاری مجلہ آریانا کے مدیر مسول رہے اور ۶۰ سال کی عمر میں ریٹائر ہو گئے۔ خلیل اب تک حیات ہیں لیکن بہت ضعیف اور کمزور ہو گئے ہیں۔

اُن اخیر سالوں میں افغانستان کے رسائل اور مطبوعات میں اُن کے لیے کلمہ استاد جس کے وہ حقیقی مستحق اور سزاوار ہیں، استعمال کیا جاتا ہے۔ وہ خطاطی میں شاعری سے کم مہارت نہیں رکھتے اور کہا جاسکتا ہے کہ اس فن میں

---

[1] گلچیں۔ آثار و شرح حال محمد ابراہیم خلیل، چاپ زر تہران۔ ۱۳۴۱/۱۹۶۲ء ص ۱

[2] 〃 〃 〃 〃 〃 〃 〃 ص ۱۲

خلیلی نے بہت زیادہ محنت کی ہے اور بہت زیادہ شہرت پائی ہے چنانچہ خود کہتے ہیں:۔

از فرط مشق نور بچشم نماندہ است ۔ یعنی سواد دیدہ نمودم مداد خطے[1]

یا

ز طفلی تا بہ پیری کوشش خط بود کار من ۔ نشہ امان انی نو خطی ای وای یار من[2]

استاد ابراہیم خلیل نے تقریباً ۱۵ اساتذہ کی تصنیفات اپنے خط میں لکھ کر اُن کو محفوظ کر لیا ہے اور اس بارے میں تو دہی لکھا ہے :۔

بیاد کوہکن درصفحہ خاطر رقم سازم ۔ خلیل از ہر زبانی بشنوم یک بیت شیریں را[3]

آثار و تالیفات

اب تک خلیل کی جتنی نثری تخلیقات چھپ چکی ہیں وہ اس طرح ہیں:۔

(۱) یک مرد بزرگ ۔ طبع انجمن تاریخ ، کابل ۱۳۳۶ ش/۱۹۵۷ء

(۲) استخراج تاریخ در نظم ۔ انجمن تاریخ کابل ۱۳۳۷، ش/۱۹۵۸ء

(۳) مزارات کابل ۔ انجمن تاریخ کابل ۱۳۳۹، ش/۱۹۶۰ء

(۴) شرح حال و آثار امیر خسرو، ریاست مستقل مطبوعات کابل ۱۳۴۰، ش/۱۹۶۱ء

اسی طرح ایک کتابچہ بنام مزارات بلخ، دوسرا حالات حضرت سلطان ابراہیم ادہم، تیسرا مزارات ہوگر، بھی تصنیف کر چکے ہیں مگر اب تک زیور طبع سے آراستہ نہیں ہوئے ہیں[4]

نظم میں وہ تمام اصناف سخن پر ایک کلیات مرتب کر چکے ہیں جو ۱۸ حصوں میں ہے۔ اور ۱۶ ہزار ابیات پر مشتمل ہے۔ ابراہیم خلیل کی شاعری اور خطاطی کے بارہ میں افغانستان کے معاصر شعرا کی بہت بڑی تعداد نے جن میں نظیر، بیتاب، اثیم مشایق

---

[1] گلچین۔ آثار شرح حال محمد ابراہیم خلیل، چاپ تہران ۱۳۴۱/۱۹۶۲ء ص۱۰

[2] ۔۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔ ص۱۰

[3] ۔۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔ ص۱۲

[4] ۔۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔ ص۱۴

مستزاد، حاذقہ اور صاعقہ وغیرہ شامل ہیں، منظوم نامے اور اشعار لکھے ہیں جن کی تفصیل ہمیں خلیل کی شاعری کے ذکر سے بہت دور لے جائے گی۔ اس لیے اُن کا ذکر غیر ضروری ہوگا۔

جمہوریہ روس کے تاجیکستان ادیب نعمت اللہ میف اور رحیم ہاشم نے مرکزی وزارت مدنیت، تاجیکستان سے شایع ہونے والی کتاب "استادان شعر معاصر افغان وشاعران معاصر افغان" میں اس شاعر کے بارے میں لکھتے ہیں:-

"شاعر ابراہیم خلیل در منظومہ بہ جوانان بخشیدہ خود رولی
راکہ جوانان در حیات جمیعتی بازی میکند نشان دادہ
صفتہائی مثبتی راکہ در جوانان وطن خود دیدن می خواہد
یک یک می شمارد و برای فائدہ مند شدن خلق و وطن
خود چگونہ رفتار کردن آنہا را خیر خواہانہ بیان می کند"[1]

اب تاجیکستانی مصنفین کی رایوں کو ثابت کرنے کے لیے ہم یہاں خلیل کے اجتماعی احساسات سے پر چند ابیات پیش کرتے ہیں:-

از آں قصر گور کہن بہتر است | کہ در اختیار کس دیگر است
بزندان تاریک بردن بسر | بہ از شہر محکوم قوم دگر
دلا گر بہ طبع تو عبرت بود | نباید اطاعت بہ غیرت بود
خلیل است خوشتر ازآں دار دار | کہ باشد اجانب در آن حکم دار[2]

اسی طرح یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ خلیل نے کس طرح آزادی کی طلب کو اور افغانی حمیت کو ان اشعار میں واضح کیا ہے اور اجنبی تسلط سے نفرت کا اظہار کیا ہے۔

اسی طرح خلیل غیرت اور مردانگی کو طعن آمیز نصیحت کے سہارے ابھارتے ہیں

---

[1] گلچین آثار و شرح حال محمد ابراہیم خلیل، چاپ زر تہران ص ۹
[2] شاعران معاصر افغانستان، طبع تاجیکستان متوروی ص ۲۱۳

اور لوگوں کو اصلیت اور حقیقت کا درس دیتے ہیں:۔

همت مردانه و طبع توانگر داشتن — بهتر است از ملک و مال و ثروت و زر داشتن

خوشتر است از بخت و اقبال و سکندر داشتن — سینه چون آئینه صاف از کینه در بر داشتن

از هزاران کاخ و باغ و قصر و گلشن بهتر است — جای در دلهای پاک اهل کشور داشتن

میوه شیرین تر نخل بهار زندگی است — قلب با احساس و فکر قوم پرور داشتن

گر نباشد عزم جزم و نیت مبرم دلیل — نیست ممکن مشکلات از راه خود برداشتن

در ترقی کوش ای جا مانده کز کوشش غبار — می کند پرواز بر افلاک بی پر داشتن[1]

نیست غیرت بر گل ستار مردا ورا سزاست — چون زنان شرق سر در زیر چادر داشتن

با همه بی دست و پائی ناله گردون تاز شد — عجز کیشان را نمی شاید محو داشتن

دوش پرسیدم ز پیر عقل راه پیشرفت — گفت با عزم متین قلب دلاور داشتن

گفتمش شام سیاه جهل را تدبیر چیست — گفت شمع علم و عرفان را منور داشتن

گفتمش طرق زندگی چون بهتر است — گفت بار کس نگشتن بار کس بر داشتن

گفتمش اسپند چشم زخم ملت چیست گفت — آتش عشق وطن در دل چو مجمر داشتن

گفتمش راه نجات از پنجه ادبار چیست — گفت اقبال محبت یک به دیگر داشتن

باز معنای محبت را از و جستم خلیل — گفت الفت چون برادر با برادر داشتن[2]

خلیل کا کلام رواں اور سادہ ہے اور شیوہ بیانی اُن کی شاعری کا خلاصہ ہے:۔

زندگانی جلوه از برق اوهام است و بس
همچو عنقا هستی ما را همین نام است و بس

بر لب میگون و چشم مست او دل بسته ایم
سرنوشت ما گرفتاران خط جام است و بس

بسکه دارد فکر صید خلق شیخ و برهمن
سبحه و زنار اینجا دانه و دام است و بس

---

[1] شاعران معاصر افغانستان، طبع تاجیکستان شوروی ص ۱۲

[2] محمد عثمان صدیقی، سیر ادب در افغانستان، نشرات انیس کابل ص ۳۰

رو بحق کن چوں جوانی رفت مویت شد سفید
شعلهٔ افسرده را خاکستر احرام است وبس

شوق اگر رہبر شود ہر لب سخن پرور شود
از ازل محروم این رحمت لب بام است وبس

نیستم مانند بلبل نغمہ سنج ہر گلی
انتخاب ماز خوباں آں گل اندام است وبس

ملک گیری چیست ساغر گیر اگر خواہی حیات
زنده باقی ماندن نام جم از جام است وبس

از خیال نرگس شوخی درین گلشن خلیل
دیده ما وقف سیر نقل بادام است وبس[1]

رفع حجاب کا مسئلہ افغانستان میں بہت اہم تھا۔ خلیل نے پردہ کو اُٹھا پھینکنے کے لیے عورتوں کو ہمت دلائی اور پھر "ماہ"، "گل" اور "سروبستان"، کی خوب صورت تشبیہات سے آراستہ کرتا ہوا کہتا ہے کہ اگر ان صفات کے حامل ہوتے ہوئے بھی وہ پردہ میں چھپی رہیں تو اُن کی خوب صورتی پنہاں رہے گی اور کوئی فائدہ بھی نہیں ہوگا۔

در تقاضائی رفع حجاب در سنہ ۱۳۴۵ ش ۱۹۶۶ء

برآئی از زیر ابر چادری ای ماه تابانم
بسوز از تاب حسن این پردہ خورشید رخشانم

درخشاں کوکب گردوں توئی خلق خواندت
حجاب از رخ برانداز ای گرامی نجم فروزانم

توئی ماه و جہاں از پرتو ات میشود روشن
سرت گردم چرا در برقعی مستور حیرانم

توئی گلزار خوبی را گل و گل نیست در پرده
توای گل از چہ رو انیگونہ محجوبی نمیدانم[2]

---

[1] گلچیں از آثار و شرح حال محمد ابراہیم خلیل، چاپ زر تہران ص ۸۲—۸۳
[2] 〃 〃 〃 〃 〃 〃 ص ۹۱

توسرو بوستان زیبی بہار آفرینش را | مجابت چیست بنا روی وغارت کن دل وجانم

میان آتش غم تا بکی باشم خلیل آسا

بر افگن پردہ از روی تو دو بنما گلستانم[1]

افغانستان کے دوسرے تمام شعرا کی مانند اسی سال میں اسی موضوع پر افغانی شاعر بارق شفیعی نے ایک نئی نظم جدید طرز میں لکھی ہے اور افغانی لڑکی کو فارسی دری کی مشہور شاعرہ رابعہ بلخی کی طرح اور شاہنشاہ آریا کی لڑکی کا نام دیتا ہے اور اُسے ہمت دلاتا ہے کہ وہ "اخلاقی مفاسد" کے خلاف مردانہ وار باہر آئے:-

بی پردہ جلوہ کن

ای خواہر عزیز !

ای دخت آریا !

بشنو کہ پاک گویمت وبی پردہ گویمت !

گل نیستی کہ من

تنہا بویمت۔

ای نور چشم رابعہ ای دختر یما !

پہنای زندگی۔

چوں سینہ تنگ نظراں تنگ و تار نیست

ہر ذرہ زین جہان۔

چوں ہوش راہنمائی !

روشن ستارہ ایست بہ صحرای زندگی

باری ز خود برای

در انجمن درای ۔

---

[1] بارق شفیعی، شہر حماسہ کابل ۱۳۵۸ ھ ش

کاینجاست آزمونگهٔ نبردی مردمی ۔

ای دخت هوش مند !
بانوی نیک خوی !
ای گوهر گرامی فرزند آدمی !
مردانه سرکش ۔
در جنگ با مفاسد اخلاق بردگی
پاکی حصار عفت و دانش سلام تست! کابل، اسد ۱۳۲۵ھ، ۱۹۴۶ء

خلیل کی شاعرانہ خوبیوں میں یہ وصف بھی نمایاں ہے کہ وہ زندہ دلی اور ہوس و آرزو کی گفتگو کرنے کے باوجود تشدد اور بدی کی مخالفت کو پوشیدہ رکھے جیسا کہ مندرجہ ذیل غزل میں واضح ہوتا ہے :۔

عمر رفت و برخت حسرت دیدن باقیست — شوق حرفی ز لبت نیز شنیدن باقیست
از هوس ها هوس قد رسای تو مرا — همچو جان تنگ در آغوش کشیدن باقیست
پرده از رخ مگن ای ماه که شام ما را — تیرگی تا دم این صبح دمیدن باقیست
مهلتی ای اجل آخر که بپای قاتل — نفس چند مرا ذوق تپیدن باقیست
مرغ روحم بهوای تو بود در پرواز — تا باین بیسر و پا تاب پریدن باقیست
نسزد گفت باین مردم عالم انسان — تا یکی را بد کر تیغ کشیدن باقیست
صورت نبض درین دائره سعی و عمل — زنده تا که ترا ساز تپیدن باقیست
سالها جادهٔ پر پیچ سخن پیمودیم — لیک در معنی باریک رسیدن باقیست[1]

در ادب گاه جهان گوش دلم را چو خلیل
ذوق یک معنی نشنیده شنیدن باقیست

اسی طرح وہ اپنی ایک نظم دختر گلفروش میں اس مخصوص کام کی خوبیوں کو سراہ کر خود گلفروش لڑکی کی زبان سے ان اوصاف کو بیان کرنا چاہتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ

[1] گلهای نا آشنا و شرح حال محمد ابراهیم خلیل چاپ در تهران ص ۹۲

جو کوئی کام کرتا ہے۔ وہ بے کاری کی لعنت کے طعنہ سے محفوظ رہتا ہے اور بکواس کرنے اور غیبت کرنے کی فرصت ہی نہیں ہوگی :۔

گلفروش

دختر باغبان گلزارم — نیست جز گل بکس سروکارم
صبح و شام است ہم نشینم گل — نبود کار با خس و خارم
شده ام از نگاه نرگس مست — ساغر گل نموده سرشارم
دسته دسته سبد سبد گل را — بر تماشاچیان ہمی آرم
میکنم عرضه بر خریداران — ہر قسم گل که در چمن دارم
میخرد ہر که ہر گلی خواہد — صحن بستان شده است بازارم
گلفروشی چو خود فروشی نیست — تا از آن ننگ باشد و عارم
شغل این دسته بندی گل ہا — یک قلم بسته دست آزارم
نکنم عیب جوئی و غیبت — بسکه در کار خود گرفتارم
نشنوم تا که طعن بیکاری — گلفروشیست کارم و بارم
گلفروشم زمن گلی بخرید — یکدو سه دسته سنبلی بخرید[1]

شاعر کے کلام میں سادگی کی زیادتی اس بات کا ثبوت نہیں ہے کہ وہ شعر و شاعری کی مشکل صنعتوں کے استعمال یا نامانوس ترکیبوں اور الفاظ کے استعمال پر قدرت نہیں رکھتا ہے۔ اس لیے کہ جس طرح ہم نے شروع میں ذکر کیا کہ موصوف اردو اور عربی زبان سے بھی واقفیت رکھتے ہیں اسی لیے خلیل کی سادگی کو ان کے معاشرہ کے علمی مرتبہ اور معیار سے اور ادراک و احساس سے بہ خوبی واقف ہونے کی دلیل سمجھنا چاہیئے۔

---

[1] گلچیں از آثار و شرح حال محمد ابراہیم خلیل چاپ زد تہران صفحہ ۱۲۳-۱۲۴

اس شاعر کی شاعری کے بارے میں گفتگو کو اُن کے ایک قصیدہ کے ذکر کے ساتھ جو کہ اُن کی خدا پرست طبیعت اور دیندار ہونے کا ثبوت ہے شروع کرتے ہیں کہ وہ خانہ کعبہ اور مدینہ منورہ کو دیکھنے اور وہاں حاضر ہونے کا کس قدر آرزومند ہے ۔

نالہ دل

رسید موسم حج و ز شوق بیت حرم   چو بسملست دلم باز مضطرب ببرم
چہ موقعی است کہ سلطان لامکاں ماوی   دہد بخانہ خود بار خلق را ز کرم
خوشا کسانکہ درین وقت فرح و سعود   بآرزوی کرم میکنند از ہم دم
بسوی یثرب و بطحا بشوق گرم روند   چنانکہ حسرت شاں میزند بجاں شررم
ہزار حیف کہ امسال، ہمچو پار نشد   بآرزوی دل و جاں میسر ایں سفرم
دریغ و درد کزیں فیض بار سیر و سفر   چو نخل پای بگل جای ماندہ در حضرم
بہر دقیقہ کہ یاد آید آں حریم شریف   چہار رکن ہمایوں و آن سیہ حجرم
حطیم و زمزم و حجر و مقام ابراہیم   ستاد ملتزم و آن خجستہ بام و درم
ز غصہ ہر سر مو در تنم شود نشتر   جہاں سیاہ نماید چو قیر در نظرم
صفا و مروہ و میلین و سعی در مل در آں   بیاد آید و سازد ز خویش بے خبرم
منا و مزدلفہ کوہ رحمت و عرفات   چو بگذرد بدلم ہوش میرود ز سرم
حریم قدس، حبیب خدا و ختم رسل   بیاد آید و خوں ریزد از دو چشم ترم
بشوق بوسۂ آں آستاں عرش نشاں   باضطراب چو سیماب شام تا سحرم
ترحمی کن و در باب یا رسول اللہؐ   کہ شوق و ذوق فزوں است و من شکستہ پرم
ز التفات کریمانہ ات رجا دارم   کہ رحمت تو شود دستگیر و راہبرم
ز فیض فائض خود بازراہ دہ بدرت   طفیل حضرت صدیقؓ و حضرت عمرم
بحق جامع قرآن و عز باب العلم   طفیل حضرت شبیرم و حرست شبرم
بجملہ آل و باولاد و از واجت   کہ بندہ ہمہ خود را بعجز میشمرم
ز حج و عمرہ و طوف حریم اقدس خود   ز لطف ساز شرفیاب نوبت دگرم

زکامیابی بوس درت بلندم بر — کہ من بہر جہت از خاک راہ پست ترم
بہار کم بند اکلیل بوس خاک درت — کہ در علو مراتب زچرخ در گزرم
روا مدار شہا، سیدا! امید گہا — کہ شوق بوسی درا شرفت بخاک برم
ترحیکہ نماند چو لالہ تا بآید — ازیں تحسر جانکاہ داغ در جگرم
قبول کن شرہ ام رابدگہت جاروب — عطای منصب جاروکشی نمای بسرم
کرم نما کہ زلطف تو درامان باشم — زشر دیو رجیم آنزمان کہ جان سپرم
نہ طاعت ونہ ریاضت نہ بندگی کردم — چو چوب خشک ہمیں سوختن بود ہنرم
نظر بہ فیض بہار شفاعت تو مراست — کہ شاخ خشکم ودیمائیست برگ و برم
بیک شفاعت تو یکجہاں شوم شاداب — کہ خود بلفکرم درافتم کہ نخل پر ثمرم
زفیض باری ابر شفاعت دریاب — من خلیل سیہ روی و مادر و پدرم

وگر تو راہ بجا تم زشش جہت بنداست
بچشم فکر بکردار خود چو مینگرم

خلیل نے رباعیات بھی لکھی ہیں اور موضوع کی مناسبت سے دوسری اصناف سخن کی مانند اس میں بھی کامیاب ہیں۔ مثلاً اپنی ایک رباعی میں اپنی پاک صاف سرشت کا اظہار کرتے ہیں اور دیگر شعرا کی مانند اپنی رندی شاہد بازی اور مے نوشی کو ریا اور مکاری پر ترجیح دیتے ہیں:—

گویند مرا کہ رند و شاہد بازی — مشتاق مئ ولبتۂ تار سازی
ہر چند باین و آنم آلودہ خلیل — صد شکر کہ پاکم از ریا پردازی[1]

اُن کی دردمندانہ طبیعت اور صلہ رحمی کا جذبہ اُن کے سارے وجود پر غالب رہتا ہے۔ اسی لیے اُن کا نازک اور حساس دل خداوند تعالیٰ کی بارگاہ میں فریاد کناں دعا کرتا ہے:—

---

[1] گلچیں از آثار و شرح حال محمد ابراہیم خلیل چاپ نو در تہران، ص ۱۲۵ – ۱۲۸
[2] ایضاً ایضاً ایضاً ص ۱۰۲

یارب الٰہی نہ بیند از خطہ خاک　　یارب نفتد بچنگ ظلم افلاک
چشمیکہ کہ بہ حال دردمندی گرید　　دستیکہ زدیدۂ کند اشک پاک [1]

آج کی دنیا کی موجود اور غیر موجود چیزوں کو شاعر انسان کی کوشش اور محنت کا نتیجہ سمجھتا ہے اور اس بات کا دعویٰ کرتا ہے کہ ہر مشکل سعی اور عمل کے سامنے قابل تسخیر ہے :—

در دہر ہر آنچہ جلوہ دارد بہ نظر　　بی شبہ بود نتیجہ کار بشر
پس کار کنید تا کہ ممکن گردد　　چیز یکہ محال گفتہ اند ش اکثر [2]

بیتاب

استاد صوفی عبدالحق بیتاب، ولد مرحوم عبدالاحد عطار ۱۳۰۶ھ ق / ۱۸۸۴م ، میں کابل میں پیدا ہوئے ، وہ اپنی عمر کے بارے میں ایک رباعی سے اظہار کرتے ہیں :—

در سیصد و شصت چار از بعد ہزار　　شد پنجہ و ہشت عمر بیتاب نژاد
افسوس کہ کاری کہ بکارم آید　　در جملہ عمر خود نکردم یکبار [3]

ابتدائی تعلیم گھر پر پائی ، پھر چند مروجہ کتابیں عربی کے معروف زمانہ استادوں سے پڑھیں، خاص طور پر ادبیات کے فن میں خاصی توجہ اور زیادہ کوشش دکھائی ہے ۱۳۳۹ھ۔ ق/ ۱۹۶۱ء سے علوم کی خدمت پر کمر باندھی اور آجکل وہ کالج آف آرٹس کے منتخب اساتذہ میں سے ایک شمار کیے جاتے ہیں [4]

---

[1] گلچیں از آثار شرح حال محمد ابراہیم خلیل چاپ زر تہران صفحہ ۴۲
[2] 〃 〃 〃 〃 〃 〃
[3] خستہ معاصرین سخنور، کابل ۱۳۳۹ھ ش/ ۱۹۶۰ء صفحہ ۹۵
[4] اب وہ حیات نہیں ہیں اور اس دنیا سے رخصت ہو چکے ہیں۔

۱۳۷۱-ق/۱۹۵۰ء وزارت تعلیم کی سفارش پر اعلیٰ حضرت محمد ظاہر شاہ کی طرف سے ملک الشعرا کے لقب سے سرفراز ہوئے [۱]

بیتاب کے شاعرانہ مرتبہ اور اُن کے طرز کلام کے بارے میں افغانستان کے بعض ادیبوں اور نقادوں نے اس طرح اظہار کیا ہے :-

مولانا خستہ لکھتے ہیں:-

" بیتاب نہ تنہا اُستاد ادبیات در معارف است بلکہ منزل و ماوای او نیز درسگاہی است برای تحصیلات ادبیات و اصلاح شعری بعد از قاری اکثر شعرا و نویسندگان معروف امروز از شاگردان حلقہ درس بیتاب می باشد بیتاب شہید مضمون تازہ است نہ ہلاک تعداد ادبیات بی اندازہ غزلیاتش بالغ بہ سہ ہزار بیت خواہد بود -

بیتاب شاعری میں اپنے آپ کو قاری عبداللہ ملک الشعرا کی شاگردی کی نسبت رکھتے ہیں اور اس پر فخر بھی کرتے ہیں - چنانچہ میں نے بارہا اُن کی زبان سے سُنا ہے کہ وہ کہا کرتے تھے کہ اگر قاری نہ ہوتے تو بیتاب بیتاب نہ ہوتا [۲]

بیتاب کہ واقف رموز اشیا است   اسرار حقیقت ز ضمیرش پیدا است
تنہا نہ بہ فن ادب اُستاد بود   سرمایہ دانشش از نیہا بالا است [۳]

موجودہ افغانستانی فاضل محمد حیدر ژوبل اُن کے بارہ میں یوں رقمطراز ہیں:-

" استاد فنون ادبی ، بدیع ، بیان - عروض و معانی ، دستور زبان و تصوف اند استاد در علوم معقول و منقول از عربی و ادبی و نحو متبحر است تالیفات گرانبہا و تراجم عالی در رشتہ ہای مختلف ادبی دارند دیوان شعرشان بدیع است و یکبار در کابل بچاپ رسیدہ - بیتاب شخص پارسا و در تصوف پیرو مسلک نقشبندیہ است - غزلش متمایل بسبک

---

[۱] خستہ معاصرین سخنور صد ۱۷
[۲] " " " صد ۸۲-۸۳
[۳] " " " "

ہندی است اما تماماً سبک ہندی نیست و از تکلفات عاری ست
خودش میفرماید کہ بنا بر موقعیت کابل بین ہند و سائر قسمت ہای
خراسان (افغانستان) غزلش بین سبک ہندی و خراسانی است
غالب غزلیات شان بیدل آتش میزند۔[1]

روسی تاجیکستان کے فارسی دانشوروں نے بیتاب کے بارہ میں یوں کہا ہے:
"بیتاب یکی از کہنسال ترین نمایندگان نظم امروزہ افغانستان
بودہ خصوصاً در غزل سرای مہارت کامل و شیوہ با مرغوب و
شیوا دارد۔ بیتاب گرچہ از پیروان بیدل است ولی در غزلہائی از
تکلفات عنعنوی اسلوب ہندی بسوی سادگی مضمون نہاد و فصاحت شعر
میرود۔"[2]

بیتاب کے کلام کے تعارف کے لیے ہم شروع میں اُن کے وطن پرستانہ اشعار
کے چند اشعار پیش کر رہے ہیں جو انھوں نے وطن کی آزادی کے وصف میں
لکھے تھے:۔

نعمت استقلال

نعمتی بہتر ز استقلال نیست — حاجت بسیار قیل و قال نیست
دور او چون دور ساغر نشہ بخش — عہد و جبر۔ عہد میمون فال نیست
این سعادت این کرامت این شرف — جز نصیب ملت فعال نیست
عیش و آزادی مرادف بودہ اند — ملت محروم از دو خوشحال نیست
شکر ایزد ملت آزاد ما — جز بزیر دست استقلال نیست

---

[1] محمد حیدر ژوبل، نگاہی ادبیات معاصر در افغانستان، کابل، ۱۳۴۴ھ ص ۹۹
[2] نعمت اللہ لیف و رحیم ہاشم۔ استادان شعر معاصر افغان۔ طبع مطبعہ مرکزی
وزارت مدنیت تاجیکستان شوروی۔

هر کجا دارد بملک مستقل | هیچگاه خلق او پامال نیست
وصف استقلال کن از زری شوق | ای سخن پرور زبانت لال نیست
جز ترقی حقیقی وطن | هیچ بیتاب مرا آمال نیست [1]

شاعر آزادی کی نعمت کو دنیا کی تمام نعمتوں سے بڑھکر جانتا ہے اور عیش کو آزادی کے برابر سمجھتا ہے اور اُس کا مطلب ظاہر ہے کہ آزادی کا حاصل کرنا اور اُس کی حفاظت کرنا بغیر کوشش اور جد وجہد کے ممکن ہی نہیں ہے چونکہ افغانستان ایک آزاد ملک ہے اس لیے وہ خدا کا شکر ادا کرتا ہے اور سوائے ملک کی حقیقی ترقی اور آزادی کی آرزو کے کوئی دوسری تمنا نہیں رکھتا ہے۔

"بیتاب بیدل کے ارادتمند ہیں اور اُن کے طرز میں غزلیں بھی لکھی ہیں۔ ذیل کی دو غزلیں انھیں موشگافیوں اور ادبی تکلفات کا مظہر ہیں جو آدمی کو سبک ہندی کے اشعار کی فکر میں مبتلا کر دیتی ہیں۔ اور اُس کا ہر مصرعہ اور شعر پڑھکر غور و فکر اور گہرائی اور گیرائی کو آشکار کرتا ہے تاکہ اُس کے معانی کا پتہ لگایا جا سکے۔ اسی طرح اس غزل میں تشبیہات اور استعارات میں موی سفید کی مثال شیر، قدخم کو حلقہ زنجیر سے لے کر اپنی استادانہ مہارت کا ثبوت دیا ہے اور (حرص بی پیر) جیسی بے نظیر (حرص) اصلاح اور موسیقی میں "آہنگ" اور "بم وزیر" جیسے کلمات کا بہترین استعمال کیا ہے۔

باستقبال حضرت بیدلؒ

شدم پیر و ہمان در حلقہ دام ہوس گیرم | ندانم چون کنم یارب علاج حرص بی پیرم
اسیر بند و زندان علائق بودم از عمری | قدخم حلقہ دیگر فزود نیک بزنجیرم

---

[1] ح ۔ نعمت اللہ شریف و رحیم ہاشم۔ استادان شعر معاصر افغان۔ طبع مطبعہ مرکزی وزارت مدنیت تاجیکستان شوروی۔

مرا از دیدن موی سفید این نکته روشن شد | که پیش فطرت از کودک مزاجی در خور شیرم
کنون تار نفس در خارج آهنگیست زین محفل | بغیر از نغمهٔ ساز فنا بوده بم و زیرم
ز من محکم گرفتن دامن دنیا نمی آید | همان بهتر که از اوضاع عالم عبرتی گیرم
فریب خوان هستی بعد ازین هرگز نخواهم خورد | ز دوران شکوه‌ها دارم که کرد از زندگی سیرم
ز طفلی و جوانی و دم پیری چه می پرسی | ز هستی تا عدم یکسر بیابان مرگ تقدیرم

نمی شاید که بندم تهمت هستی بنام خود
عدم دیدست خوابی و قش بیتاب تعبیرم [1]

بیتاب کی جو غزل ذیل میں نقل کی جا رہی ہے اس قدر، موثر، مترنم اور اسیر کر دینے والی ہے کہ ہر صاحب دل کو اتنا مسحور و مجذوب بناتی ہے اور اُس کے درونی جنون کو اتنا برانگیختہ کرتی ہے کہ اس غزل کو بار بار گنگناتا ہے اور اُس کے آہنگ سے لطف حاصل کرتا ہے۔ اس غزل میں بھی صنائع شعری اور تشبیہات کا خوب استعمال کیا ہے اور پہلے شعر سے ہی "نقاب" کو "سحاب" اور "رُخ" کو "آفتاب" سے تشبیہ دیتا ہے اور آخر میں بھی اپنے تخلص کو ایک شاعرانہ تفہیم کا رنگ دیتا ہے اور کہتا ہے کہ اگر تم میرا تخلص جاننا چاہتے ہو تو کلمہ "آب" کو لاؤ مگر اس ترتیب سے یعنی "بیت" جمع "آب" "بیتاب" بنتا ہے:۔

غزل

دور نمی کند ز رخ دلبر من نقاب را | زیر سحاب می‌نگرم تابه کی آفتاب را
حسن لطیف از ازل والہ حسن بوده است | شاهد شوخ و شنگ را چنگ و نی و رباب را
از نگه تلطفی رفع خمار ما بکن | ایکه دو چشم مست تو نشه دهد شراب را
نیست زمان و فرصتی، موقع تماس و تملقی | شرح با و چسان دهم حال دل خراب را
در سفر جنون از و امیر سدم هزار غم | همره خود چرا برم مقتل سیه رکاب را

---

[1] تحفهٔ معاصرین سخنور۔ کابل ۱۳۳۹ھ ش ۱۹۶۰ء ص ۴۷-۴۸

گر نہ مدام داشتہ رتبہ گنج خسروی — دفن کنند در زمین از چہ خم شراب را
چشم سیاہ مست او از نیکہ بباده کرده خو — ہمچو شراب میخورد خون دل کباب را
چوں ز لبش سفر ہیچ بمن نمی رسد — چارہ بگو چسان کنم حال دل خراب را
نکہت خوی یار را ہیچ گلی نداشتہ — کرده ز شرم بارہا غرق عرق گلاب را

فکر تخلص اگر ہست ترا درین غزل
آر پی حضور آن آخر بیت آب را[1]

ایک دوسری غزل میں شاعر ابتدا میں جامہ ہستی پہننا نہیں چاہتا ہے۔ اور اُسے کسی اور کی متاع، بے ارزش جانتا ہے اور غفلت میں گزری ہوئی عمر پر جو خواب خرگوش کی مانند تھی افسوس کرتا ہے لیکن آہستہ آہستہ معشوق کا قد اور فتنہ انگیز آنکھ اُسے ایسے فریب میں مبتلا کر دیتی ہیں کہ قیامت کی باتیں فراموش ہو جاتی ہیں، مے خواری تقویٰ کا دامن تار تار کر دیتی ہے اور اس قدر شور و جوش کا شکار ہوتا ہے کہ "پستانِ دختر رز" کو پوری قوت سے چوسنے لگتا ہے:؎

جامہ ہستی فلک افگند بر دوشم بزور — این متاع کس مرا بر کہ بفروشم بزور
جا بجا با قد برایم رشتہ طول امل — گرچہ می سازد فنا آخر کفن پوشم بزور
عمر رفت و من ہمان غافل ز پشتکار خود — سود خیزاند مگر زین خواب خرگوشم بزور
زان تنک ظرفان نیم کز جرعۂ بیخود شوم — ساغر سرشار چشمی میبرد ہوشم بزور
گر بدینسان فتنہ انگیزی نماید قامتش — می کند حرف قیامت را فراموشم بزور
من کہ عمری دامن تقوی ز کف نگذاشتم — چشم بدمست تو آخر کرد می نوشم بزور
این قدر سرو چمن مغرور رعنائی مباش — بر کند این جامہ ات سرو قبا پوشم بزور
طفل اشکم دختر رز را چنین مستانہ گفت — میرسد روزی کہ پستان توی چوشم بزور

این ہمہ بیتابی و شور و فغان من بود
سروی دوران اگر ننشاند از جوشم بزور[2]

---

[1] ح- نعمت اللہ لیف و رحیم ہاشم، استادان شعر معاصر افغانستان، طبع مرکزی وزارت مدنیت ص
[2] م- ح- ز- بل نگاہی بادبیات معاصر در افغانستان، کابل، ۱۳۴۲ ش، ۱۹۵۸ م، ص

بیتاب ہر دوسرے شاعر کی طرح اس ماحول میں جس میں وہ زندگی بسر کرتا ہے۔ اپنے اُس ادراک و احساس کی بدولت جو شعرا کا خاصہ ہے۔ اپنے ماحول سے متاثر ہو کر اُس کے ہر نتیجہ کا اثر اپنی شخصیت میں جذب کرتا ہے اور جدید ایجادات اور انکشافات کو شروع میں معلوم کراتا ہے، اُس سے بہرہ ور ہوتا ہے۔ اور اُن پر زیادہ توجہ دیتا ہے۔ ان سب اشیا میں سے بجلی (برق) دوسری تمام چیزوں کی بہ نسبت آج کی زندگی میں حاوی اور ضروری ہے۔ اور شاعر اس کی اہمیت اور ضرورت کو ایک ایک کر کے شمار کرتا ہے اور بتاتا ہے کہ کس طرح "برق خرمن سوز" "ماہ جہان افروز" میں تبدیل ہو گئی ہے۔

برق

شب کہ رفت از پیش چشم چہرہ تابان برق
گشت دنیا بر سرم تاریک از ہجران برق

تلگراف و رادیو و سینما و نمکس ریز
نی تکلف زندگی دارند از جریان برق

بسکہ باشد مایہ عیش و نشاط عالمی
ہر کرا بینی بود از جان و دل خواہان برق

منعم و مفلس بہ نقد جان خریدارش بود
تاجری خرم کہ وارد می کند سامان برق

برق باشد بہترین اختراعات جدید
راست میرسی ندارد ہیچ چیزی شان برق

از چراغ و شمع زین پس کس نمی یابد سراغ
جان خود پروانہ می باید کند قربان برق

برق خرمن سوز را ماہ جہان افروز ساخت
آفرین بر مولد خورشید نور افشان برق

اختراعات دگر بیتاب چون با او رسد
شرق تا غرب است در یک ثانیہ جولان برق [1]

بیتاب کو زیادہ تر غزل سرائی سے دلچسپی ہے لیکن شاعری کی دوسری اصناف میں بھی کم دلچسپی نہیں ہے اور استاد کی صحبت شعر و شاعری کے بارہ میں گفتگو ختم کرنے سے پہلے بہتر یہ ہوگا کہ ان کے ایک قطعہ کو جو اُن کی وطن دوستی کے جذبات سے پُر ہے اور اُس کی ناپذیر تسخیر کی ہمت کی نشاندہی کرتا ہے، یہاں اُن کا ذکر کردوں اس قطعہ میں شاعر سیہ چال میں زندگی گزارنے اور زنداں کے تنگ کنج میں جان سے گزر جانے اور دوسرے ناممکن کاموں کے انجام پانے کو سیلاب کو کوڑے کرکٹ سے روکنے، اور بال سے سنگین پہاڑ کو کھینچنے کے برابر قرار دیتا ہے اور سخت پتھر کو بالوں سے کاٹ دینے کے مانند سمجھتا ہے۔ اور اس طرح کی چیزوں کو اتنا مشکل نہیں جانتا ہے جتنا اس کے لیے دوسروں کا محکوم ہونا ہے۔

قطعہ

بسختی در سیہ چال آرمیدن — بکنج تنگ زندان در خزیدن
ز آب زندگانی دست شستن — امید عافیت از جان بریدن
رہ سیلاب از خاشاک بستن — بموکوہ گرانی را کشیدن
حزف را گوہر شہوار کردن — بمژگان سنگ خارا را بریدن
پشستن بردن از زنگی سیاہی — بفرق سر بلاشش کوہ دویدن
ز سختی ہای چرخ فتنہ اندیش — بزیر آسیا سنگی خزیدن

نباشد آن قدر ہا سخت و مشکل
کہ خود را زیر دست غیر دیدن [2]

---

[1] ح۔ نعمت اللہ شریف ندیم ہاشم، استادان شعر معاصر افغان۔ طبع مطبعہ
[2] خستہ معاصرین سخنور کابل ۱۳۳۹ ش ۔ ۱۹۶۰ء ص ۷۹

تالیفات وتراجم : بیتاب کی کچھ مطبوعہ وغیر مطبوعہ تصنیفات وتراجم حسب ذیل ہیں۔
الف۔ تالیفات مطبوعہ: ترجمان الشافیہ (صرف) درعلم بیان۔
ب : ۔ تالیفات غیر مطبوعہ: ترجمان الکافیہ (نحو) مفتاح العروض (عروض)
ترجمہ منطق (مولفہ خیر الدین مصری) ترجمہ موجز للب) ترجمہ رسالۃ الامراض ۔
ترجمہ اصول التر کیب (از مولفات نجیب الدین سمرقندی)
ترجمہ جزو اول کتاب علم الاجتماع طبع مصر
ترجمہ و تصحیح تفسیر شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہم
دیوان و غزلیات [1]

پژواک

عبدالرحمان پژواک اصلاً مشرقی افغانستان کے باشندے ہیں اور وہ ۱۲۹۷ ش / ۱۹۱۸ء میں غزنین میں پیدا ہوئے [2] ابتدائی تعلیم اپنے والد سے حاصل کی اور ثانوی تعلیم کابل میں مکمل کرنے کے بعد مڈیکل کالج (فاکلتہ طب) میں داخلہ لیا لیکن اُس سے رغبت نہ رکھنے کی بنا پر دو سال بعد وہاں سے نکل آئے۔ اُن کا پہلا مشغلہ کابل کی ادبی انجمن میں مترجم کے عہدہ سے شروع ہوا۔ اُس کے بعد مختلف شعبوں میں مطبوعات سے متعلق محکموں کے مستقل صدر رہے اور آجکل وہ اقوام متحدہ میں افغانستان کے مستقل نمایندہ کے عہدہ پر سرفراز ہیں [3]

اسی اقوام متحدہ میں پژواک ۱۹۵۸ سے ۱۹۷۲ء تک نمائندے رہے حقوق انسانی کے تحفظ کے کمیشن کے ۱۹۶۳ میں صدر ہوئے اور ۱۹۶۶ء میں اکیسویں عوامی اجلاس کی صدارت بھی کی ۔

---

[1] خستہ معاصرین سخنور کابل ۱۳۳۹ ش ۱۹۶۰ء ص ۴۲
[2] محمد عثمان صدیقی۔ در کتاب سیر ادب در افغانستان ۱۳۴۰، کابل ص ۲۵۸
[3] محمد مسعود عطائی۔ برگزیدہ شعر معاصر افغانستان۔ از انتشارات تہران۔ ۱۳۵۰/ ۱۹۷۱ء

پژواک ۱۹۷۳ء سے ۱۹۷۷ تک ہندستان میں افغانی سفیر کی حیثیت سے کام کرتے رہے[1] پژواک کی متعدد تالیفات اور تراجم ہیں۔ وہ تین زبانوں یعنی دری، پشتو اور انگریزی میں لکھتے ہیں۔ ان کا پہلا شعری مجموعہ ۱۳۴۳ش ۱۹۶۴ء میں "چند شعر پژواک" کے نام سے کابل میں شائع ہوا۔ اُن کا دوسرا شعری مجموعہ "گلہای اندیشہ" کے عنوان سے ۱۳۴۴ش ۱۹۶۵ء کابل ہی سے شایع ہوا۔

پژواک کو عراقی اور خراسانی شعرا کے سبک سے خاص تعلق ہے۔ یہاں تک کہ کلمات اور اوزان میں وہ انھیں کی پیروی کرتے ہیں لیکن یہ دلچسپی اُن کو آج کے مسائل کو شاعری میں سمونے کی توجہ سے باز نہیں رکھ سکی ہے۔ چونکہ پژواک کی زندگی کا بیشتر حصہ بیرون ملک گزرا ہے اس لیے اُن کے اشعار ادبی تاثرات اور عالمی مسائل سے الگ نہیں رہ سکے ہیں۔

پژواک نے مختلف اصناف شعری پر طبع آزمائی کی ہے۔ انھوں نے مثنوی قصائد اور غزلیات سبھی کچھ لکھی ہیں اور تقریباً تمام کی تمام پرانی اوزان اور قالبوں میں ہی ہیں لیکن شاعر پژواک نے روزانہ کے افکار اور مسائل کو اپنی شاعری میں سمویا ہے۔ ذیل کی مثنوی میں مشرق کو مغرب کے مقابلہ میں لاکر بزعم خود ان دونوں کا مقابلہ کیا ہے۔

اگر کس دل بہ گیتی برگمارد — جہاں افسانہ ہای طرفہ دارد
شبی بخت جوان خضر رہم بود — دل پر آرزوی ہمرہم بود
سرم پر شور از شور جوانی — تنم پر زور از زور جوانی
روانم شاد خاطر بود مسرور — ز جام آرزو سرمست و مغرور
بہ نیرو چوں عقاب تیز پرواز — فضا آزاد بال و پر مرا باز
چو روح از زندگی آزاد بودم — بجان از زندگانی شاد بودم
ز ساحل رہ سوی دریا بریدم — در آن دریا بسی ہنگامہ دیدم
چہ گویم زان محیط بی کرانہ — گرد گاتش دل من جاودانہ
بہ موجش بر فسوں قوت و زور — بہ قلبش در جنون جذبہ و شور
پر شور و شوق و مستی چوں دلی بود — چو دل او را نہ پیدا ساحلی بود
ز عکس اختران از ہر کنارہ — شدہ آغوش او پر از ستارہ

جمال اختران آسمانی   درد تابان چو روح شادمانی

روان بر روی او کشتی شبانگاه   بسان آسمان و زورق ماه
دل شب روی عرشه بر نشستم   در آن دنیای روشن خیره گشتم
دلم پر از آرزوهای جوانی   سرم مست از شراب زندگانی
چنان سرخوش از آن پیمانه بودم   که جز دل از جهان بیگانه بودم
گهر بودی اگر فرزانگی را   شدی تاج سر آن بیگانگی را
"بگردابی چو می افتادم از غم   رسیدی دردمی آن دل بدادم
اگر زاندیشه در ره حائلی بود   "به تدبیرش امید ساحلی بود"
درون سینه چون دل می تپیدم   تو گفتی موج بودم می جهیدم
فضای سینه زآزادی جهانی   دلم شاهین مست پرفشانی
که ناگه یادم آمد روزگاری   که از خود داشتم زیبا دیاری
ز کهساری بلندی یاد کردم   که هر گه در دلش فریاد کردم
دل سنگش مرا فریادرس بود   بر تنگش مرا جای هوس بود
نخودش گرچه این آهنگ و این ساز   همین پیچید در کهسارش آواز
از آن پژواک های آسمانی   نیوشیدم سرود جاودانی
نه زلیسان زان دیار آواره بودم   نه از دوری چنان بیگانه بودم
که ماه دیگرانم نور بخشد   دلم را تابش آن نور بخشد
برون گشتم بیاد کوهساران   از آن پرشور دریای خروشان
ز مغرب سوی خاور شد خیالم   دگرگون گشت زین اندیشه حالم
گران اندیشه های شرق چون خاک   سبک اندیشه های غرب چالاک

---

۱۳۱ این دو مصرع بیتی از غزل معروف خواجه شیراز بود که مطلع آن اینست"
"مسلمانان مرا وقتی دلی بود   که با وی گفتمی گر مشکلی بود"
محمد سرور مولائی. برگزیده شعر معاصر افغانستان انتشارات از تهران ۱۳۵۰ ش ص ۵

مثال شرق چو کوہ گران است | محیط غرب چوں بحر روان است
مثال این و آں چوں بحر ساحل | چو ساحل ماندہ بر جا شرق کاہل
کہ ماہ و خور بپایند و بتابند | بہ قلب کوہسارش رہ نیابند
چو دریا غرب میگردد شتابان | سر راہ مہر و خورشید تابان
دل شرقی دل است اما فسردہ | فروغ شمع آزادیش مردہ
زبانش بستہ و روحش اسیر است | زہر جا ماندگی ہا ناگزیر است
چراغ غرب از شادی است روشن | ز آزادی فزوں گردش روغن
الا ای ساقی صہبای آمید | بدہ جامی بہ این دلہای امید
دل افسردگان را شاد گردان | زبان بستہ را آزاد گردان
از آن صہبا دو جامی دہ بہ این دل | از آن دریا پیالی دہ بہ این دل
تمار خاک را بشکن بہ آبی | دریں ظلمت بتابان آفتابی

کہ گر دریا دُر و گوہر دہد باز
کہستان کانہای زر دہد باز[1]

چونکہ شاعر نے یہ مثنوی اپنی جوانی کے ایام میں لکھی تھی اسی لیے کہا تھا " سرم پر شود از شور جوانی " یہ بات بہت واضح ہے کہ اُن دنوں مشرق بہت ہی پس ماندہ تھا اور ترقی و علم کے میدان میں میلوں پیچھے تھا اور شاعر نے اس حقیقت کا صحیح ادراک کیا ہے کہ " دل شرقی دل است اما فسردہ ، فروغ شمع آزادیش مردہ " اور مغرب کے بارے میں صحیح کہا ہے کہ " چراغ غرب از شادی است روشن " لیکن مشرق اب شاعر کی جوانی کے زمانہ کا مشرق نہیں ہے ۔ آج مشرق بیدار ہو چکا ہے اور اس کے عوام نے علم و دانش کی ضرورت ، ترقی اور آزادی کی اہمیت کا اندازہ کر لیا ہے ۔

وہ مشرقی ممالک جو کل تک آزادی کی نعمت سے محروم تھے ایک کے بعد ایک آزاد ہو چکے ہیں اور مشرق کے وہ پس ماندہ ممالک ، جو سیاسی آزادی رکھتے تھے لیکن اقتصادی آزادی سے بے بہرہ ہیں انھوں نے اپنے اقتصادیات کو بہت

---

[1] محمد سرور مولائی ۔ برگزیدہ شعر معاصر افغانستان ۔ انتشارات تہران ۔ ۱۳۵۰ ص ۲۲۸

بنانے کے لیے بہتر اور اعلا اقدامات کیے ہیں اور آج مشرق کی پیش رفت کے لیے بڑی تحقیق و جستجو کر رہے ہیں پیسہ خرچ کر رہے ہیں تا کہ دنیا کے قافلہ میں قدم بہ قدم بڑھتے رہیں اور اپنے آپ کو استعماریت اور مغرب کے جوئے سے باہر نکال سکیں۔

ہر دن جو کہ گزرتا ہے مشرق مغرب کے لیے تذبذب کا باعث اور آنکھوں کا کانٹا بن رہا ہے اور یہاں تک کہ اس کوشش میں ہے کہ جس قدر جلد ہو وہ پھر ایک بار مغرب سے آگے بڑھ جائے اور آج مشرق میں بقول شاعر "درین ظلمت آفتابی تابیده است" ہاں یقیناً معرفت اور علم اور سیاسی شعور کا آفتاب طلوع ہو رہا ہے۔

یہاں پژواک کے قصاید کا ایک نمونہ "بہار بادغیس" پیش خدمت ہے:۔

با آنکہ ہیچ خوش نیم از وضع روزگار	شادم از و بجان بکی طرفہ یادگار
آن یادگار خوش کہ فراش نمی شود	مارا اگر دہ تا کہ فراموش روزگار
در حیرتم کہ شکوہ کنم زوی یا کہ شکر	ہر چند شکوہ کم بود و شکر بیشمار
شاکر از آن کہ دیدہ ہمن دید بادغیس	شاکی از آنکہ سیر ندید و شدم سوار[1]

یارب چہ عادت است کہ گر لمحۂ تو شیم	آن لمحہ نیست لمحۂ دیگر بہ یک قرار
زانسان کہ خاطرات خوش از دل برون روند	از قلب بادغیس گزشتم نسیم وار
دیوانہ وار پای نہادم از آن برون	زانسان کہ مست می کند از میکدہ فرار
آری دیار عشق و جمال است بادغیس	ہشیار کس برون نتوان شد ازین دیار

ای کاش ہمچو رودکیم[2] بخت می سپرد	رودی بدست و دل بنواہای رود یار
با سانرود فارغ از اوہام مولیان	می جستمی میان گل و سبزہ بوی یار
یا حکم بر بسیط جہانم روا بدی	می داشتم چو خواجہ شیراز اقتدار

---

[1] م۔ ج۔ ژوبل بگاہی بادبیات معاصر افغانستان کابل، ۲۴ ثور ۱۹۵۸ء ص ۱۶
[2] فارسی کا مشہور قصیدہ گو شاعر اور قصیدہ کا مطلع بوی جوی مولیان آید ہمی یاد یار مہربان آید ہمی

تا صد هزار ملک سمرقند می شدی   قربان حسن سبز تو ای طرفه مرغزار[1]
یا بیشمار ملک بخارا بدادمی   بر بیشمار خال گل روی کوهسار
در خلق این دیار خدا را چه صنعتی است   یا رب چه کلک بود که کرده است این نگار
سبز است اینکه گشته از آن خاکدان سپهر   یا آسمان فرو شده و گشته سبزه زار
خوش آنکه روزگار بمن مهربان شود   هر چند احمقی است که باشم اُمیدوار
یاری کند بمن ز سر لطف بخت سر   بگذاردم خدای در آنجا یکی بهار
غیر از سرور عشق نباشد دو گوش   جز انتظار هوش نسازد دو چشم چار
یک دست باشدم بیکی گردن سبو   یکدست باشدم بیکی گردن نگار
یکپائی بهر آنکه زنم پشت پا بغم   یکپای وقف رقص کنم روی سبزه زار
یک گوش بر نوای دل بینوای خویش   گوش دگر فتای نوا های آبشار
یک چشم محو ساقی صافی پاکباز   چشم دگر برود و چمن زار و کوهسار
یک کف ز جام ماه پر از آفتاب می   یک کف سفینۂ پر از اشعار آبدار
پیمانه چو پر شود آنگاه آسمان   اشکم ستاره سازد و گیرد بیادگار
افسانه نوشته کند در افق بنور   اما بشرط آنکه نخوانندش هوشیار
مردم بفکر آنکه بود سبزه روی قبر   ما را بروی سبزه بسازند یک مزار
میخانه ای در آن عوض خانقا کنند   آنجا طرب کنند جوانان می گسار
من در میان خاک و کهستان بادغیس   پژواک شاد باش فرستد بهر یار

گاهی که دوستان من آنجا سفر کنند
یاد آورند ز آنکه سفر کرده زآن دیار[2]

مندرجہ بالا قصیدہ میں شاعر اپنے زمانہ سے ناخوشی کا اظہار کرتا ہوا علاقہ بادغیس کے سفر کا ذکر کرتا ہے اور مشہور شاعر رودکی اور اُس کے قصیدہ "بوی جوی

---

[1] حافظ شیرازی کی مشہور غزل کی طرف اشارہ
اگر آن ترک شیرازی بدست آرد دل ما را   بخال هندوش بخشم سمرقند و بخارا را

[2] م - ج ژویل اگاہی بادبیات معاصر افغانستان کابل، ۱۳۳۷ ش / ۱۹۵۸ء صفحہ ۸۹

مولیان آید ہمی۔ یا دیار مہربان آید ہمی اور حافظ کی مشہور غزل "اگر آن ترک شیرازی بدست آرد دل مارا۔ بہ خال ہندوش بخشم سمرقند و بخارا را کی تلمیحات سے مزین کرتا ہے اور اسی تحسین و آفریں کے ساتھ ساتھ اس علاقہ کی فطری خوبصورتی کا دل کھول کر ذکر کرتا ہے اور پھر وہیں رہ جانے اور اسی سرور اور تخیل میں وہیں دفن ہو جانے کی آرزو کرتا ہے۔

یہ قصیدہ اپنی جگہ خود اتنا سلیس، سادہ اور رواں ہے کہ قاری کو سبک خراسانی کا دور یاد دلا دیتا ہے اور فرخی اور عنصری کے قصاید کی یاد تازہ کر دیتا ہے۔ فرخی عنصری اور خاقانی کے ادبیات اس طرح ہیں:—

از فضل خداوندی واز دولت سلطان

امروز من از ی بہ واسال من از پار۔ فرخی

شنیدم کہ از نقرہ زد دیگدان　　زرز ساخت آلات خوان عنصری۔ خاقانی

لیکن اب شاعر کے زمانہ کے حالات بالکل بدل چکے ہیں کیوں کہ موجودہ حالات سماجی اور اقتصادی انقلابات سے دوچار ہیں۔ اس زمانہ کے جو شعرا خوشحالی کی زندگی بسر کرتے تھے صرف می و معشوق اور مال و دولت کا ذکر کیا کرتے تھے اور آج کا بیچارہ شاعر یہ کہنے پر مجبور ہے:—

خوش آنکہ روزگار بمن مہربان شود　　ہر چند احمقی است کہ باشم امید وار

پژواک نے بادشاہ افغانستان اعلحضرت محمد ظاہر شاہ کی ہمرکابی میں قونیہ کا سفر کیا تھا اور مولانا رومی بلخی کے مزار پر حاضر ہو کر ذیل کا مدحیہ قصیدہ لکھا تھا:—

مطرب بزن کہ رامش و دستانم آرزوست

ساقی بدہ کہ بادہ فراوانم آرزوست

رسوائی خرد نتوانم دگر کشید

آب رخی میانہ مستانم آرزوست

تا بر درم بیاد تو اشک صد ہزار یار

ہر لحظہ صد ہزار گریبانم آرزوست

تا هیچ دل بکس ندهم عشقم آن بود
تا هیچ آرزو نکنم آنم آرزوست[1]

دیوانگیم منکر فیض بهار نیست
با جیب پاره گوشه دامانم آرزوست

ای اختر فلک بخودار وا گزاریم
یک لحظ عشق خواب پریشانم آرزوست

از خنده های هرزه چو گل خاطرم گرفت
چون شبنم آه گریه پنهانم آرزوست

تاکی توان گریست برین پاهای پست
چون ابر سیر کوه و بیابانم آرزوست

جز آبهای مرده نگنجد درین محیط
موج سبک عنانم و جولانم آرزوست

زین بندگی که عار کرامت بود بهم
آن بیریا تمرد شیطانم آرزوست

من بحر بیکران عشقم نه کوی خاک
من سیل آرزویم و طغیانم آرزوست

ای شیخ بلخ مطلب و مطلوب من توئی
«کز دیو و دد ملولم وانسانم آرزوست

از بلخ تا بقونیه در جستجوی تو
رقص و سماع و جذبه و هیجانم آرزوست

آن رازها که با تو نهان داشتم بدل
گفتن کنون عیان و بدستانم آرزوست

ای باد کوی دوست اگر میوزی ببلخ
بر من بوز که باد بهارانم آرزوست

---

[1] محمد عثمان صدیقی. سیر ادب در افغانستان. کابل ۱۳۴۰ ش / ۱۹۶۱ ع ص ۲۹

در ہر سفر بیاد جوانان ز خود شدم
در ایں سفر زیارت پیرانم آرزوست
سوی تو می شود ز دیار تو پادشاه
زاں ہمرہی حضرت سلطانم آرزوست [1]

پژواک نے اپنے اس قصیدہ کو دوسرے کلاسیکی شعرا کی مانند بام ِ می، مطرب، بے خودی اور دیوانگی سے شروع کیا ہے اور آخر کار استغنا اور تمرد کا ذکر بھی کیا ہے۔ لیکن شیطانی تمرد کو بندگی پر ترجیح دیتا ہے اور شیخ بلخ مولانا جلال الدین رومی کی شخصیت میں پناہ لیتا ہے اور پہلے اپنے مقصود اور آرزو کو یگانہ انسان سمجھتا ہے۔ اپنی ملالت اور خستگی کو دوسروں کا باعث گردانتا ہے اور کہتا ہے کہ وہ بلخ سے قونیہ تک مولانا کی جستجو میں رقص، سماع، جذبہ اور حال کی کیفیت میں جو کہ بے خودی اور تصوف کے مختلف مراحل ہیں۔ چلا آیا ہے اور اس کا اظہار کرتا ہے کہ چونکہ وہ خود مولانا کے دیار یعنی (بلخ) سے بادشاہ نے اُن کی آرامگاہ (قونیہ) تک کا سفر کیا ہے اس لیے بادشاہ کی ہمراہی کی نعمت کی آرزو کا اظہار بھی کیا ہے۔

انھیں سب خصوصیات کی بنا پر پژواک کو ایک کلاسیکل مگر متفکر اور قومی شاعر شمار کیا جا سکتا ہے کیوں کہ اُن کی شاعری افغانستان کی مخصوص جذبہ وطن پرستی کا مظہر ہے۔ پژواک کے شاعرانہ کمال اور مہارت کے متعدد نمونے اس کی مثال میں پیش ہو چکے ہیں۔ غالباً یہ بات یہاں لکھنا ضروری ہیں کہ پژواک کا آخری قصیدہ مولانا رومی بلخی کی مشہور غزل کے ردیف اور قافیہ میں ہے اور انھوں نے مولانا کی متعدد تراکیب، تلمیحات اور لغات کو اپنے قصیدہ کا نہ صرف تجزیہ بنایا ہے بلکہ اُن کا ایک مشہور مصرعہ "کز دیو و دد ملولم و انسانم آرزوست" مکمل طور پر استعمال کر لیا ہے۔ مولانا رومی کی غزل

---

[1] محمد شاہ صدیقی، سیر ادب در افغانستان۔ کابل ۔ ۱۳۴۰ھ ش ۱۹۶۱ء ص ۲۹

ترکی زبان بھی سیکھ لی ہے۔

وہ ۱۳۳۳ھ۔ش/۱۹۵۴ء میں مجلہ اقتصاد کے اڈیٹوریل بورڈ کے ممبر تھے۔ ترکی کے افغانستانی سفارت خانے میں شعبہ نشر واشاعت کے اتاشی مقرر ہوئے ۱۳۳۴ش ۱۹۵۵ء میں پوہنی ننداری کے صدر اور پھر شعبہ مطبوعات کے ادبی مشیر کی حیثیت سے فرائض انجام دیے۔ وہ تا حال حیات ہیں اور کابل کے نواح میں زندگی گزار رہے ہیں۔[1]

قبل اس کے کہ قاری زادہ کی شاعری اور اُن کے طرزِ کلام کے بارہ میں کچھ کہا جائے۔ بہتر یہ ہوگا کہ چند فارسی شاعروں اور دانشمندوں کی رائے قاری زادہ کی شاعری اور کلام کے بارہ میں مختصراً پیش کی جائے۔

افغانستان کے مصنف اور شاعر محمد عثمان صدیقی قاری زادہ کی خوبیاں بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"ضیا قاری زادہ شاعریست طبیعی و با استعداد۔ ضیا بیشتر از آلام اجتماعی متاثر است و منظومہ ہای رنگینی نوشتہ کہ او را عزیز ہمگان ساختہ۔ مطالب پیش پا افتادہ را شعری بند و برجستہ میسازد۔ اگر او را با شعرای ایران مقایسہ کنیم پروین اعتصامی می شود"[2]

استاد خلیل اللہ خلیلی (خلیل افغان) قاری زادہ کی کتاب "پیام باختر" کی تقریظ میں اس شاعر کی تصنیف کے بارہ میں یوں لکھتے ہیں:۔

"پیام باختر نمونہ شعر نواست کہ بآئین گویندگان باستان سرودہ شدہ و در آن قدرت سخنوری و تاثیر سخن پدیدار می گردد یعنی مطالب امروز را مقول در آن بزبان نظامی و دیگر گویندگان نامی شنید و مرا پندار بر آن است کہ در این عصر ہر قدر سخن بدین اسلوب نزدیک تر باشد بحال ما نافع تر است"[3]

---

[1] میری درخواست پر میرے دوستوں میں سے ایک دوست سعیدہ عظمت نے جو شاعر سے خاندانی روابط رکھتی ہیں۔ اپنے ایک خط مورخہ ۱۹ رمارچ کے ذریعہ شاعر کے حالات لکھ کر بھیجے ہیں اور تفصیلات میں سے منقول ہیں۔ [2] محمد عثمان صدیقی۔ سیر ادب در افغانستان۔ چاپ کابل ۱۳۴۰ش/۱۹۶۱ء صفحہ ۲۹

[3] ضیاء قاری زادہ پیام باختر۔ زبان طبیعت۔ کابل۔ ۱۳۳۰ش/۱۹۵۱ء صفحہ

ذیل میں اس لیے درج کی جا رہی ہے تاکہ اس کی خوب صورتی اور ترنم کا اندازہ قاری کو تو ہو ہی ساتھ ہی پژواک کی فنکارانہ شاعری اور کلاسیکل طرز کا اندازہ بھی بہ خوبی ہو جائے۔

بنمائی رخ کہ باغ وگلستانم آرزوست
بگشای لب کہ قند فراوانم آرزوست

ای آفتاب رخ بنما از نقاب ابر
کان چہرہ مشعشع تابانم آرزوست

یک دست جان بدہ ویک دست زلف یار
رقص چنین میانہ میدانم آرزوست

زین ہمرہاں سست عناصر دلم گرفت
شیر خدا و رستم دستانم آرزوست

دی شیخ با چراغ ہمی گشت گرد شہر
کز دیو و دد ملولم و انسانم آرزوست

ای مطرب ظریف تو باقی این غزل
زین ساں ہمی شمار کہ ینسانم آرزوست[1]

ضیاء قاری زادہ

احمد ضیاء قاری زادہ ولد قاری دوست محمد ۱۳۰۰ھ ش ۱۹۲۱ء میں شہر کابل میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی اور ثانوی تعلیم لیسہ نجات کابل میں پائی اور وہاں کی تمام تعلیم سے فراغت پا کر ادبیات دری کی تحصیل و تحقیق میں مصروف ہوئے اور رشائق افندی جیسے استاد کی تربیت سے بہرہ یاب ہونے کے ساتھ ساتھ انگریزی اور

---

[1] مجلہ گوہر سال پنجم، شمارہ ہفتم مہر ماہ ۱۳۵۶ ھش/ ۱۹۷۷ء از انتشارات بنیاد نیکوکاری ایران صفحہ ۱۵

ایراقی دانشمند اور مشہور محقق و ادیب سعید نفیسی قاری زادہ کی شاعری کے بارہ میں یوں اظہار خیال کرتے ہیں :۔

"بالاترین غنیمت و فایدتی کہ از تابستان و پاییز امسال ہنگام اقامت در کابل بردم آشنائی نزدیک و مصاحبہ با سرآمدان سخن سرایان فارسی زبان افغانستان بود ...... اینک بجرات می توانم گفت کہ امروز در افغانستان سخن سرایانی ہستند کہ سود بخشی جہان ادب و مایہ افزائی عالم فکر و ذوق مند نہ تنہا سرزمین مادری شان از گفتار آنہا بہرہ می برد بلکہ فارسی زبانان کشور ہای دیگر ہندستان و ایران از توان فضل و ہنر شان کاسہ کاسہ و قدح قدح زلال جان فزا می توانند برداشت : یکی از برگزیدہ گان این توم شاعر مغلق و سخن سرای محقق ضیاء قاری زادہ است کہ در انجام لفظ و شیوایی معنی و نغزی مضمون و قدرت نمائی در بیان مطلب امروز از گویندہ گان توانائی عصر است "۔[1]

"پیام باختر" پر اپنے تبصرہ کے دوران سعید نفیسی نے قاری زادہ کے اس مجموعہ کو علامہ اقبال کے "پیام مشرق" سے تشبیہہ دی ہے ۔

دوسرے اور فضلا اور مصنفین نے بھی قاری زادہ کی شاعری کے بارہ میں بہت سی چیزیں لکھی ہیں لیکن مذکورہ بالا بیانات کو کافی سمجھتے ہوئے اب مزید رائے اور فیصلہ خود پڑھنے والوں پر چھوڑا جاتا ہے ۔

قاری زادہ کے کلام میں سے اُن کی ایک نظم "نی نواز" ایک خاص سوز اور تاثیر کی حامل ہے۔ وہ نظم اس طرح ہے۔ ملاحظہ ہو :۔

الا ای نی نواز آخر نوائی — خروشی نالۂ شوری صدائی
مبادا آتش صحرا شود سرد — مبادا کاروان خوابد بجائی
نوائی رفتہ را باز آر باز آر — سرودی باز از ساز حجاز آر
دل نی را بزور نالہ بشگاف — جہان را باز در سوز و گداز آر

---

[1] ضیاء قاری زادہ ۔ پیام باختر ۔ زبان طبیعت ۔ چاپ کابل ، ۱۳۳۰ ش / ۱۹۵۱ ء

الا ای نی نواز آخر فغان کن — نی دیرینه ات را امتحان کن
کهن هنگامه ها را تازگی بخش — حقایق را دلیل کاروان کن[1]
نوای کن که ما هشیار گردیم — ازین خواب گران بیدار گردیم
مبادا کاروان دور افتد از ما — مبادا دیر تر بیدار گردیم
الا ای نی نواز ای صاحب درد — ز لف کمز ار نای ناله پر ورد
ز نای خشک بر کش نغمه تر — بگرمی تازه کن این آتش سرد
بیا ای ناله ات قوت روان ها — بیان کن ماجرا ها داستانها
بیاد آور خدا را کان درین دشت — جبین مالیده روزی آسمانها
خوشا کوه و خوشا آواز نایی — خوشا دشت و خوشا بانگ درایی
خوشا دل زنده بچادر نشینی — که شب جایی گزار د روز جایی
خوشا دامان کوه و نی نوازی — خوشا از هر دو عالم بی نیازی
خوشا در دامن دشت و بیابان — به مانند غزالان ترک تازی
بگوشم آشنا آید صدایت — صدای آشنا خیزد ز نایت
نهان در نغمه اعجاز چه داری — که جان تازه می آرد نوایت
نوایت نی نواز آتشین به — مدامت پر ازین می ساتگین به
ز نورت خیره چشم این و آن باد — ید بیضا برون از آستین به[2]

شاعر مولانا روم کی مثنوی معنوی کی پیروی میں "نی" کی زبان سے (بشنو از نی چون حکایت می کند سوز جدائی ها شکایت می کند) حقیقی سوز عشق کو اور عارفانہ نصایح بیان کرتا ہے۔ اس منظومہ میں وہ "نی نواز" سے خطاب، سماجی پس ماندگی اور تاریخی افتخار کی بات سے ہے اور اس نظم کے دوسرے حصہ میں قدرت کی گود میں پناہ لیتا ہے اور صحرا نشینوں کی فطری اور پر سکون زندگی اور مزید پہاڑوں کے دامن اور دشت و صحرا کی

---

[1] محمد عثمان صدیقی، سیر ادب در افغانستان، چاپ کابل ۱۳۵۰ ہجری شمسی ۱۹۷۱ء صـ ۲۹
[2] ایضاً صـ ۳۰

قدرتی خوب صورتی کی باتیں کرتا ہے اور آخیر میں بانسری کی صدا سے ید بیضا کے مانند کسی معجزہ کا خواہش مند بھی ہے۔

اسی بنا پر تاجیکی مصنفین۔ ح۔ نعمت اللہ لیف اور رحیم ہاشم نے اپنی تصنیف استادان شعر معاصر افغان و شاعران معاصر افغان، مطبوعہ تاجیکستان شوروی قاری زادہ کو استاد شعرا کی صف اول میں شمار کیا ہے اور اُن کے بارہ میں اس طرح لکھتے ہیں:—

" ضیا، قاری زادہ در نظم اسلوب در دیہ نویں پیش گرفتہ است او منظرہ حیاتی را تصویر می کند، در منظومہ ہائی جداگانہ خود سیما ہائی زندہ بوجود می آورد۔ در شعر یکہ بزنان و دختران شرق بخشیدہ است و دل آنہا را در جمعیت بیان کردہ آنہارا بہ اشتراک کردن در میدان مبارزہ حیات دعوت می کند..."[1]

در کشمکش و نزاع ہستی — آمادہ یکن دفاع ہستی
در دائرہ حیات باید — چون نکتہ ترا ثبات باید[2]
در بحر محیط زندگانی — در زورق ایں جہان فانی
زن لنگر و مرد بادبان است — زن بازوی مرد راتوان است
زن ہادی کاروان ہستی است — زن تکیہ نردبان ہستی است[3]

اس قطعہ میں شاعر عورت کے مرتبہ کو مردوں کے برابر سمجھتا ہے اور بتاتا ہے کہ زندگی کے متلاطم سمندر میں عورت مرد کی ساتھی ہے اور زندگی کے سفر میں ہادی اور رہنما ہے۔ لیکن یہ خیال عام ہے کہ خود شاعر کے ماحول میں لوگوں کی اکثریت عورت کی اس حیثیت کی قائل نہیں ہے باوجودیکہ انہا نے طور پر بہت زیادہ حد تک خصوصاً امور خانہ داری میں عورتوں کی مدد اور ہدایت سے بے نیاز نہیں ہیں۔

---

[1] ح نعمت اللہ لیف و رحیم ہاشم۔ استادان شعر معاصر افغان و شاعران معاصر افغان۔ طبع مرکزی وزارت مدنیت تاجیکستان شوروی صفحہ ۸

[2] محمد حیدر ژوبل۔ نگاہی بادبیات معاصر در افغانستان کابل، ۱۳۳۹ش، ص ۱۸۱ (حاشیہ)

ذیل کی غزل "ہدف یامراد" عنوان کے تحت ضیا قاری زادہ نے شروع میں اپنے دل کو مخاطب قرار دیا ہے لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ آہستہ آہستہ ان کا روئے سخن دوسرے شخص کی طرف ہو جاتا ہے اور اسے حکیمانہ نصایح اور شیریں کلمات کے استعمال سے عمل اور تحریک پر آمادہ شوق کرتا ہے اس غزل میں الفاظ اور لغات کا موزوں استعمال "موج گہر"، "سرپنجہ موج"، "آب در کشت" اور "کمانخانۂ ایام" قاری زادہ کی شاعرانہ صلاحیت اور ادبی دسترس کے گواہ ہیں: —

ہدف یا فراد

صبح شد ای دل غم دیدہ بہ غوغا برخیز
تیشی دام کن از ذوق تمنا . برخیز

از سپیدہ سحر آئینہ گرفتست بکف
تو بہ زیساب تنی کم بہ تماشا برخیز[1]

کاروان میرود و آتش صحرا خاموش
دیگران گر ہمہ خوابند تو تنہا . برخیز

تنگنائی صدف ای موج گہر جائی تو نیست
ابر رحمت شو و از دامن دریا برخیز

کشتی شوق بہ سرپنجہ موج است اسیر
ناخدا دیدہ براہ تو خدا را . برخیز

نعرہ کن نالہ بکش، سیل شو و شعلہ برآی
سر بکف شور بدل دیدہ بدنیا برخیز

این سخن در ورق لالہ نوشتند بخون
کہ منہ فرصت امروز بفردا . برخیز

آب در کشت کس از خشکی ایام نماند
خرمن سوختگان رفت بہ یغما . برخیز

چشم نرگس نگران است براہ تو ہنوز
دیدۂ منتظران کور شد از جا برخیز

تا بداند کہ این گرد سواری دارد
گردبادی شو و از دامن صحرا برخیز

از کمانخانۂ ایام چو تیری بدر آی
تا خوری در ہدف از جملہ مبرا برخیز

ذوق گفتار چہ مقدار بلب خون گردد
عقدۂ باز کن از مشکل دلہا برخیز

مرگ یا وصل ضیا در رہ عشقت ہدف
بر سر کوی بتان یا بنشین یا . برخیز[2]

---

[1] محمد حیدر ژوبل نگاہی بادبیات معاصر در افغانستان کابل ۱۳۳۷ش / ۱۹۵۸ء ص ۱۰۵

[2] " " " ۱۳۳۰ش / ۱۹۵۱ء ص ۱۷

شاعر آخری شعر میں اپنے ارادہ کو "کوئی بتان" کی جانب رہنمائی پر آمادہ کرتا ہے اور عشق کو نشانہ و مقصود قرار دیتا ہے۔ کہ اے کاش کسی بت کا کوچہ ہوتا لیکن جیسا کہ شعر سے ظاہر ہوتا ہے اس کا مدعا اب بھی واضح نہیں ہے اور یقینی ارادہ بھی نہیں کیا ہے اور اپنی بات کو "بیٹھ یا اٹھ جا" پر ختم کر دیا ہے۔

اسی طرح ضیا قاری زادہ نے ایک دوسری نظم میں مشرق کی تاریخی تعبیر کو عالم اسلام کے ہجوم میں پیش کرتے ہوئے اس کے حال پر افسوس ظاہر کیا ہے:-

کہنال

ای شرق معمر و کہنال — ای مبدا، صد ہزار آمال
ای ساز گسستہ تار دو شین — ای پای خلیدہ خار امسال
ای بزم فسردہ را تو ما نا — ای بیل دمندہ را تو پامال
ای مدفن رنگہائی رفتہ — ای زورق سیل دیدہ احوال [1]
ای دست شکستہ بار گردن — ای پای غنودہ تند راہمال
ای خون فسردہ در رگ دہر — ای روز گزشتہ از کف سال
ای مادر صد ہزار تاریخ — ای پیر خمیدہ پشت بیحال
ای سادہ عذار خستہ پیکر — آخر بکجا شد آن خط و خال
گم کردہ تمدن قدیمی — ای مرکز علم و پند و امثال
ای یاد گزشتہ ات درخشاں — ای فکر کنونیت سیہ چال
تا چند بخواب خوش غنودن — آخر کر ترا نمود اغفال
از خانہ کہ شور برخاست — کاسلام چہ راز بون امیال
از غزنہ و بلخ روح محمود — تشدید کند ترا با اجمال
اہرام بگر پہ خندہ دارد — بر تو د بہ غفلت و باہمال

---

[1] ضیا قاری زادہ پیام باختر کابل ۱۳۲۰ ش ۱۹۴۱ء ص۱۵

ای منبع استفاده غیر　　تا چند سرت تہ پر و بال
بگمرای بہ زندگانی تو　　در کش سر تواب خط ابطال[1]

ہم نے دیکھا کہ شاعر نے کس طرح مشرق کی قدیم تہذیب اور غزنیں اور بلخ کی عظمت اور محمود کی شان و شوکت اور اہرام مصر کی فنکاری اور مکہ مکرمہ کی تقدیس کی بات کی ہے۔ مشرق کو ہزاروں نابغوں کی ماں اور علم و ادب کا مرکز گردانا ہے۔ اس کی غفلت کو واضح کیا ہے اور اُس کو بیداری اور نئی زندگی کی دعوت دیتا ہے۔ اس غزل میں بھی خوب صورت اور موثر تراکیب، ضرب الامثال اور محاورے استعمال کیے ہیں۔ " دست شکستہ بارگردن " اور " سر تہ پر و بال بودن " جیسے معروف محاوروں کا برمحل استعمال قاری زادہ کی شاعرانہ مہارت کی دلیل ہیں۔

ضیا قاری زادہ کی سماجی اور اجتماعی مسائل سے متعلق ایک اور نظم " مور و سلیمان " بھی بہت اہم ہے جو افغانستانی اسکولوں کے بچوں کی درسی کتابوں میں شامل کرلی گئی ہے:—

موری تہ پائی شد و نالید و چنین گفت
کای بے خبر، ہچوں تو مرا ہم سر و پائیست
غافل گزری از بر من این چہ غرور است
عاطل شمری پیکر من این چہ خطائیست
ہر روز بہ زنگی شکنی پا و سرم را
ہر لحظہ بما از تو تک و تاز جدائیست
فریاد کہ گوش شنو ابر تو نکرد ند
نا نیک بدانی کہ مرا نیز صدائیست
در صفحۂ ہستی چو تو دارم سر و کاری
در کارگہ زندگیم برگ و نوائیست

---

[1] ضیاء قاری زادہ - پیام باختر - کابل - ۳۳ ش / ۱۹۵۱ء صـ ۱۸

زینت شدہ خلعت ہستی است بہ یک ہیچ
گر قدر رسائیست وگر پشت دوتائیست

ہر نغمہ دریں پردہ بود باب شنیدن
ہر نقطہ از حلقۂ پرکار خطائیست

زین نسج گرانمایہ کہ نساج ازل بافت
در خورد بر و دوش مرا نیز قبائیست

در کوچہ مور است گذرگاہ سلیمان
گر دیدہ بینائی وگر گوش شنوائیست

برگرد مزن پائی کہ چشم تو نگیرد
جائیکہ سر انگشت تو بر خلق عصائیست

غافل مشواز درس مکافات کہ گفتند
بر ہر عملی اجر و بہ ہر کردہ جزائیست [1]

یہ قطعہ اپنی جگہ اتنا واضح ہے کہ اس میں کسی قسم کی تشریح اور تبصرہ کی ضرورت نہیں ہے اور یہ چیز خود شاعر کی شیوا بیانی اور زبان کی روانی کا اعجاز ہے کہ وہ اظہار بیان و مطالب پر کس قدر قدرت رکھتا ہے اور خصوصاً دسویں شعر میں " برگرد مزن پای " کے علاوہ آخری بیت میں خلاصتاً یہ بات بتا دی ہے کہ ہر عمل سزا اور جزا کی صورت ضرور اختیار کرتا ہے:۔

ایک اور نظم میں ہندی مفکر اور سیاسی رہنما مولانا ابوالکلام آزاد کے قول سے تلمیحاً استفادہ کرتے ہوئے قاری زادہ اُن کے نظریہ کو مشرق کے مسلمانوں کے بارہ میں توضیحاً نقل کرتے ہیں:۔

یک روز ابوالکلام آزاد می کرد ز شرقیان چنیں یاد
کیں قوم خدا پرست و حق جوئی کا وردہ ز ہر طرف بحق روی

---

[1] محمد عثمان صدقی، سیر ادب در افغانستان، کابل ۱۳۴۰ش/۱۹۶۱ء صفحہ ۳۰-۳۱
[2] ضیا قاری زادہ پیام باختر۔ کابل ۱۳۳۰ش/۱۹۵۱ء صفحہ ۲۵

در عوض یک نماز خواهند — صد حور قشنگ از خدا وند
گر نیم درم عطا نمایند — صد بار گنه ز خود زدایند
بی خلد و جحیم حق نجویند — بی منفعتی سبق نگویند
بر گشته بهشت و کوثر از آن — کس چشم خرد نمی کند باز

شاعر نے مسلمانوں کے حرص و ہوس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ہے کہ وہ نماز اور عبادت میں بھی اسی پہلو کو مدنظر رکھتے ہیں اور سیکڑوں حوروں کے حصول کی خاطر یہ عبادت انجام دیتے ہیں اور اگر کوئی صدقہ یا خیر کا کام بھی کرتے ہیں تو صدہا بار اپنے گناہوں کے معاف کرنے کی آرزو کرتے ہیں۔ اس نظم میں شاعر طنز و تعریض کا لطیف پیرایہ اختیار کرتے ہوئے "قوم خدا پرست و حق جوئی" جیسے خوب صورت کلمات استعمال کر کے اسے اور زیادہ دلچسپ اور موثر بنا لیا ہے۔[1]

قاری زادہ کے کلام میں یکسانیت ہی نہیں بلکہ تنوع بھی ہے۔ چنانچہ اس کی مثال میں ذیل کا ایک ترجیع بند پیش کرنا نامناسب نہ ہوگا جس میں اپنے معاشرہ کی پس ماندگی پر خدائے تعالیٰ سے شکوہ کرتا نظر آتا ہے اور اس ذات بلند و بالا سے اس مرض کا علاج چاہتا ہے:—

گم شدگان

بار خداوندا ببیں حال ما — وین گذر عمر و مہ و سال ما
ما کہ ہماں بندہ پاک تو ایم — ذرہ ناچیز ز خاک تو ایم
ما کہ ترا نیک پرستش گریم — حاجت خود کی بر دیگر بریم
رو بتو آوردیم کہ داور شوی — رہ بتو جوئیم کہ رہبر شوی
گم شدگانیم دریں تیرہ خاک — راہ پر از دہشت و ما بیمناک

---

[1] ضیا قاری زادہ۔ پیام باختر۔ کابل۔ ۱۳۳۰ش/۱۹۵۱ء ص۱۲

پای پر از آبلهٔ ما ببین　　از دگران فاصلهٔ ما ببین
راه پر از صولت و کوریم ما　　در گرو خواب سموریم ما

قافله شد واپسی ما ببین
ای کس ما بیکسی ما ببین

محمل شوقست به تندی روان　　تند زما می گزرد کاروان
گم شدگانیم و ز پا مانده ایم　　چون بخرامیم که وا مانده ایم
کاش درین بهت پر دار و گیر　　لطف عظیم تو شود دستگیر
ورنه چنینیم و چنانیم ما　　بی تو دو گمگشته نشانیم ما
محمل اغیار به تندی رود　　توسن ما از چه به کندی رود
آه درین مرحله تنهاستیم　　همچو خس بر سر دریاستیم
راه خطر دارد و ما بیمناک　　بیم کند بیهده ما را هلاک

قافله شد واپسی ما ببین
ای کس ما بیکسی ما ببین

واپسی ره لرزی و سوز و ساز　　منزل ما دور ره ما دراز
سنگ بود این همه کوه کنام　　خار ره ماست بهان خشت خام
ره نتوان بردورین ریگ و سنگ　　با سر شوریده و با پای لنگ
همچو غریقی که در آفتد به آب　　هر طرف آریم همی پیچ و تاب
دست به هر خار و خسی وا زنیم　　در شب یلدا بره صحرا زنیم
بی جهت هر سو تگ و پو آوریم　　باز بدرگاه تو رو آوریم

قافله شد واپسی ما ببین
ای کس ما بیکسی ما ببین

کارشناسان به هوای روند　　تند چو نو باد صبای روند
بحر و بری زیر پر آورده اند　　نخل صفت بار و بر آورده اند

---

۱. ضیا قاری زاده - پیام باختر کابل ۱۳۳۰ ش / ۱۹۵۱ م ص ۲۲

نور تمدن که علم برفراخت — دیده ما را ز پی روشن نساخت
آتش صحرا ز پی خاموش گشت — نقش قدم از پی فراموش گشت
از پی جلو رفت ز ما کاروان — ما ز پی ماندیم بخواب گران
زین شب دیجور چه آید پدید — روز چرا باز نگردد سپید
از بن این تیره شب قیرگون — روز فرو رفته برون کن برون

قافله شد واپسی ما ببین
ای کس ما بیکسی ما ببین[1]

تا که درین مرحله سر بر زدیم — جز در تو کی در دیگر زدیم
یک قلم از خلق بریدیم ما — گوشه این بوم گزیدیم ما
با همگان از در نخوت زدیم — چنه و جانانه بنهایت زدیم
داغ تعصب ز بس اندوختیم — شمع صفت ز آتش خود سوختیم
با همه پیمایش ماهی و ماه — فرق نکردیم سپید از سیاه
کیست ز ما بدتر و درمانده تر — از همگان دورتر و وامانده تر
کیست چنین خفته بجز پائی ما — چیست چنین تافته جز رائی ما

قافله شد واپسی ما ببین
ای کس ما بیکسی ما ببین

زنده بجسمیم و بجان مرده ایم — این قدر از سود زیان برده ایم
روز و شب از خوردن و خوابیم خوش — هفته و مه در تب و تابیم خوش
این تب و این تاب که در جان ماست — تابش پرنوری دینی ماست
فرع گزیدیم و ز اصلیم دور — زین سبب از عالم وصلیم دور
اصل مرا باز بگردان به ما — ای که نیرزد تن بی جان بما
پای فرو رفته ما را کشای — راست روی را بمن و ما نمای
تا که نمائیم ز اغیار باز — یک نگه لطف بما کن فراز

---

[1] ضیا قاری زاده. پیام باختر. کابل. ۱۳۳۰ ش/۱۹۵۱ م ص ۲۴-۲۵

قافله شد واپسی ما ببین
ای کس کس ما ما ببین

وهم و خرافات بود کار ما   هیئت نسناس زند خار ما
جنس هوس را بگرد مانده ایم   زین سبب از کهنه و نو مانده ایم
نیست یکی نقطه بروی زمین   کان همه تاریک بود اینچنین
راهروانیکه درین معبرند   خشک تر از خاک که باد آورند
زین همه یاران کهن توز ما   نیست کسی محرم دلسوز ما
بدنیتی بین که جلو رفتگان   شاد نگردند ز تعقیب ماں
دره ما خار نشانی کنند   برسر ما سنگ پرانی کنند

قافله شد واپسی ما ببین
ای کس ما بیکسی ما ببین[1]

ره نسپردیم و ز پا مانده ایم   شهر برون کرده نده رانده ایم
گم شده تاثیر ز فریاد ما   گریه کند آبله بر یاد ما
سخت پریشان و زبون مانده ایم   پی سپر دشت جنون مانده ایم
ریگ درین مرحله خار است و بس   آب درین دشت شرار است و بس
زیر زمین ما دیده خود بین ماست   خار مغیلان گل بالین ماست
سر گم و گم گشته و گم کرده ایم   توشه ره بیکسی آورده ایم

قافله شد واپسی ما ببین
ای کس ما بیکسی ما ببین

این همه آزار که دارد که ما   حال چنین زار که دارد که ما
این خلش خار که در پای ماست   بهره و تابکی و از کجاست
دانه ما ریشه نیارد برون   ریشه ازین بیشه نیارد برون
حاصل ما زین همه اوهام چیست   عار چه شد ننگ چه شد نام چیست

---

[1] ضیا قاری زاده - پیام باختر - کابل - ۱۳۳۰ ش/۱۹۵۱ء ص ۲۷-۲۸

عمر بسی رفت د بخوابیم ما ۔ در بدرد تھانہ خرابیم ما
محمل اغیار رواں شد رواں ۔ زمزمۂ شوق فغاں شد فغاں
ایں من و ما را ہمہ دل ماندہ است ۔ ناقہ ما پائی بہ گل ماندہ است

قافلہ شد وایسی ما ببیں
ای کس ما بیکسی ما ببین [1]

جیسا کہ دیکھا جا رہا ہے کہ نظم کی طوالت اس کے مفہوم اور مطلب سے گھٹ گئی ہے۔ باوجود اس کے کہ آہنگ، وزن اور ابیات کی روانی کا خیال رکھا گیا ہے۔ الفاظ اور معانی کی تکرار بھی اس ترجیع بند میں غزلوں کے ساتھ مخصوص ہیں، ہر دو مصرعوں کے بیچ کے ابیات ترجیع بند کی تکرار ہم قافیہ ہونی چاہیئے تھی۔ زیادہ تر دیکھا جاتا ہے کہ یہ وضاحت کی حد تک "محمل شوق است بہ تندی رواں" کی طرح قابل مشاہدہ ہے۔ یا محمل اغیار بہ تندی رود ...... اور محمل اغیار رواں شد رواں کی طرح اسی طرح: گم شدگانیم وزپا ماندہ ایم ..... وغیرہ سرگم وگم گشتہ وگم کردہ ایم۔ وغیرہ وغیرہ تکرار کی کثرت کا شکار ہیں۔ بہر حال شاعر جب دوسروں کی تیزی سے ہوتی ہوئی ترقی پر اپنے معاشرہ کی پس ماندگی کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ تو خدا کے سامنے گریہ وزاری کے ساتھ اس کے علاج اور پیشرفت کی دعا مانگتا ہے اور ساتھ ہی پس ماندگی کے ان اسباب میں کاہلی، سستی، بیماری تعصب اور جہالت وغیرکو شمار کرتا ہے اور ایک ایک کا ذکر کر کے ہدف ملامت بناتا ہے۔

قاری زادہ نے پیشرفت اور ترقی یافتہ ملکوں کی بدبینی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بتایا ہے کہ یہ ممالک نہ صرف یہ کہ ہماری پس ماندگی پر ہی خوش نہیں بلکہ ہماری ترقی کی راہوں میں طرح طرح کی رکاوٹیں کھڑی کرتے ہوئے طرح طرح کے مظالم ڈھاتے ہیں۔ علاوہ ازیں خود اپنا اور اپنے معاشرہ کی خود خواہی اور خود بینی کا بھی اعتراف کرتے ہوئے اس پس ماندگی کو جو ہمارے اندر موجود ہے۔ افشا کرتا ہے اور کہتا ہے کہ "رہزن ما دیدہ خود بین ماست" ضیا کی بلند طبعی اور افغان

---

[1] ضیا قاری زادہ۔ پیام باختر کابل۔ ۱۳۳۰ھ ش/ ۱۹۵۱ء ص ۲۸۔۳۰

غیرت اس حد تک ہے کہ وہ غلامی پر ہر قسم کے مصائب اور مشکلات کو قبول کرنے پر تیار ہیں۔ لیکن دوسروں کا آلۂ کار بننے کے لیے ایک لمحہ کو بھی آمادہ نہیں ہیں۔ اس کے لیے ذیل کی ایک اور نظم ملاحظہ ہو:۔

دست دیگراں

زار و ناچیز و ناتواں بودن	خوار در چشم این و آں بودن
از عقب ماندگان قافلہ ہا	وز حقیراں کارواں بودن
سالہا در حضیض محنت و رنج	مورد خشم آسماں بودن
توی کردن برنج مخموری	بی نصیب از می و مغاں بودن
زخم صد رشتہ را پذیر فتن	تیر صد طعنہ زناں بودن
گل بی بوی بوستان خودی	نخل بی باد بوستاں بودن
یا گروگاں گوشہ نسیان	یا کہ بی نام و بی نشان بودن
عمرہا در کمال نادانی	دشمن جاں خود بجان بودن
قبر خود را بدست خود کندن	سود ناکردہ در زیان بودن
بارہا دست شستن از ہستی	ایں قدر نیز سخت جاں بودن
تشنہ و گرسنہ بسر بردن	گر چنیں و گہی چناں بودن
بہتر از آن بود ضیا کہ دمی	آلت دست دیگراں بودن[1]

شاعر، تواری۔ پس ماندگی، حقارت، رنج و محنت، بے نامی، پیاس اور بھوک غرض تمام مصائب کو سہل جانتا ہے اور کہتا ہے کہ یہ تمام مصیبتیں اس سے بہتر ہے۔ کہ ایک لمحہ کے لیے بھی انسان دوسروں کا آلہ کار یا دست نگر ہو دے۔ ایک اور افغانی شاعر ابراہیم خلیل نے بھی اسی مفہوم کی ایک نظم منظوم کی ہے اور اُن کا ایک شعر:۔

---

[1] ضیا قاری زادہ۔ زبان طبیعت۔ کابل۔ ۱۳۳۰ ش/ ۱۹۵۱ء صہ ۷۸

"دلاگر بہ طبع تو غیرت بود۔ نباید اطاعت بہ غیرت بود" اس کی نشاندہی کرتا ہے۔
اسی وزن اور قافیہ میں ضیا نے ایک نصیحت آموز غزل کہی ہے اور اس غزل میں تمام دشواریوں کو کسی نادان کی صحبت سے آساں تر اور بہتر جانتا ہے:۔

بانادان نشستن

به محفل دور از یاران نشستن — چو گل افسرده و پژمان نشستن
چو عود در آتش، غم تاب خوردن — ز آب دیده در طوفان نشستن
سپند آسا بسوز و ساز بسیار — بروی مجمر سوزان نشستن
شدن عمری اسیر محنت و رنج — بپا زولانه در زندان نشستن
سر بی نشه و چشم پر از خواب — میان حلقه مستان نشستن
چو آهن در کف آهنگر دهر — بروی کوره و سندان نشستن
بروی برف تخ دی شب تا سحرگاه — زمستان با تن عریان نشستن
ز لذت هائی دوران چشم بستن — به عزلت پای در داماں نشستن

خلاصه عمرها با رنج و آلام
به از یک لحظه با نادان نشستن [1]

شاعر نادان کی صحبت سے نفرت اور غصہ کا اظہار اس قدر کرتا ہے کہ "دور از یاران نشستن"، آتش غم، طوفان اشک، جلتی ہوئی انگیٹھی، زنداں کی کوٹھری، بھٹی اور سندان پر بیٹھنا اور ننگے بدن برف پر لیٹنا، آسان اور اچھا ہے بہ نسبت اس کے کہ نادان کی صحبت اختیار کی جائے۔ ضیا قاری زادہ کی اس غزل کی سادگی روانی اور ساتھ ہی تاثر میں کسی تردید اور کلام کی گنجائش نہیں ہے۔

ضیا ذیل کی ایک اور سماجی پہلو پر لکھی ہوئی غزل میں عید کی تصویر کشی کرتے ہیں اور امرا اور دولتمندوں کے یہاں اسے دھوم دھام سے منائے جانے کا ذکر کرتے ہیں

---

[1] ضیا قاری زادہ۔ زبان طبیعت۔ کابل ۱۳۳۰ ش/۱۹۵۱ء ص ۷۹-۸۰

اور دوسری طرف بھوک، برہنگی کا موضوع ایک لڑکے کو بنایا ہے جو انھیں افراد کے ہمسایہ میں رہ کر معاشرہ کی بے انصافی اور زیادتی کا احساس کر کے مغموم ہے۔ یہ احساس شاعر کی روح کو بھی زخمی کر گیا ہے اور وہ یہ کہنے پر مجبور ہے:۔

ہمت عالی

طفلی بہ پدر گفت کہ عید رمضاں است — روز طرب و عشرت و عیش ہمگانست
دلہا ہمہ جوشیدہ و لبہا ہمہ خنداں — تنہا ہمہ پوشیدہ و جانہا بہ امانست
پوئیندہ بہر برزن و گردندہ بہر کوی — گر پیر و جوانست اگر خورد و کلانست
ایں بر سر آں دست گزیں از رہ الفت — ویں بر لب آں بوسہ گذار از دل و جانست
جز جامۂ خلقاں کہ مرا در بر و دوش است — کو آنکہ دریں عید مرا جامہ چنانست
در خانۂ ہمسایہ بیا طفل ما — خوراکہ و پوشاکہ گراں تا بگرانست
رخت من و تو کہنہ تر از عمر زمانہ — قوت من و تو شور تر از اشک روانست
ایں جا خبر از نیش و در آں جا خبر از نوش — داد و دہش چرخ چنیں است و چنانست
ہمسایہ پسر را کہ بود مال فراواں — لطفش بمن ای باب تدانی کہ چسانست
خواہم کہ یکی جامہ از و عاریہ گیرم — کو ہمدم و ہمراز من از دیر زمانست
بیچارہ پدر گفت کہ ای جان گرامی — امداد ز بیگانہ جوئی کہ زیانست[1]
از بہر دو ناں منت دوناں نتواں برد — ایں پند ز من گیر کہ سود دو جہانست
تگرای بہ ذلت کہ ترا جلوہ دہد پست — بگرای بہ ہمت کہ ترا ایں بہ از آنست
آری۔ بر دوش تو ایں جامہ خلقاں — خوشتر ز پذیرائی احسان کسانست

بے ہودہ مپندار کہ گفتند بزرگان
یا کہنہ خود ساز تو خلق گرانست

اوپر کی یہ غزل جو ایسے عام موضوع پر ہے، جس پر دنیا کے بیشتر ادب میں

---

[1] ضیا قاری زادہ۔ زبان طبیعت۔ کابل ۱۳۳۰ ھ ق / ۱۹۵۱ ء صـ ۵۵ – ۵۶

اور خصوصاً فارسی اور اُردو میں اس قسم کا کلام بکثرت موجود ہے۔ مگر اس غزل میں جو انداز ہے۔ وہ انتہائی سادہ، موثر اور ساتھ ہی حکیمانہ بھی ہے اور شاعرانہ صنعتوں سے پُر بھی ہے مثلاً بارہویں شعر میں "دونان[1]" کا کلمہ صنعت تجنیس کا بہترین استعمال ہے۔

افغانستان کی دری شاعری میں اوروں کے علاوہ اُستاد خلیلی نے اسی موضوع[2] پر ایک قطعہ (عیدی به دختر گدا) نظم کیا ہے جو اپنی خوب صورتی اور تاثر کی زندہ مثال ہے اور اس طرح شروع ہوتا ہے:۔

گفت ای خواہر صبا گیرند عید   دختران اغنیا در کوی ما
می کشند آں جامہ ہای رنگ رنگ   ہمچو شاخ گل سحر بر روی ما

ایرانی شاعرہ خانم پروین اعتصامی کے یہاں بھی اس موضوع پر فارسی میں بہترین اور موثر نظمیں ملتی ہیں۔

غرض ضیا رقاری زادہ کے اتنے متنوع نمونوں کے پیش کرنے کا مقصد صرف یہ تھا کہ افغانستان کے معاصر شاعر کے فکر اور طرز کلام کا نہ صرف تعارف ہو جائے بلکہ اُس کی شاعری کے مرتبہ کا تعین بھی کیا جا سکے۔

قاری ملک الشعرا

چنانکہ شیفتہ طرز بے دلی قاری
کلیم اگر نشوی در سخن کمال تو چیست ..... قاری

حافظ عبداللہ قاری، علوم عربی وادب کے بزرگ اُستادوں میں شمار ہوتے ہیں۔ وہ آزادی سے قبل کے شعرا میں ہیں لیکن اُن کی شہرت آزادی کے بعد اپنے کمال کو پہنچی۔ دنیائے شعر وادب اور ادبی تحقیقات اور نثر و نظم کے میدان میں وہ ملک کے بزرگ

---

[1] دونان (دو روٹی)، (کمینے اور ذلیل لوگ)
[2] خلیلی کے بارہ میں تبصرہ کے وقت اس نظم کا حوالہ دیا گیا ہے۔

اور ناموروں کی صف میں ہیں اور اسی طرح دری اور عربی زبان میں مکمل عبور حاصل تھا، وہ سالوں تک ادب کے معلم تھے اور بڑے خوشخط بھی۔ انھوں نے ادبیات کے اٹھارہ رسالے تصنیف کیے۔ اُن کے اہم ترین آثار میں فن معانی شرح احوال شاعران بزرگ، قواعد زبان دری وغیرہ ہیں۔ اُن کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے ادبی تحقیق کو افغانستان میں جدید اصولوں سے آشنا کرایا اور اسی بنا پر وہ ملک کے بزرگ محققین میں شمار ہوتے ہیں۔

جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا قاری ایک شاعر بھی ہیں اور محقق و عالم بھی۔ علم کی قدر و قیمت کو اُن سے زیادہ اور کون سمجھ سکتا ہے۔ دنیا کی ہر اچھائی اسی سے وابستہ ہے اور نظم و نسق ہو یا فضل و فلاح و عافیت ہو یا مسئلہ روزگار، فلسفہ ہو فکر شاعری ہو غم روزگار، سب اسی کے رہین منت ہیں اور بازار انسانی کی رونق اسی کی وجہ سے ہے۔ قاری کا سادہ انداز بیان نظم کے حسن میں چار چاند لگاتا ہے:-

علم

چشمہ زآیندۂ علم و ہنر — زندگی بخشیدہ بر نوع بشر
نظم و نسق عالم از علم آمدہ است — فضل نوع آدم از علم آمدہ است
رونق بازار عالم شد کمال — زیور اولاد آدم شد کمال
مایہ دانش حیات دل بود — زندگی بی نور او مشکل بود
علم می آرد فلاح و عافیت — علم برہاند ز سوء خاتمت
شان علم از ہر چہ گویم برتراست — وصف او از فکر ما افزون تراست
علم آمد کاورد مردان کار — بہر بہبودی و صنع روزگار
علم ہر دم تحفۂ می آورد — نابغی ہر گوشۂ می پرورد
گہ نماید فیلسوفی را عیان — تا شود از فکر او روشن جہان
گاہ آرد عالمی از نو پدید — با علوم نافع و فکر سدید
گاہ آرد شاعری رادوی کار — تا شود محرم ز طبعش روزگار

گاہ ساز دلپو شکیں رامعتبر　　در میان شاعران نامور[1]

اپنے آخری بیت میں قاری نے روس کے نامور شاعر پشکن سے اپنی عقیدت کا اظہار کیا ہے اور گویا اپنی وسعت نظر، علم وفضل کی قدر اور ادب نوازی کا ثبوت فراہم کیا ہے۔

غزل گوئی کسی شاعر اور شاعری دونوں کا معیار ہے۔ اس کا حسن اور دلکشی شاعر کی فنی مہارت کی بدولت ہوتا ہے اور کم مشرقی شعرا غزل سرائی سے بچ سکے ہیں۔ روایتی طور پر بھی شاعر اس سے جتنا شوق رکھتا تھا شاید اور کسی صنف شعر سے نہیں۔ بہرحال قاری ملک الشعرا کی غزل کے نمونے بھی دیکھے جائیں تاکہ اُن کے ذوق سخن کو صحیح داد دی جا سکے، اُن کے انداز بیان اور طرز سخن کو نقد و نظر کی میزان پر تولا جا سکے اور مکمل شاعر کی حیثیت سے تسلیم کیا جا سکے۔ اس لیے ایک مختصر مگر پوری صفات سے آراستہ غزل ملاحظہ ہو: ۔

پنجہ شور جنون پارہ گریبانم کرد	باز سودای کسی بے سر و سامانم کرد
دیدہ راشام غمت رخصت اشکی دادم	آں قدر ریخت کہ تن غرقہ طوفانم کرد
سخن روی تو با او بمیان آوردم	رفت چنداں ز تو در آئینہ کہ حیرانم کرد
ماجرای غم پنہان تو گفتم بسرشک	گشت غماز و ازیں گفتہ پشیمانم کرد
نیست در سر ہوس جلوۂ رنگیں بہار	شعلہ خویش و گل داغ گلستانم کرد

بے وفائی گل یاد من آمد قاری
مضطرب نالۂ بلبل بہ گلستانم کرد[2]

اس غزل کے ہر مصرعہ سے شاعر کی پختگی کلام ظاہر ہوتی ہے۔ باوجودیکہ بہت سادہ اور وسیع معلوم ہوتی ہے لیکن بغور مطالعہ سے شاعر کی دقت اندیشی کا پتہ لگ جاتا ہے۔ چوتھے شعر میں آنسوؤں کی غمازی قابل توجہ ہے۔ کیوں کہ غمازی دراصل بیان اور کلام میں نظر آتی ہے لیکن یہاں چونکہ یہاں شاعر کا غم پنہاں

---

[1] ادب۔ شمارہ اول۔ سال ۱۳۵۲/۱۹۷۴ء کابل ص ۱۴۱

[2] م۔ ح۔ ژوبل۔ نگاہی بادبیات معاصر در افغانستان، کابل۔ ۱۳۳۷/۱۹۵۸ ص ۵۸-۵۹

اشک ریزی کی بنا پر ہے اس لیے وہی غماز قرار دیا گیا ہے۔ دوسرے بیت میں مبالغہ اپنے عروج پر ہے مگر غزل میں دوست کا عشق، عاشق کا سودائی ہونا آنسوؤں کے سیلاب میں غرق ہو جانا، آئینہ کا حیران ہونا اور آنسوؤں کا چغلی کھانا، اپنے زخموں کا گلستاں اور محبوب کی بے وفائی کا یاد آنا اور وہ بھی بلبل کے نالہ سے مضطرب ہونا، یہ سب کچھ سبک ہندی کی یاد دلاتا ہے اور غزل کا خاص انداز ظاہر کرتا ہے۔

ایک اور اسی قسم کی غزل میں معشوق کی خوب صورتی کی تعریف کے ضمن میں اُس کی جدائی۔ محرومی اور دل کی آشفتگی کا ذکر اس طرح کیا ہے:۔

چومن زداغ تو گر دیده داغدار آتش ‌‌ ‌ ‌ چرا ازدل نکشد این قدر شرار آتش

دیار دیده، دل منزل تو بود افسوس ‌ ‌ ‌ که آں دیار گرفت آب و این دیار آتش

بروز بخت سیه بی رخی تو سخت دلم ‌ ‌ ‌ چو شمع نیست فروزنده شام تار آتش

براسپ نی شده آن طفل شعله خوی سوار ‌ ‌ ‌ حذر کنید که گردید نیسوار آتش

چومی پزد طمع وصل خام را قاری

بود ز شعله خوی تو اش بکار آتش[1]

اس غزل میں قاری نے تشبیہات کا استعمال کر کے گزشتہ استادوں کے کلام کی یاد دلا دی ہے اور بتایا ہے کہ آگ اس لیے چنگاریاں بکھیرتی ہے کہ عاشق معشوق کے حسن کی تابانی سے داغدار ہے۔ چوتھے شعر میں خاص نازک خیالی سے استفادہ کرتا ہوا لوگوں کو معشوق کی شعلہ خوئی سے پرہیز کرنے کو کہتا ہے، اور بتاتا ہے کہ (طفل شعلہ خوی) یعنی معشوق نی کے گھوڑے پر سوار ہے اور یہ فطری بات ہے کہ نیزار میں آگ سرعت سے لگ جاتی ہے اور جل جاتا ہے اور معشوق کی اس مکمل سوزندگی کے باوجود قاری "طمع وصل خام" کی خواہش میں شعلہ خو معشوق کے وصال کا خیال سر میں سمائے ہوئے ہے۔

اب ایک اور قطعہ "بشر" قاری کے زور قلم کا شاہکار بن کر ذیل میں

---

[1] خستہ معاصرین سخنور۔ کابل ۱۳۳۹/ ۱۹۶۰ء ص ۲۹۲

جلوہ گر ہے۔ ملاحظہ ہو:۔

بشر بدیعۂ بے مثل عالم صنع است — کہ کائنات ندارد نظیر او اصلاً
کلید راز دو عالم بدست او باشد — کہ دادہ اند باو قابلیتی بسزا
بدرگاہ کمالش فرشتہ زانو زد — کہ تا ازو شنود سر علم الاسماء
ز ذرہ تا بفلک گر بغور وانگری — بذرہ بیں نتوانی نظیر او پیدا
رئیس معتبر کارخانۂ صنع است — فرشتہ راز رسد ہم برتبہ اش دعوا
چو روح از نتواں یافت نسخۂ جامع — چو جسم او نتواں دید لوحۂ اعلا
خمیر پیکر او گرچہ خاک تیرہ بود — ہمیشہ رابطہ دارد بہ عالم بالا
بشر بود کہ برآورد بولہب از بیں — بشر بود کہ برانگیخت خواجہ دوسرا
بشر بود کہ کند دعوا خدائی بیش — بکام خویش ببیند چو اند کی دنیا
بشر بود کہ کشد نعرہ ہائی آمنت — ہلاک خویش چو بیند بورطہ گاہ بلا
بشر بود کہ جہاں زندہ می شود بہ دمش — اگر شود نفس چوں مسیح جان بخشا
بشر بود کہ شود کاشف رموز یقین — بشر بود کہ شناسد حقایق اشیا
بشر بود کہ جہان را حیات می بخشد — چو رہنمائی شود خلق را براہ خدا
بشر بود کہ بود بیگماں خلیفۂ حق — اگر نہد سر فرمان بحضرت مولیٰ
بشر بود کہ از و دیو می کند لاحول — چو منحرف شود از جادۂ رضائی خدا
بشر بود کہ حقیقت بہ زندگی مردہ است — چو ماند تخیل و بحس ز جہل جاں فرما
بشر بود کہ جہاں حلقہ می شود بسرش — ز تنگنائی طبیعت اگر نگشت رہا

بشر بود کہ نماید جہاں گلستانش
اگر دھند باو چشم و دیدہ بینا[1]

قاری نے اس نظم میں انسان کی ایک مکمل اور خوب صورت تصویر کھینچی ہے اور کہتے ہیں کہ اگر وہ عقل اور خدا کی خواہش کے مطابق عمل کرے تو یقیناً اس کی نظیر نہیں اور وہ یقیناً تمام مخلوقات سے برتر ہے۔ قاری نے اس نظم میں

---

[1] خستہ معاصرین سخنور۔ کابل ۱۳۳۹ھ/۱۹۶۰ء ص ۲۶۵-۲۶۶

خوب خوب تلمیحات اور استعارات کا استعمال کیا ہے جیسے فرشتوں کا آدم کو سجدہ کرنا اور انسانوں میں ہی ابولہب جیسے ملحد اور حضور صلعم جیسے پیغمبر اور فرعون و قارون جیسے خدائی کا دعوا کرنے والے پیغمبر ہوئے۔ اسی طرح ہلاک ہونے کے خوف سے ڈوبتے وقت فرعون کا ایمان لانا وغیرہ ہے۔ اس طرح اگر انسان حکم الٰہی کے سامنے سرِ تسلیم خم کردے تو آدم کی مانند اُس کا خلیفہ ہو جاتا ہے۔ اور اگر راہ حق سے منحرف ہو جائے تو شیطان اور دیو بھی اُس سے بھاگتے ہیں اور انسان کے نام وہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ اگر وہ عمل نہ کرے بے حرکت رہے تو درحقیقت مُردہ سے بدتر ہے۔

قاری اپنے اشعار اور خصوصاً غزلیات میں خاص نازک خیالی سے کام لیتا ہے۔ جو گذشتہ اساتذہ شعرا کی چیز تھی اور شاعری کے میدان میں جیسا کہ خود کہا ہے، بیدل کے طرز کی پیروی کرتے ہیں اور کلیم کاشانی سے بھی ارادت رکھتے ہیں:۔

چنانکہ شیفتہ طرز بیدلی قاری
کلیم اگر نشوی در سخن کمال تو چیست؟

قبل اس کے کہ قاری کی شاعری کے بارہ میں بحث کا اختتام ہو اُن کا ایک قطعہ قابل ذکر ہے جو انھوں نے اقبال سے متعلق منظوم کیا ہے:۔

اقبال کیست

ادیب سخن گستر نکتہ سنج — کہ ہر نکتہ اش بہتر آمد ز گنج
چمن گردۂ طرز رنگیں اوست — شکر پارۂ حرف شیریں اوست
کلامش چو اوج بلندی گرفت — سخن رتبہ ارجمندی گرفت
زند طعنہ آہنگ او برق را — کہ خواہاں بود نہضت شرق را
نوین شیوۂ را بہ سبک کہن — در آمیخت از قدرت علم وفن

لہ عبداللہ بختانی پشتانہ د اقبال پہ نظر کبنی د بختوں ہار نہ نظر اقبال، کابل۔ ۱۳۵۰ھ ش/ ۱۹۵۶ء صفحہ ۶۰

چو اندر سخن جادۂ نو گزید | پیامی ز مشرق بہ مغرب رسید
سخن را در آمیخت چوں با علوم | از و زندہ شد طرزِ ملای روم
چو فکرش پی فیلسوفی گرفت | طراز سخن طرز صوفی گرفت
نوایش ہم آہنگ با نفخ صور | کہ افسردگان را در آرد بشور

چو بلبل بہ آہنگ کہسار ما
ز ہند آمد ایں طوطی خوشنوا

ان ابیات میں قاری نے اقبال کی شخصیت اور کلام کی خوبیاں اس طرح بیان کی ہے کہ ہر ہر لفظ سے شاعر مشرق اور اُن کی شاعری کی عقیدت اور ارادت ظاہر ہوتی ہے۔ اسی طرح ایسے کلمات استعمال کیے ہیں کہ بے شبہ اپنی ہمدلی اور ہمخیالی کو اقبال سے مربوط کیا ہے۔ وہ اقبال کو "ادیب نکتہ سنج" "نکتہ الشس را" بہتر ز گنج سمجھتا ہے اور بتاتا ہے کہ سخنوری نے اقبال کے کلام سے ارجمندی پائی ہے۔ انھیں "نہضت شرق" کا خواہش مند اور اُن کی شاعری کے طرز کو "نوین" قرار دیا ہے۔

انھیں قاری نے ہم طراز مولانا روم اور فلسفیانہ افکار کا حامل جانا ہے۔ اور اُن کے آہنگ کو ملکوتی قرار دیا ہے، طوطی خوشنوا سے مثال دی ہے جو بلبل کی مانند افغانستان کے کہساروں کی چہک کے ساتھ اس دیار کی طرف روانہ ہوا ہے۔

قاری نے قصاید بھی خوب کہے ہیں جو عموماً خراسانی سبک میں ہے۔ علاوہ ازیں قاری ایک اچھے نثار بھی ہیں جو اپنی روانی اور زیبائی کے لیے اپنی مثال آپ ہیں۔ لیکن یہاں شاعری سے متعلق گفتگو کرتے وقت نثر کا ذکر غیر ضروری ہے۔ ہاں اُن کی تالیفات کے بارہ میں بیشتر کا ذکر مناسب ہوگا:-

۱- کلیات: مشتمل بر غزلیات۔ قصاید، قطعات، رباعیات اور مثنویات وغیرہ۔
۲- صرف و نحو فارسی۔
۳- تذکرۃ الشعرا
۴- معانی۔

۵ - رواۃ وفقہائی افغانستان
۶ - سیرت نبوی
۷ - مغازی امام واقدی (ترجمہ)
۸ - منطق امام غزالی (ترجمہ)
۹ - فصوص الحکم شیخ (ترجمہ)
۱۰ - محاکمہ
۱۱ - تاریخ جغرافیہ عربستان [۱]

۱۳۱۴ھ ش/۱۹۳۵ء میں اپنی شاعرانہ مہارت اور شہرت کی بنا پر افغانستان کے ملک الشعرا نامزد ہوئے اور اُس وقت سے قاری ملک الشعرا کہلائے جانے لگے [۲]

مستغنی

عبدالغنی مستغنی ۱۲۵۲ھ ش/۱۸۷۳ء میں کابل کے نواح میں متولد ہوئے اور ۱۴ حوت ۱۳۱۲ھ ش/۱۹۳۳ء میں فوت ہو گئے۔ وہ افغانستان کی ایک معروف ادبی شخصیت اور قابل ذکر یادگار فرد اور لایق تحسین انسان ہیں۔ وہ سراج الاخبار گروہ کے پرجوش اور ترقی پسند لوگوں میں محمود طرزی اور اُن جیسے ہم خیال مصنفین کے طرز فکر سے کے نمایندہ تھے اور اپنے زمانہ اور ماحول کے تقاضوں سے ایک دوراندیش مصنف اور شاعر کی مانند آگاہ تھے اور اپنی قومی ذمہ داری کو اچھی طرح جانتے تھے۔ اُن کے اشعار۔ بلیغ، مستحکم، ہنرمندانہ، موثر اور ادبی لطایف وظرایف سے بھرپور اور وقت کی آواز سے ہم آہنگ ہیں۔ وہ اپنے اسلوب بیان وطرز کلام میں دری شاعری کے معروف ومشہور شعرا، فرخی سیستانی اور مولانا عبدالرحمٰن جامی ہروی اور دیگر ناموروں سے متاثر ہو کر اُن کے کلام سے فیضیاب ہو کر اپنے قصاید کو انھیں کے

---

[۱] خستہ معاصرین سخنور۔ کابل ۱۳۳۹ھ ش/۱۹۶۰ء صہ ۲۶۲

[۲] " " " " "

طرز پر نظم کرنے میں کامیاب رہے ہیں۔

لیکن مستغنی شاعری میں فرخی اور جامی کے اغراض و مقاصد سے بہت تفاوت رکھتے ہیں۔ بقول کسی [1]

"مستغنی بخشی اعظم قصاید شیوا و غزل ہائی دلپذیر خود را بخاطر تنویر اذہان مردم آشنا ساختن ملت بہ مزایای حیات مدنی و مترقی وملی، معارف دوستی، و دانش پژوہی، احتراز از جہل و بیکاری و تن پروری و اہتمام برای کسب علوم و فنون۔ مجادلہ با خرافات و تنگ نظری، مبارزہ با نفاق و اختلاف و امثال آن سرودہ است۔"[2]

مستغنی کے چمن زار شاعری میں حقیقت پسندی کے طرب افزا غنچے اپنی پوری رعنائی کے ساتھ کھلے ہوئے ہیں۔ وہ ادبی نقاد ہونے کے ناتے بہت محتاط شاعری کرتے ہیں اور اسی لیے اچھے شعرا میں شمار ہوتے ہیں۔

انھیں کے ایک ہم عصر شعرا میں شیخ محمد رضائی خراسانی نے ۱۹۱۹ء میں ان کے کمالات شاعری کا اعتراف کرتے ہوئے یہ اشعار کہے تھے:۔

زہی سپہر سخن را مدار مستغنی — زتست کاخ سخن استوار مستغنی

بہ شعر دلکش و طبع لطیف و فہم سخن — ندیدہ کس چو تو در روزگار مستغنی

زہی ادیب سخنداں کہ نیست چوں تو کنون — دریں ادب کدہ آموزگار مستغنی

مندرجہ بالا اشعار جو انھیں کے ایک ہم عصر شاعر کی طرف سے اُن کی تعریف میں نظم کیے گئے وہ شاعری کی دنیا میں اُن کی اُستادی کا اظہار کرتے ہیں۔

محمد حیدر ژوبل اپنی کتاب 'نگاہی بادبیات معاصر در افغانستان' میں ان کے بارہ میں یوں لکھتے ہیں:۔

"عبدالعلی مستغنی از استادان شعر و دارای طبع روان

[1] الہام۔ ادب۔ کابل۔ شمارہ دوم ۱۳۵۳ھ/۱۹۷۴ ص ۱۱۲

[2] " " " " ص ۱۱۳

[3] " " " " ص ۱۱۲

صاحب کلیات است۔ در ہر دو زبان مروج
مملکت دری، و پشتو شعر می گفته" [1]

مستغنی کے اشعار پڑھنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ محمود طرزی کے سخت پیرو دُں اور ہم خیالوں میں ہیں۔ مثال کے طور پر اُن کا یہ شعر :-

بنائی شعر تو مستغنیا بطرز دگر کن — گذشتہ حرف خط و خال آخر ما ن و تو غافل

یا پھر ذیل کی غزل میں :-

نی شعر سرا باش و نہ ربط سخن آموز — جهدی کن و از بہر وطن علم و فن آموز
نی موی میانی و نہ چاه ذقنی گوئی — علمی کہ بکار آید ای چشم من آموز
از بہر لب لعل بتاں چند کنی جاں — رو کندن کان راز برای وطن آموز [2]
در نقطہ موہوم دھن چند شوی محو — در ہیچ ہیچ این سخن خوش ز من آموز
چوگاں ز تفنگی کن و گوئی ز گلولہ — نی زلف چو چوگاں و نہ گوئی ذقن آموز
کاہل مشو و بی ہنر از خانہ نشینی — چوں ریل پی علم و ہنر تاختن آموز

ای دل طرب اندوز سخنہای بلندت
مستغنی از اینگونہ سخن ہا بمن آموز

تقریباً بعینہ یہی مطالب و اصطلاحات محمود طرزی کے ذیل کے کہے ہوئے شعر میں پائی جا سکتی ہے :-

وقت شعر و شاعری بگذشت ورفت — وقت سحر و ساحری بگذشت ورفت
وقت اقدام است و سعی و جد و جہد — غفلت و تن پروری بگذشت ورفت [3]

مستغنی کی شاعری زمانہ کے قدم بہ قدم ہم آہنگ ہے۔ وہ اپنے معاشرہ کے حالات سے الہام حاصل کرتا ہے اور عوام سے باتیں کرتا ہے۔ اسی لیے اس کے اشعار دردناک اور دل نشیں ہیں۔ وہ خود ان معانی کو سمجھتا ہے :-

---

[1] ادب۔ کابل۔ شمارہ دوم ۱۳۵۳ھ ش/۱۹۷۴ء ص ۱۱۲
[2] م۔ ح۔ تدبل۔ نگاہی بادبیات معاصر در افغانستان ۱۳۳۷ھ/۱۹۵۸ء ص ۵
[3] ؍ ؍ ؍ ص ۵۵

یا من ز روی شعر کہ جوید برابری | با آفتاب ذرہ چگوید برابرم
الفاظ مست و معنی بی ریلایں وآن | ہیچند ویچ را بہ پشیزی نمی خرم
بیگانگاں معنی بیگانہ را بگو | من از شما بہ فہم سخن آشنا ترم
امروز قدر دان سخن کیست ہچو من | من خود سخن شناسم و من خود سخنورم
آب رواں کجا و رواں طبع من کجا | شکر کجا و شعر چو قند مکررم
زریں نمودہ ام مس معنی ز لفظ خوب
در اصطلاح شعر من آں کیمیا گرم

جب شاعر اپنے آپ کو اس میدان میں یکتا پاتا ہے اور کسی کو اپنا ہمسر اور برابر نہیں پاتا ہے تو یقیناً اُسے اپنی شعری عظمت پر ناز اور فخر کرنے کا حق ہے: —
مستغنی کے زمانہ میں عوام مکتب اور مدرسہ میں جانے اور پڑھنے کو کوئی اہمیت نہیں دیتے تھے اور نہ ہی اپنی اولاد کو ان جگہوں پہ بھیجنے پر آمادہ رہتے تھے۔ ان حالات کا مشاہدہ شاعر کو مجبور کرتا تھا کہ وہ لوگوں کو نصیحت کرے کہ وہ اپنے بچوں کو مکتب اور مدرسہ بھیجیں: —

بود کیمیا گر داماں مکتب | چہ گلہا دمد از گلستان مکتب
فلاطون کند کودک بی خرد را | مشو منکر کیمیا دان مکتب
شود ہر پسر پور سینا ز فیضش | ارسطو شود طفل نادان مکتب
نگر دیدہ گمرہ مسلماں مکتب | کہ محکم بود دین وایمان مکتب
برادر شناسد و فرزند داند | مر اطفال را اوستادان مکتب
بود طفل پاکیزہ و پاک دامن | سزاوار تعلیم و شایان مکتب
سزد اینکہ مستغنی زار باشد
بجان و دل از دوست داران مکتب

۱؎ ادب کابل۔ شمارہ دوم ۱۳۵۴ھ/۱۹۷۴ء ص ۱۱۳—۱۱۴
۲؎ الہام ادب کابل۔ شمارہ دوم ۱۳۵۴ھ/۱۹۷۴ء ص ۱۱۴—۱۱۵
۳؎ 〃 〃 〃 〃 ص ۱۱۶

شاعر نے لوگوں کی بے سوادی اور بے علمی کو مد نظر رکھتے ہوئے اپنے اشعار کو خود سادہ اور عام فہم زبان میں منظوم کیا ہے اور جہلا کے زمانہ کے دعوے کو کہ مکتب بچوں کی گمراہی کا سبب بنتا ہے، غلط بتاتا ہے اور کہتا ہے کہ " دین و ایمان مکتب محکم تر است "

مستغنی صلح و آشتی کا خواہش مند ہے، جنگ سے نفرت کرتا ہے۔ چنانچہ جنگ سے اپنی بیزاری کا اظہار کرتا ہے اور پہلی جنگ عظیم کے بارہ میں لکھتا ہے:۔

فغاں کہ جنگ یورپ زد بہ بحر و بر آتش　　مگندہ است دو آفاق سربسر آتش
کسی چہ چارہ تواند کہ در گرفت جہاں　　شود بہ ہر نفس ای وای تیز تر آتش
کہ می کند ز طرف دار دبی طرف پرسش　　چو شد بلند نہ پرسد ز خشک و تر آتش
کنون بہ خرمن ما میرسد شرارہ او　　بلند گرفتہ این جنگ آں قدر آتش

مستغنی کے یہ اشعار خوانندہ کو ملک الشعرا بہار کے اُن اشعار کی یاد دلاتا ہے جو انھوں نے جنگ کے موضوع پر " جغد جنگ " کے عنوان سے لکھے ہیں:۔

فغاں ز جغد جنگ و مرغوائی او　　کہ تا ابد بریدہ باد نائی او
چہ باشد از بلائی جنگ صعب تر　　کہ کس امان نباشد از بلائی او
بخاک مشرق از چہ روز نند رہ　　جہاں تو ران غرب واو لیائی او
رفاہ وایمنی طبع مسدار ہاں　　ز کشوری کہ گشت مبتلائی او

مغربی حکمرانوں کو مستغنی مخصوص ہدف بناتے ہیں اور اپنی آخری اور قطعی بات کہتے ہیں اور زمانہ کے تقاضوں سے باخبر بھی ہیں اور جدیدیت اور تبدیلی کے حمایتی ہیں۔ وہ ماضی پرستی کی مذمت کرتے ہیں۔ جیسے ذیل کی غزل میں:۔

حیف است وصف آں لب بچوں شکر کنون　　ہیچ است حرف تنگ دہان و کمر کنوں
در فکر سرو قامت و سیب ذقن مباش　　حاصل ازیں نہال نگردد ثمر کنوں
لعل لب است و گوہر دنداں خیال محض　　می جوئی کاں لعل و نشاں گہر کنوں
تشبیہ و استعارہ چندیں ہزار سال　　بگذار و شعر گوئی بطرز دگر کنوں
راہی کہ سپر شدہ چندیں ہزار بار　　راہ دگر بگیر و از آن در گذر کنوں
بگذشت و رفت قصۂ ماضی دگر مگوئی　　مستقبل است و حال زماں معتبر کنوں

هر عصر اقتضائی دگر دارد اں لبیب توپ و تفنگ بر دز تیر و تبر کنوں
لازم بود مناسب هر عصر کار و بار عصر دگر بود تو و کار دگر کنوں
مجبور اقتضائی زمانست هر که هست باشد به مقتضائی زمان فیروشر کنوں
اہل وطن هر آنکه بود در وطن بگو
می گو به وصف اہل وطن شعر تر کنوں[1]

شاعر اگر ایک طرف اپنے اشعار کے مضمون اور مطلب میں اصلاحات کا خواہاں ہے اور معشوق کے قد، چہرے اور لب کے اوصاف بیان کرنے کو عیب گردانتا ہے تو دوسری طرف شاعری اور شعر کے قالب میں تغیر اور جدید اوزان و اصطلاحات کا خواہش مند ہے اور اس طرح اس قسم کی فکر و اندیشہ کی بنا پر کہا جا سکتا ہے کہ مستغنی افغانستان کے جدید شعرا کے بانیوں میں سے ایک ہیں۔

ایک دوسری غزل ذیل میں نقل ہو رہی ہے جو شعری صنائع اور بدائع سے پُر ہے پلکوں کو خنجر اور ابرو کو شمشیر کی مانند دیگر شعرا نے بار بار تشبیہ دی ہے لیکن مستغنی نے روی عرق ناک اور پسینہ کو مروارید سے تشبیہ دے کر جدت اور لطف پیدا کیا ہے:۔

دل به مژگان تو می کرد به خنجر بازی دیده زاں روی عرق ناک به گوہر بازی
دل بابروی تو پیوست خدا خیر کند می کند باز به شمشیر و به خنجر بازی
بردی از دست دل خسته به بازی بازی ہست دلبر دل ما، پیش تو دلبر بازی
کار بوالهوسی نیست گزشتن از سر صفت عاشق مردانه بود سر بازی
باید ت باخت چو مستغنی بیدل سر و جان
عشق بازی نبود جان برادر بازی

اور دوسری خصوصیات سے بھرپور اس غزل میں ایک شعر:۔
"کار ہر بوالهوسی نیست گزشتن از سر صفت عاشق مردانه بود سر بازی"
ہر صاحب ذوق اور چشم و گوش رکھنے والے افغانی کا اپنا حصہ ہے۔

ہم کو معلوم ہے کہ مستغنی کو علوم و معارف اور ترقی سے کس قدر دلچسپی تھی انھوں

---

[1] م-ح-ژوبل نگاہی بادبیات معاصر در افغانستان ۴۷ص/۱۹۵۸ء ص ۵۶-۵۷

نے اپنی ایک غزل میں معارف و علوم کی خوبیاں بیان کرتے ہوئے لوگوں کو دعوت دی ہے کہ وہ اہل سخن کی سعی و کوشش اور اہمیت کو سمجھیں اسی لیے اُن کو گلزار وطن کا "رنگ دھندہ" جانتا ہے اور ایک فرد کی ہمت کو بھی وطن کے لیے رونق بخش قرار دیتا ہے لیکن مقطع کے دوسرے مصرعہ میں "پرتَوِ یک شمع" کو بھی انجمن اور مجلس کی رونق کے لیے کافی سمجھتا ہے :-

نشیدۂ ملی

وطن را از معارف می دہد اہل وطن رنگی
بلی باشد چمن را از گل و سرو سمن رنگی

دہد از دست خویش ایں خانہ را اہل وطن زینت
کہ نی جوش ریاحیں نیست بر روی چمن رنگی

گلستان را بلند آوازہ سازد نالۂ بلبل
کہ گلزار وطن را می دہد اہل سخن رنگی

کجا ایں صفحہ را بی کوشش نقاش تصویری
تو گر نقشی نہ بندی نیست در بنیاد فن رنگی

وطن را رونق ادراک بخشد ہمت مردی
یقیں از پرتوی یک شمع گیرد انجمن رنگی

گلستان وطن کو صفحہ (کینوس)، اہل وطن کو نقاش قرار دے کر کسی نئی تصویر سے یعنی جدت طرازی اور ترقی پسندانہ روش سے وطن اور کلام اور شاعر کی زندگی میں نیا رنگ اور نور بھر دینا چاہتا ہے۔ مستغنی کے اس مدعا کو شاعرانہ انداز دینے کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔

---

[1] خستہ۔ معاصرین سخنور۔ کابل۔ ۱۳۳۹ھ/ ۱۹۶۰ء ص ۱۴۳-۱۴۴
[2] ایضاً ایضاً ایضاً ص ۱۴۴

مستغنی کے کلام کا مجموعہ ۱۳۳۸ھ/ ۱۹۵۹ء میں وزارت معارف افغانستان کی طرف سے کابل سے شایع ہوگیا ہے۔ مستغنی کی موت کو اُن کے ہم وطنوں نے اور خصوصاً شعرا نے جن میں معاصرین میں قاری عبداللہ مرحوم ملک الشعرا، مولانا خستہ، صبا، استاد بیتاب اور دوسروں نے حسرت ناک مرثیے لکھ کر، افسوس ناک قرار دیا۔ یہاں تک کہ ایران کے معروف شاعر ملک الشعرا محمد تقی، بہار نے بھی " ہدیہ مشروح " کے عنوان سے نوحہ نامہ منظوم کیا۔

مستغنی کے عقیدت مند مصنفین اور شعرا نے قصیدہ اور رباعی لکھ کر اپنا منظوم خراج عقیدت پیش کیا۔ قاری ملک الشعرا کے قصیدہ اور رباعی میں سے فقط رباعی پیش خدمت ہے:۔

مستغنی ما کہ کردہ سامان سخن والاست زشان وشوکتش شان سخن
نشست بہ کرسی ہمہ حرفش کہ نمود از طبع رواں تخت سلیمان سخن[1]

قصیدہ کا مطلع یوں ہے:۔

مسخر گشت اقلیم معانی بر سخن دانی سخن را می سزد بر خود کند گر شوکت وشانی
کنوں افغانیاں را کی بود در گلشن معنی چو مستغنی نواسنجی چو قاری سحر دستانی[2]

دوسرے شاعر اور معروف افغانستانی مصنف محمد عثمان صدقی نے مستغنی کو جو عالمانہ خراج عقیدت پیش کیا ہے وہ ایک طرف اُن کی عظمت اور بزرگی کا اعتراف ہے اور دوسری طرف شاعر اور مصنف کی اُن سے عقیدت اور محبت کا مظہر ہے۔ صدقی کے اس عقیدت مندانہ خراج کی عبارت کے ساتھ ہی ہم مستغنی کے کلام اور استادانہ اور فن کارانہ مہارت پر گفتگو کو اختتام پر پہنچاتے ہیں:۔

عبدالعلی مستغنی شاعر بود و برائی شاعری خلق شدہ بود۔ قصا یا صد و صد و پنجاہ بیتی را در دو سہ ساعت می نوشت۔۔[3]

---

[1] خستہ۔ معاصرین سخنور۔ کابل ۱۳۳۹ھ/ ۱۹۶۰ء صہ ۱۶۳

[2] " " "

[3] محمد عثمان صدقی۔ سیر ادب در افغانستان کابل ۱۳۴۰ھ/ ۱۹۶۱ء صہ ۱۳۵

شایق جمال

میر غلام حضرت شایق جمال ولد میر جمال الدین ۱۳۲۰ھ ق/ ۱۹۰۵ء میں کابل میں متولد ہوئے
اُن کے خاندان کے سارے لوگ اہل علم و فضل تھے ۔ جمال اپنے چھوٹے قد اور منحنی جسم میں
ایک دانا دل، درد آشنا جذبہ اور شاعرانہ شیوا بیان زبان رکھتے تھے ۔ وہ ایک
خوش صحبت، بذلہ سنج اور شیوا بیان شخصیت تھے ۔

شایق میدان شاعری میں اُس کاروان کے بچے کچے لوگوں میں تھے جن کے
سالار قاری ملک الشعرا تھے ۔ یہ سب لوگ دانستہ یا نادانستہ طور پر مشہور سبک ہندی
کے شعرا کے پیرو تھے اور اسی لیے اس دیار کے متقدمین شعرا کے شاہکاروں کی پیروی
میں اس قدر دور ہو گئے کہ آج بھی اُن کے کلام میں اس بیگانگی کا مشاہدہ کیا جا
سکتا ہے ۔[1]

شایق جمال اصناف سخن میں غزل کو سب سے زیادہ پسند کرتے تھے ۔ اسی لیے
اُن کی غزلوں میں لطیف عاشقانہ نکتے ملتے ہیں اور گاہ بگاہ اُن میں کوچہ و بازار میں
بولی جانے والی زبان کی اصطلاحات سے بھی مدد لی ہے اور جو سامعہ اور بصر نواز دونوں
ہی ہے ۔ وہ ایک درویش صفت اور آزادہ رو انسان تھے اسی لیے کسی شان و
شوکت، جاہ و جلال اور مال و منال سے کوئی واسطہ نہیں رکھتے تھے ۔ سالوں تک
معلمی اور اُستادی کا پیشہ اختیار کیا اور درس و تدریس سے تو خاصا شغف تھا ۔
شایق نے کبھی اپنی زبان کو مدح سے آلودہ نہیں کیا اور اپنے ہم عصروں کے مانند
کسی کی درخواست تک پر شعر نہیں کہا ۔ اسی لیے قصاید کم کہے اور مخمس ضرور لکھے ۔ وہ
اپنے آپ کو ذمہ دار شاعر سمجھتے تھے ۔[2]

ان کے اخلاقی اور اجتماعی اشعار زیادہ ہیں جس میں مجبوروں کے نالے اور

---

[1] دکتور سید مخدوم رہین ۔ ادب، شمارہ دوم ۱۳۵۲ھ ش/ ۱۹۷۴ء ص ۱۱۸ ـــ ۱۱۹
[2] " " " ص ۱۲۰

دردمندوں کے مصائب کا عکس نظر آتا ہے۔ جوانوں اور روشن فکروں اور وطن پرستوں کو اُن کی قومی اور ملی ذمہ داریوں پر متوجہ کیا ہے۔

شایق جمال کا دیوان ۱۳۳۷/ ۱۹۵۸ء میں کابل میں طبع ہوا اور جلد ہی نایاب ہوگیا۔ شایق کی شاعری کا کچھ حصہ طنز آمیز اور ہزل بھی ہے۔

شایق جمال نے ۱۳۵۲ھ/۱۹۷۴ء میں اس جہان آب و گل کو خیر باد کہدیا اور حافظ کے انداز میں انھیں کا ایک شعر اُن کے مرقد پر اُن کی یاد کا چراغ ہے:—

بمزارش قدمی رنجہ کن ای سرو رواں　　سالہا شایق بیچارہ دعاگوی تو بود[1]

دوسرے مصنفین اور شعرا نے اُن کو اس طرح خراج عقیدت پیش کیا ہے:۔

"میر غلام حضرت شایق جمال از شاعران زبردست کہنسال امروزہ افغانستان است ..... اسلوب نظم شایق جمال رواں، تصویراتش سادہ، صمیمی و تاثیر بخش است۔ شایق جمال از طرفداران پر حرارت نوآوری در نظم می باشد۔ اواز تصویرات قالبی زبان زدشدہ کراہت دارد و این را در زبان شعر خلیلی برجستہ بیان کردہ است"[2]

ایکہ می خوانی قیامت قامت دلدار را　　ایکہ با فردوس نسبت می دہی گلزار را
ایکہ می دانی بت خود شوخ گل رخسار را　　ایکہ دایم گفتہ ای بادام چشم یار را
ایکہ با مژگان برابر می نمائی خار را　　مفت از کف می دہی خود عمر قیمت دار را[3]

شایق جمال کو جنھیں شیریں کلام کہنا مناسب ہوگا۔ عاشقانہ اور خوب صورت غزل گو کہنے کے علاوہ روز و شب اور اجتماعیات سے متعلق موضوعات کو رشتہ نظم میں پرونے والا شاعر بھی کہا جاسکتا ہے۔ یہ اشعار زیادہ تر کابل کی مقامی بول چال کی زبانوں میں نظم کیے گئے ہیں۔ اُن کے اشعار کی تشبیہات اور استعارات بھی نادر ہیں۔ اُن کے اشعار سادہ اور رواں ہیں اسی بنا پر اُن کا کلام عوام الناس میں مقبول ہے[4]

---

[1] دکتور سید مخدوم رہین۔ ادب۔ شمارہ دوم ۱۳۵۳ھ ق/۱۹۷۴ء صفحہ ۱۲۰

[2] ح نعمت اللہ لطیف و رحیم ہاشم۔ استادان شعر معاصر افغانستان طبع مرکزی وزارت مدنیت تاجیکستان ص

[3] محمد عثمان صدقی سیر ادب در افغانستان کابل ۱۳۴۰/۱۹۶۱ء صفحہ ۱۹

انھیں کے اشعار ہیں:۔

شیریں ادائی من زغمت کوہکن شدم	از تیشۂ جفائی تو گل گون کفن شدم
شاید اگر زنقرہ بود لوح تُربتم	یعنی شہید تیغ توای سیم تن شدم
شایق کسی بدیر محبت چو من مباد	نی بت پرست گشتم و نی برہمن شدم

آخری مصرعہ میں شاعر بت پرست اور برہمن کو ایک دوسرے سے جدا شمار کرتا ہے اور "بت پرستوں" سے اُس کا مفہوم طبقہ عوام ہے اور برہمن مُراد خواص ہیں۔

شایق جمال اپنے عہد کے شعرا کو ایک نئی ایجاد کی شکل میں دعوت دیتے ہیں۔ اور کہتے ہیں:۔

در طریق شاعری سبک جدید آغاز کن	چشم ابنائی وطن از خواب غفلت باز کن

وہ زندگی کو چاہے جیسی بھی ہو، احتیاجات کی تمام ناگواریوں کے ساتھ اُس کے خسارہ اور نقصان کو بغور دیکھتا ہے اور حقیقی اور منصفانہ تصویر کھینچتا ہے۔[2]

شایق جمال کی بذلہ گوئی کے بارہ میں یہ حکایت مشہور ہے کہ ایک روز وہ اپنے کتے کو اپنے گھوڑے پر بٹھا کر استاد بیتاب کے پاس آئے اور کہا کہ بیچارہ بیتاب ہے۔ استاد بیتاب نے فی الفور جواب دیا شایق ماست[2] قارئین کو اکبری دربار کے شعرا فیضی اور عرفی کا لطیفہ ضرور یاد ہوگا۔[3]

اب ذیل کی ایک غزل کے ساتھ شایق جمال کی شاعری کے بارہ میں گفتگو کا آغاز ہوتا ہے:

داغ عشق تو بجاں ہر کہ خریدار نبود	او بہ پیش من سودا زدہ ہشیار نبود
بعد مردن ہم ازاں کوچہ گذر خواہم کرد	تا نگوئی دل بے چارہ وفادار نبود
نی شود باعث بی آبی شمشیر کسی	ور نہ تو ن ریزی ما این ہمہ دشوار نبود
دائم از راہ کشیدہ است ترا شکوۂ غیر	ور نہ از کلبۂ تاریک منت عار نبود

---

[1] دکتور سید خدوم رہین ادب کابل شمارہ دوم ۱۳۵۴ھ/۱۹۷۴ء صـ۱۱۹

[2] ح نعمت اللّٰہ لیف و رحیم شاہین۔ استاداں شعر معاصر افغانستان صـ۸

[3] محمد حیدر ژوبل۔ نگاہی بادبیات معاصر در افغانستان۔ کابل ۱۳۳۷ھ/۱۹۵۸ء صـ۶۱ــ۶۲

راهب از دیر هم امروز مرا داد جواب | گردن بسته من قابل زنار نبود
همه کس کشتن منصور تماشا می کرد | بجز انصاف که هرگز بسر دار نبود
سا کلت واقف احوال پریشان منست | بتو درد دل ما حاجت اظهار نبود
آمد آندم سربالین من آئینه ناز | که دل رفته ز خود شایق گفتار نبود[1]

اس غزل میں روانی اور سادگی کا واضح مشاہدہ کرنے کے بعد اس میں پیش کردہ صنائع قابل غور وفکر ہیں۔ "بی آبی شمشیر" سے تجنیس شعری کا بہترین استعمال کیا ہے۔ اور بی آبی، بی آبروئی بی جوہری کا مفہوم نمایاں ہے۔ شمشیر کو آب دینا، یا جوہر دینا عام بات ہے اور وہ بھی اس لیے کہ کثرت استعمال سے یہ آب اور جوہر غائب ہو جاتا ہے اور شاعر کو اس بات کا خوف ہے کہ کہیں اُس کے قتل سے معشوق کی شمشیر کا جوہر کم نہ ہو جائے اور یہ بھی کہ وہ خود اس لائق بھی نہیں کہ محبوبہ کی شمشیر اُس کے قتل سے بے آبرو نہ ہو جائے۔

گردن بستہ کی اصطلاح کا استعمال بھی افغانستان میں عام ہے اور تقصیر وار اور گنہگار ہونے کے معنوں میں لیا جاتا ہے۔ یہاں شاعر کو شکوہ ہے کہ وہ ہندو ہونے تک کے لیے دیر کی طرف راجع ہوا لیکن برہمن نے اُسے محبوب کا گردن بستہ دیکھ کر، انکار کر دیا اور زنار کو جو کہ ہندو کی مذہبی نشانی ہے اُس کی گردن میں ڈالنے کو تیار نہیں ہے۔

اسی غزل کے چھٹیں شعر میں منصور کے سولی پر چڑھائے جانے والے مشہور واقعہ کو تلمیحاً نظم کیا ہے۔ واقعہ اگرچہ تازہ نہیں مگر عوام میں تو شہرت ہے۔

خوش آن روی

خوش آن روی کز و دیدم صفائی صبح مردان را
خوش آن روی که یادم می دہد شام غریبان را

---

[1] محمد حیدر ژوبل۔ نگاہی بادبیات معاصر در افغانستان۔ کابل، ۱۳۳۷ ھ ش/ ۱۹۵۸ء ص ۶۱-۶۲

خوش آن چشمی کہ می بیند رخ گلبرگ خوبان را
خوش آن دستی کہ می مالد کف پائی نکویان را
خوش آن رندی کہ می باشد شب و روزش بہ میخانہ
خوش آن مستیکہ بفروشد بہ یک پیمانہ ایمان را
خوش آن عاشق کہ می یابد پس از عمری شب وصلی
خوش آن دلبر کہ می گیرد بکف دلہائی نالان را
خوش آن مفلس کہ گوہر می شمارد آبروی خود
خوش آن منعم کہ خوش دارد نوائی بے نوایان را
خوش آن مسلم کہ ہیچ از خود نرنجاند دل ہندو
خوش آن ہندو کہ می گوید خدا حافظ مسلمان را

کلام من ہمہ بوئی کباب دل دہد شایق
خوش آن شاعر کہ بنویسد بخون خویش دیوان را[1]

اگر ہم حقیقت کو نظر انداز نہ کریں تو معلوم ہوگا کہ افغانستان کے عصری عہد کی یہ بہترین غزل ہے۔ اچھی تشبیہات بہترین افغانی اصطلاحات کے ساتھ جیسے "صبح مردان" و "شام غریباں" استعمال ہوئی ہیں۔ رو بہ صبح و موی بر شام" کی تشبیہات اگرچہ پرانی ہوگئی ہیں لیکن وہ صبح مرداں اور شام غریباں کا اضافہ کرکے ہر شخص کو اس کے پیشہ اور مسلک کے مطابق ذمہ دار پابند اور معقول بناتا ہے یعنی ایمان فروشی مست، عزیز داشتن مفلس آبروئی خود را منعمی کہ نوائے بے نوایاں می شود وغیرہ وغیرہ۔ شاعر حقیقی مسلمان اُسے سمجھتا ہے کہ وہ مسلمان تو کیا ہندو کے دل کو بھی نہ ستائے اور ہندو دراصل وہی ہے جو مسلمانوں کا خیرخواہ ہو اور اسی قسم کی خوبیاں اس غزل کا خاصہ ہیں۔

اسی طرح شایق کا یہ کمال ایک اور دوسری غزل میں قابل دید ہے۔ جس میں شاعر

---

[1] نعمت اللہ شریف و رحیم ہاشم۔ استاداں شعر معاصر افغانستان طبع مرکزی وزارت مدنیت، تاجیکستان ص ۱۱۷-۱۱۸

اپنے معشوق کے بغیر خود فراموشی اور بے ہوشی میں پناہ لیتا ہے، کسی چیز کو نہیں پہچانتا ہے اور نہ ہی کسی چیز کو قابل اعتنا گردانتا ہے یہاں تک اپنے محبوب کے بغیر دونوں جہاں پر رضامند نہیں ہے اور گھر یا باغ ہر جگہ اپنے اوپر خاک اڑاتا ہے۔ نہ تو شعر گوئی پر قادر ہے اور نہ ہی ملنا جلنا پسند کرتا ہے اور ایسا ہونا بھی چاہیئے کیوں کہ شاعر بے چارہ بھول بیٹھا ہے کہ وہ آئے اور یہ کتنا اچھا ہوگا کہ دوست، قبل اس کے کہ شایق کو ہمن کی مانند اپنا سر پھوڑے، اُس کی داد و فریاد کو آپہنچے۔

نہ گل شناسم و نہ شمع انجمن بیتو	بمن رسیدہ ہمیں داغ سوختن بیتو
خیال من کہ زمستان و عالم برف است	بدیدہ بسکہ خنک خوردہ نسترن بیتو
نہ خانہ منزل راحت نہ باغ جای سرور	مگر بہ سر فگنم خاک این وطن بیتو
بہیچوجہ نخواہم شد از فلک ممنوں	اگرچہ ہر دو جہاں را دہد بمن بیتو
چگونہ شعر سرایم چساں کنم تقریر	کہ گشتہ است فراموش من سخن بیتو
بیا کہ شایق شیریں کلام ما اکنوں	بمرگ خود شدہ راضی چو کوہکن بیتو

شایق اپنی شاعری میں متعدد اور مختلف موضوعات سے رابطہ رکھتے ہیں اور بڑے دقیق اور انوکھے گوشوں کو اپنی شاعری میں سمونے کا ملکہ رکھتے ہیں اور اُس کے اچھے اور اہم پہلو کو لوگوں کے سامنے پیش کرتے ہیں اور وہ بھی اپنے خوب صورت اور موزوں کلمات کے ذریعہ۔ چنانچہ ذیل کے ایک مختصر منظومہ میں ہم دیکھیں گے کہ شاعر نے ریڈیو جیسی عام پسند چیز کا ذکر کیا ہے اور اگر ہم غور کریں تو معلوم ہوگا کہ درحقیقت آج ریڈیو ہمارے لیے ایک معلم، ایک رہنما اور ایک اچھا دوست ہے:۔

می کند خدمت بملت را دیو	میزند حرف سعادت را دیو
می دہد راہ فلاحت را نشاں	می کند بحث از زراعت را دیو
می نماید بحث از ہر علم و فن	شد معلم در حقیقت رادیو
درس او تہذیب و اخلاق است و بس	میزند دم از فضیلت را دیو
می کند اصلاح نقصانات ما	خوش ندارد عیب و علت را دیو
قصہ ہائی خوب می گوید بما	گشتہ اسباب مسرت رادیو[1]

---

[1] لمعت اللہ لیف و رحیم ہاشم۔ استادان شعر معاصر افغانستان۔ وزارت مدنیت، تاجیکستان ص ۱۱۳

علم و دانش کی اہمیت اور قدر و قیمت کس زمانہ میں نہیں رہی ہے اور کب اس کے بارہ میں کیا کچھ نہیں لکھا گیا ہے۔ شایق قدیم شعرا اور اُن کی شاعری کا قدر دان ہے اور اُسے علمی اور تمدنی میراث سمجھتا ہے اور وہ اسی لیے قدما کے طرز اور اسلوب پر تنقید کرنے والوں پر خفا ہے اور مُنہ توڑ جواب دیتا ہے اور ثبوت کے طور پر کہتا ہے کہ ہم اگر مروارید کو پرانی تھیلی میں ڈال کر رکھ دیں تو وہ اپنی آب و تاب نہیں کھوتا ہے۔ وہ لوگوں کو علم و دانش کی طرف دعوت دیتے ہیں اور "قامت یار" "خنجر مژگان" "قاصد باد صبا" "حکایت شیریں" اور "نالۂ بلبل" وغیرہ سے پرہیز کرتے ہیں اور زمانہ کے حقایق اور تقاضوں کی طرف متوجہ کرتے ہیں اور "احتیاجات وطن، تانک و توپ (ٹینک اور توپ) ٹیلیگرام و رادیو" جیسی چیزوں کو فرہاد کے تیز تیشہ کے بجائے لوگ اپنے وطن کے دفاع کے لیے استعمال کریں پھر کبھی شیریں کا خیال نہ لائیں تاکہ اس خام خیالی اور عشق لا حاصل کا پُر فتن اور پُر فریب باب ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بند ہو جائے ملاحظہ ہو نظم:—

علم و دانش

راہ علم و دانش ای جان پدر باید گرفت — شوق تحصیل و کمالات ہنر باید گرفت
اشک خود را تا بکی لعل و گہر پنداشتن — شاعر مفلس ز جیب خود خبر باید گرفت
در ہوائی قامت او تا قیامت زندگی — احتیاجات وطن را در نظر باید گرفت
خنجر مژگان خراب و تیغ ابرو کُند شد — فکر تانک و توپ را اکنون بسر باید گرفت
قاصد باد صبا دیگر براہ از پا بماند — تیلگرام و رادیو را نامہ بر باید گرفت
آہن و فولاد باید نالہ و فریاد چیست — بعد ازین از بیستون کار دگر باید گرفت
صورت شیرین بسی اوقات ما را تلخ کرد — جان من! اکنون بجان او تبر باید گرفت
تو تیائی دیدہ خود خاک پائی کس مساز — عینکی بہر تمیز خیر و شر باید گرفت
نالۂ بلبل تمام و شاہد گل پیر شد — نوع دیگر از گلستان ات خبر باید گرفت

تا کی از چشم تر و لب ہائے خشک تو د سخن
شایق از بحر و بر دنیا خبر باید گرفت [1]

نالہ و فریاد کو خیر باد کہو، آہن و فولاد کو قبول کرو۔ بیستوں کا نمبر بعد میں آئے گا شیریں کے تصور نے صدیاں تلخ کیں آج تیر آسی کا سر پھوڑنے کے لائق ہے، اپنی آنکھوں کی تو تیا دوسروں کے کام آنے نہ دو اور خیر و شر، بھلے بُرے میں فرق کرنے والا چشمہ لگاؤ، عشاق کے نالے، شاہد گل کا قصہ پرانا ہو گیا۔ آج گلستان وطن کی نگہبانی کے لیے جدید آلات اور افکار لازم ہیں اور شایق اپنی شاعری کا مدعا عہد نو کو بناتا ہے۔

شایق نے چونکہ ۲۵/ اسد ۱۳۵۳ھ/ ۱۵ اگست ۷۴ء۱۹ء کو اس دار فانی کو خیر باد کہا ہے، کابل کے اخبار نے افغانستان کے یوم استقلال (۲۸ اسد/۱۵ اگست کے موقع پر ایک خاص شمارہ میں ہمارے اس شاعر کی ایک وطن پرستانہ مثنوی شایع کی ہے کہ جس میں شاعر اپنے وطن کی خوب صورتی کو، لوگوں کی بہادری کو اور اُس کے تاریخی ہیروز کو اور اُس کے پھل اور پھول کی خصوصیات کو سراہتا ہے اور اُسے دنیا کی بہترین مملکتوں کے مقابلہ میں ترجیح دیتا ہے۔ ملاحظہ ہو نظم:-

وطنم ای وطن خوش گل و خوش آب و ہوا
ایکہ ہر چیز پسندیدہ ترا دادہ خدا
لالہ و نسترن و سنبل و ریحان تو خوب
کوچہ و برزن و صحرا و بیابان تو خوب
آب شیریں تو ہر کس کہ دمی نوش کند
چشمۂ زندگی خضر فراموش کند
پر بود خاک تو از مردم سرباز و دلیر
سالہا آمدہ بیرون ز نیستان تو شیر [2]

---

[1] م۔ ح نعمت اللہ و رحیم ہاشم۔ استادان شعر معاصر افغانستان طبع مرکزی وزارت مدنیت تاجیکستان ص ۱۱
[2] روزنامۂ ہیواد، کابل ۱۲ اگست ۸۴ء۱۹ء ص ۶

رتبہ معنوی مولوی افزوده بسی
نیست در روئی زمین ہمچو سنائیت کسی
جامی و خواجہ انصار ترا بنده شوم
این سینای ترا نام برم زنده شوم
پسر نامور توست وزیر اکبر خان[1]
میرویس آن خلف غازی با نام ونشان[2]
نه ہمیں میوه و باغ گل رعنا داری[3]
آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری[3]

وزیر اکبر خاں دوست محمد خاں غازی نامور کے بیٹے جن کی مدح میں حمید کشمیری نے اکبر نامہ لکھا ہے اور ہوتکی خاندان کے قندھار میں بانی میرویس بابا توشاعر کے عہد جدید کے مشاہیر میں ہیں۔ لیکن وطن میں ان کے علاوہ دنیائے فارسی دری افغانستان کے مایۂ ناز شاعر مولوی روم کی مثنوی معنوی، صوفی شاعر سنائی، مولانا جامی خواجہ عبداللہ انصار اور حکیم ابن سینا نے وطن کی شہرت وعظمت میں چار چاند لگا دیے ہیں اور شایق ان سب پر افتخار کرتا ہے اور مثنوی کا خاتمہ مشہور فارسی مصرعہ "آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری" پر کرتا ہے۔

شایق کے کلام پر مفصل نظر ڈالنے کے ساتھ اُن کی بذلہ گوئی اور فکاہیہ نثر پر بھی خیال آرائی ہو جائے تو بہتر ہے۔ اُن کا ایک خط نمونہ کے طور پہ درج کیا جارہا ہے۔ جو اُن کے خاص انداز کا ترجمان ہے۔

"من بیچاره چندیں بار عازم ملک آخرت گشتہ و کاملاً بار وبستر تو در البستہ و پاسپورت ہم گرفتہ بودم اما زحمت راه تکلیف رفقا، بی سرپرستی اولادک ہا مرا اجازه نداد۔ از طرفی قیمتی تکہ کفن و کشتی گرفتن مرده شوی

---

[1] ۱۱۲۰ ق ۱۷۰۵ء

[2] روزنامہ ہیواد، کابل، ۱۶ اگست ۱۹۸۴ء ص۴

[3] دکتر سید مخدوم رہین۔ ادب، کابل، شماره دوم، سال ۱۳۵۴ھ/ ۱۹۷۴ء ص۱۲۰

سر کجبیں از فلتق بازم داشت وہم مردۂ خود را بخواب دیدم بمن گفت
زنہار شوق آمدن آخرت را نکنی کہ پشیمان خواہی شد ہمیجا کش وگیر بکثرت
وہم از نالہ و فریاد درشوت خواراں ستم بنیاں گوش ہا زحمت است
بر علاوہ اسپک خود را کہ پیشتر فرستادہ بودی دوزخیاں از پا ماندہ اورا سہ
پشتہ سوار شدہ بیچارہ را کمری نمودندہ دوبارہ مرد۔ جلا اور اکلانتر متکبرین
برای خود بالاپوش ساختہ وقیزہ اش را تحصیل دار صاحب، بہ کلاہ خویش
انداختہ۔ پس پیادہ ماندن تو دریں مملکتی کہ چنداں موتر و گادی ہم پیدا
نمی شود دشوار است، راستی عرض کنم از ہیکل غضب آلود وپیشانی پرچیں
منکر نکیر ہم ترسیدم ودر پتۂ صندلی خزیدم، دیدہ شود کہ مقدرات
چہ خواہد کرد۔

نوید

سردار نور احمد کے لڑکے احمد نوید ۱۲۸۰ش/۱۹۰۱ء میں کابل میں پیدا ہوئے
اور ابتدائی تعلیم اپنے والد نور احمد سے حاصل کی اور قاری ملک الشعرا مولانا یعقوب
فراہی شایق، آفندی اور داوی جیسے شعرا اور دانشمندوں کے ایک گروہ سے دوسری
ادبی اور علمی چیزیں سیکھیں اور ۱۳۰۳ش/۱۹۲۴ء میں حکومت کے ملازموں کے
زمرہ میں شامل ہو گئے[1]

وہ زیادہ تر وزارت خارجہ میں مامور رہے اور عربی، انگریزی اور جرمن
زبانوں کے علم کی بنا پر خاصے ممتاز اور مقبول رہے ہیں۔ اُن کے شعری ذوق نے
اُن کو شعر کہنے پر مجبور کیا اور اُن کا کلام رسائل اور میگزین میں شایع ہوتا رہا۔
یہ بات ضرور ہے کہ اُن کے کلام کا کوئی مجموعہ مستقل طور پر شایع نہ ہو سکا۔ انھوں
نے شاعری میں صنف غزل پر خاص توجہ دی اور خصوصًا سبک ہندی میں صائب اور

---

[1] خستہ، معاصرین سخنور، کابل ۱۳۳۹ش/۱۹۶۰ء ص ۲۰۳

کلیم کی پیروی پر توجہ دی ہے۔ اسی لیے اُن کا یہ انداز جوروان اور سادگی الفاظ کا مرقع ہے، اُن کے دوسرے سبک ہندی کے نمایندہ ہمعصر شعرا کے مقابلہ میں امتیازی حیثیت رکھتا ہے۔[1]

اُن کے اس انداز کے بہت نمونے ہیں چنانچہ اُن کی ایک غزل "سخن مستانہ" اُن کے عالم سرمستی، جذب اور کیف کی مظہر ہے۔ جس میں وہ اعتراف کرتے ہیں کہ انھیں علوم ادب کا دعوا نہیں ہے اور اُن کا روئے سخن شراب کی طرف ہے اور وہ بغیر شراب کے ایک لمحہ بھی زندہ نہیں رہ سکتے ہیں اور اگر اُن کا جام شراب خالی ہوگیا تو وہ بھنگ کھانے پہ آمادہ ہو جاتے ہیں اور بے خودی کے عالم میں کبھی شراب کا مٹکا توڑ دیتے ہیں اور کبھی محتسب کا سر پھوڑ دیتے ہیں اور مایوسی اور بے حوصلگی کی بنا پر جنگ کا ذکر کرتے ہیں اور چونکہ رنج و محن اور سرگرانی کے عادی ہو چکے ہیں اس لیے درویش صفت ہو جاتے ہیں اور تاج و تخت کو آگ لگا دیتے ہیں:

کی لاف علم و دانش و فرہنگ میزنم
مستم سخن ز بادہ گلرنگ میزنم

بی نشۂ یک نفس نتوان برد بار غم
ساغر ز بادہ گشتہ تہی بنگ میزنم

گر پائی خم شکستہ وگر فرق محتسب
از بی خودی بہ ہر چہ رسم سنگ میزنم[2]

از بسکہ کرد حوصلہ ام تنگ روزگار
باہر کہ میرسم سخن از جنگ میزنم

خو کردہ ام بہ محنت و آوارگی نوید
آتش بہ فرق افسر و اورنگ میزنم[3]

---

[1] محمد سرور مولائی۔ برگزیدۂ شعر معاصر افغانستان۔ انتشارات زر، تہران۔ ۱۳۵۰ ش / ۱۹۷۱ء، ص ۱۶۳-۱۶۴

[2] " " " " ص ۱۱۶

[3] " " " " "

اسی طرح ایک اور غزل میں شاعر محبت کی آگ کا شکوہ کرتا ہے کہ اُس نے اُس کے دل و جگر پر کیا بلا نازل کر دی ہے اور وہ سیلاب جو ہر ویران کوٹھڑی کو اپنی زد میں لیتا ہے۔ آخر اُس کے اجڑے ہوئے گھر کی طرف متوجہ کیوں نہیں ہوا اور نہ اُس کا حال معلوم کیا۔ وہ غیر سے شکوہ کرتا ہوا افسوس کرتا ہے کہ آخر میرے بے خبر دل نے میری خبر کیوں نہیں لی۔ اُس کی بے پروائی اُس کے لیے شکوہ کا باعث ہے حالانکہ اگر وہ باغ میں نغمہ سرا ہو تو چمن کے عنادل اُس پر گل بکھیریں۔

گلہ

آدر د محبت چہ بلائی بسر من — دل در بر من سوخت بپرس از جگر من
گویند رود سیل بہ ہر کلبہ ویران — این خانہ برانداز نیامد بہ بر من
از غیر نمایم گلہ اما عجب این جاست — نگرفت دل بی خبر من خبر من
می بود سر از غصہ گہی در تہ بالم — خاکم بسر اکنون کہ فروریخت پر من
در باغ نوید ار بکنم نغمہ سرائی — ریزند مقیمان چمن گل بسر من[1]

نوید حسن کا دلدادہ اور کافرادائی کا مارا ہوا ہے۔ وہ دوست کی نگاہ مست سے مخمور ہونے کی بنا پر جام شراب کی ضرورت نہیں محسوس کرتا ہے۔ اس جنون کو خود پر ترجیح دیتا ہے۔ آفتاب کو اپنی گرمی تپش قرض دے سکتا ہے۔ مانند سیلاب، کف برلب رواں ہے اور اپنی عناں اس ناپختہ عقل کے حوالے نہیں کرنا چاہتا ہے اور یہ شیخ اگر قلقل مینا سے استفادہ نہ کرے تو شاید اسرار حقیقت سے آشنا بھی نہ ہو سکے لیکن خود شاعر سراپا خوددار ہے کہ پیاسا ہونے کے باوجود کسی کے اصرار پر بھی جام نہیں لینا چاہتا۔ وہ اقبال اور شہرت سے گریزاں ہے ساری دنیا میں اس کی صفائے دل کا چرچا ہے اور جس کے ہوتے ہوئے آئینہ کی ضرورت نہیں ہے۔ کسی خوش خبری سے اس کا دل خوش نہیں ہے۔ کیوں کہ صرف زبانی پیغام سے

---

[1] مجلۂ ژوندون شمارہ، ۴۰، ۴۴/۱۳۵۴/۱۹۷۵ء/ کابل ص ۴۶

لذت دیدار میسر نہیں ہوتی ہے:۔

مخمور نگاہ

مخمور نگاہ تو بہ کف جام نگیرد — مجنون تو ہرگز ز خرد نام نگیرد
کی گرم تواند کہ کند بزم جہاں را — خورشید اگر شعلہ ز من وام نگیرد
کف برلب و مستانہ چو سیلاب بدوانم — یارب کہ عنانم خرد خام نگیرد
آگہ نشود شیخ ز اسرار حقیقت — از قلقل مینا اگر الہام نگیرد
دارم دل مغرور کہ با تشنہ لبی ہا — از دست کسی جام بہ ابرام نگیرد[1]

تو ید اس گلہ اور شکوہ کے باوجود استغنا اور صبر کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑتے اور آسمان کی ستم رانیوں کے باوجود ہر مشکل آسان ہے۔ وہ چرخ کو ایک کاخ کہن اور عظمت و شکوہ کی یادگار بتاتے ہوئے خواہش کرتا ہے کہ اگر اُس کو بنا نہیں سکتا تو بگاڑے بھی نہ۔ وہ دوست سے مخاطب ہوتا ہے کہ وہ شمشیر برہنہ در دست اُس پر وار کرے کیوں کہ۔ تیغ اُس کے ہاتھ میں ___ ایک تکۂ فولادی سے زیادہ نہیں۔ طبیبوں کے احسان سے بہتر غم واندوہ میں مرجانے پر ترجیح دیتا ہے۔ وہ موت سے اسی لیے رحم کی بھیک مانگتا ہے۔ ساری دنیا سے ہر تعلق ختم کرلیتا ہے اور سوائے پیمانۂ شراب کے کوئی چیز باوفا نہیں سمجھتا ہے۔

اور پھر وہی دعوائے سخنوری ہے اپنے آپ کو وہ میوہ دار درخت کہتا ہے۔ جس کی آبیاری خضرؑ نے کی ہے اور جس کا پھل دایم و قایم رہے گا یعنی اُس کا کلام تا قیامت زندہ رہے گا۔

کاخ کہن

از جفای چرخ در دل نیست غم چنداں مرا — با تحمل می شود ہر مشکل آساں مرا

---

[1] محمد سرور مولائی شعر معاصر افغانستان، چاپ زر، تہران، ۱۳۵۰ش، ص ۱۶۸-۱۶۹

یادگار عظمتم ای چرخ چوں کاخ کہن گر بہ تعمیرم نمی کوشی مکن ویران مرا
پارۂ آہن چہ دارد ارزش دور از کفت تیغ عریانی بدہ دور سرت جولان مرا
جان بہ تلخی دادن از ناز طبیباں تو شراست رحم کن ای مرگ و فارغ ساز از درمان مرا
باہمہ خلق جہاں قطع علائق کردہ ام کس نمی باشد بجز پیمانہ ہم پیمان مرا
من ہماں نخل برو مندم درین گلشن نوید کابیاری کردہ خضر از چشمۂ حیوان مرا[1]

غرض نوید کا سارا کلام سبک ہندی کا بہترین نمایندہ ہے۔ وہی معشوق، آنکھوں کی مستی، ساقی و مینا کا استعارہ، جنوں کی کار فرمائی اور افلاطون کی عقل کی بے مایگی۔ دشت بے خودی کی عظمت اور پھر خضر کا تعاون او رشراب عشق کی آگ اور شمع محبت سے جل جانے کی آرزو کے بعد ہاتف غیبی کی جانب سے فیض خداوندی اور عالم بالا سے سیراب او رفیضیاب ہونے کی خوشخبری، یہ سب قدما کے کلام کی خصوصیات تھیں جس کا نوید نے نہ صرف تصرف کیا ہے بلکہ انتہائی خوبصورتی اور سخنورانہ کمال کے ساتھ پیش کیا ہے۔

ان کی غزل شراب عشق ذیل میں پیش ہے جس میں یہ ساری خصوصیات بہ حسن و خوبی موجود ہیں۔ وہ فلسفیوں پر طنز کرتا ہے۔ کیوں کہ اُس کی امداد کے لیے پیغمبر جا دداں موجود ہے جو پیروں سے کانٹے نکال دے گا اور وادیٔ ظلمات میں لے جا کر آب حیات پلا کر حیات دوام بخشے گا اور پھر ہر کلام ہر شعر اور ہر لفظ بقول غالب: —

آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں
غالب صریر خامہ نوائے سروش ہے

یہ ادعا غلط نہیں ہے اور نوید کی اسی غزل پر ہم اُن کے ذکر کا خاتمہ بھی کرتے ہیں: —

مستیٔ چشمی کہ امشب می برد از جا مرا
کیست ایں ساقی کہ ریزد بادہ در مینا مرا

---

[1] محمد عثمان صدقی: سیر ادب در افغانستان۔ کابل ۱۳۴۰ ش/۱۹۶۱ء صفحہ ۲۷

گر فلاطون مشرباں از شہر بیرونم کنند
می دہد دشت جنوں در سینہ اش ماوا مرا
آب روی و عزتم دارم بہ دشت بے خودی
خضر با ناخن کشد پیوستہ خار از پا مرا
ای شراب عشق، آتش در وجودم بر فروز
ای محبت شمع آسا سوز سر تا پا مرا
از فراز آسمان ہاتف نویدم می دہد
می رسد پیوستہ فیض از عالم بالا مرا[1]

دہقان

حاجی محمد سرور دہقان فرزند محمد اعظم ساکن دہ پوری واقع چاردہی شہر کابل میں ۱۳۲۲ھ/۱۹۰۳ء میں پیدا ہوئے اور گھریلو مکتب میں پڑھائے گئے اور پندرہ سال کی عمر میں علوم دینی اور ادبیات وغیرہ سے بہرہ یاب ہوئے۔ بقول خستہ، —

"حرفش جذاب و صحبتش گیرا و اشعارش پُر تاثیر افتادہ است دہقان از سال ۱۳۴۱ ہجری باینطرف تجارت قالین اختیار نمودہ فراخو حال در بیع و شرا سلوک خوبی دارد"[2]

دہقان ایک کلاسیکل شاعر ہیں۔ وہ صوفی مشرب اور شیوا بیان غزل سرا ہیں۔ اُن کی ایک غزل اگرچہ بظاہر عاشقانہ ہے مگر حکیمانہ نصائح سے پُر ہے اور وہ تقاضا کرتے ہیں کہ ہم اپنے وقت کے حالات اور تقاضوں کے مطابق خود کو ڈھالیں۔ وہ یوں تو تلمیحاً ایک چیونٹی کے دستر خوان پر حضرت سلیمان کے مدعو ہونے کا قصہ اور پھر ٹڈی کی ران کا حضرت سلیمان کو بطور تحفہ پیش کرنے کا واقعہ ضرور استعمال

---

[1] محمد سرور مولائی۔ شعر معاصر افغانستان۔ چاپ در تہران، ۱۳۵۰ ش / ص ۱۶۵
[2] آواز، شمارہ چہارم، ۲۱ / سرطان ۱۳۶۲ / جولائی ۱۹۸۳ء ص ۳۵

کرتے ہیں اور اسی ضمن میں یہ بتاتے ہیں کہ آج کے انسان کو چاہیئے کہ وہ آج کے ترقی یافتہ تمدن اور ترقی میں جس قدر دلچسپی اور آشنائی پیدا کرے بہتر ہے کیوں کہ آج کی آب و ہوا دوسرے جام اور بام کی خواہاں ہے۔ وہ سلک عاشقی میں خود کو انھیں لوگوں میں سے شمار کرتے ہیں :۔

آنچہ صبح گر از شام دگر می خواہد — طرح دیگر ز تو ایام دیگر می خواہد
ہلہ برخیز کہ از نزد تو جمشید زمان — مطلع صبح دگر جام دیگری خواہد
از تو ای مورچہ طفل سلیمان وطن — تحفہ دیگر و انعام دیگر می خواہد
ہر صبا جانب من بوی دیگری آرد — خبر دیگر و پیغام دیگر می خواہد
مدنی تر بدر اسباب و ہوای امروز — از تو جام دیگر و بام دیگری خواہد
ای شکاری تو ہم امروز بیا دام بدوش — مرغ وحشی تو ہم دام دیگری خواہد
گاہ سعدی و گہی حافظ و گاہی دہقان — عشق ہر روز زما نام دیگر می خواہد[1]

سعدی ہوں یا حافظ یا خود دہقان ان سب سے عشق ایک نئے عنوان کا تقاضا کرتا ہے اور یہی دہقان کا مقصد و مدعا ہے اور یہی عشق دہقان کی ایک اور غزل میں دوسرے انداز سے جلوہ گر ہے :۔

عشق سرکش

باز چشم من چو مجنوں راہ محمل می زند — یا منم دیوانہ یا لیلی ست منزل می زند
عشق سرکش در ضمیر ما اگر تنہا دہ دام — دل چرا در سینہ تو دوا چو بسمل می زند
وصل کوتا جاں دہم گردم خلاص از دین مرگ — من کہ بگذشتم ز سر دلبر چرا دل می زند[2]
دین و دنیا را نہادم بیش ازیں زاہد چرا — پیش ما ایں حرفہای حق و باطل می زند
گردن طالع بلندی گر کند در زیر تیغ — باز دہقاں چشم خود بر چشم قاتل می زند[3]

---

[1] تحفۂ معاصرین سخنور، کابل ۱۳۳۹ / ۱۹۶۰ء صفحہ ۱۰۷

[2] ٭ ٭ ٭ ٭ صفحہ ۱۰۸

[3] آواز، شمارہ چہارم ۳۱ / سرطان / جولائی ۱۹۸۲ء صفحہ ۳۵

اس غزل میں بہت سارے کلمات اور اصطلاحات کا استعمال قدما اور خصوصاً حافظ اور سعدی کا انداز یاد دلاتا ہے۔ صنایع شعری میں تجنیس "دلبر چرا دل میزند" اور دوسری تلمیحات کا مشاہدہ بہ خوبی کیا جا سکتا ہے پھر عامیانہ اصطلاحات "دل زدن" وغیرہ بھی قابل توجہ ہیں:—

دہقان اگر ایک طرف شراب وصال سے مست و سرشار ہیں اور یہاں تک کہ ستاروں کی دنیا مانند شراب خانہ اُن کے دست تصرف میں ہے اور محبوب آسمان کے چاند کے مانند اس کی خانقاہ میں شمع بن کر روشن ہے۔ پھر وہ کیوں نہیں صبح تک غزل خواں رہے۔ دوسرے وہ ابیات میں وہ گریز اختیار کر کے دوست کو نظر انداز کرتا ہے اور خود کلامی میں اپنی گفتار کو "درسفتن" گردانتا ہے۔ یعنی اشعار آبدار لکھتا ہے اور اگرچہ قافلہ سالاری کا دعویدار ہوتا ہے پھر بھی عجز و خاکساری اختیار کرتا ہے اور درویشی اور فقر کا لباس پہنتا ہے۔ کلاہ نمد سر پر ڈالتا ہے اور پھر استغنا اور بے نیازی کی باتیں درمیان میں لاتا ہے اور یہاں تک کہ اپنے سینہ کے چشمہ میں پیدا ہونے والے بلبلوں کو گرداب کے حباب سے تشبیہہ دیتا ہوا اپنی خیمہ گاہ کے گرداگرد حصار بناتا ہوا ظاہر کرتا ہے:—

بیا دمی کہ عجب فرصت گناہ منست	وصال دوست فریدون بارگاہ منست
مستم منور ساقی جہان منور من	شراب خانہ انجم بدست گاہ منست
چہ چارہ گر نکنم تا سحر غزل خوانی	کہ ماہتاب فلک شمع خانقاہ منست
چو من پیالہ بگیرم زنی فغان خیزد	گنہ چہ چارہ کند نالہ عذرخواہ منست
ہزار لولوی ناسفتہ در صدف دارم	امیر قافلہ ام از نمد کلاہ منست

بمثل آبلہ دہقان چشمہ سار خودم
حباب دار بگرداب خیمہ گاہ منست

وہی سعدی اور خصوصاً حافظ کی شراب رندانہ ہے جہاں فریدوں اور جمشید

۱؎ خستہ، معاصرین سخنور، کابل ۱۳۳۹ھ/ ۱۹۶۰ء ص ۱۰۹ — ۱۱۰

کی بارگاہ ہیچ ہے۔ اس لیے کہ دوست کا وصال ان سب چیزوں کو خاطر میں ہی نہیں لاسکتا ہے۔ اسی شراب سے شاعر مست ہے اور اُس کی دنیا اس زمین و آسمان سے زیادہ روشن ہے اور صدف دل آبدار اشعار کے موتی لُٹا رہا ہے۔

عدم تکلف اور بے ضرورت اُلجھاؤ اور آسان الفاظ کا استعمال خراسانی شعراء کے طرز کا خاصہ ہے اور افغانستان کے اکثر دری گو شعراء (تیسرے حصّہ سے مربوط) اس کی پیروی کرتے ہیں اور چوں کہ دہقان بھی اسی گروہ میں سے ہیں۔ تو قدرتی طور پر اُن کی شاعری کا طرز بھی وہی ہے۔ ذیل کی آخری غزل میں انھوں نے شاعری کی طبیعی اور بدیعی صنعتوں کو اعلا و عمدہ قسم کی تشبیہات اور استعارات کے ساتھ استعمال کیا ہے۔ پہلے شعر کے دوسرے مصرعہ "تبخالہ" کا لفظ انتہائی جدت اور ندرت کے ساتھ لایا گیا ہے اور آخری بیت میں بھی اس قدر فن کارانہ انداز میں نظم کیا گیا ہے کہ اُس کے طرح طرح کے معانی اور تعبیریں پیدا کی جاسکتی ہیں اور دہقان کو لالہ کاری سے نسبت دی جاسکتی ہے اور خود "لالہ کاری" "زرع لالہ" سے نسبت رکھتی ہے اور چوں کہ لالہ کا دل داغدار (نشان والا) ہوتا ہے، داغوں کو اپنے دل میں رکھنا اور اسی طرح سینہ کے اندر گل رکھنا محاورہ کس قدر قرین قیاس ہے یعنی گل اپنے اصل مفہوم میں اور اُسے داغوں کا نشان قرار دینا بھی خوب صورتی سے استعمال ہوا ہے اور شعرا کے یہاں بکثرت مستعمل ہے:-

اس غزل کے ساتھ ہی دہقان کی شاعری کا ذکر بھی ختم ہوتا ہے:-

بگرداب آشیان دارم و آبم می توان گفتن
من آں تبخالہ و موجم حبابم می توان گفتن

مرا پاس محبت ہم نشین شعلہ کرد آخر
نمک پروردۂ داغم کبابم می توان گفتن

لے ح۔ نعمت اللہ لیف و رحیم ہاشم، استادان شعر معاصر افغان۔ طبع مطبع مرکزی وزارت مدنیت، تاجیکستان ص ۱۶۲

صفا شو تا سراپا جلوہ گاہ حسن او گردی
اگر آئینہ گشتم آفتابم می توان گفتن

زبس با لالہ کاری الفتم دارم می دہقان
درون سینہ گل دارم گلابم می توان گفتن

صفا

محمد ابراہیم صفا ۱۲۸۵ ش/۱۹۰۶ء میں کابل میں متولد ہوئے۔ علوم ادبی عربی اور معقولات جوانی کے ایام میں پڑھے۔ ایک زمانہ میں جب وہ کراچی گئے تو وہاں اُردو اور انگریزی زبان سیکھی۔ وہ عربی اور فرانسیسی بقدر ضرورت جانتے ہیں۔ کراچی سے لوٹنے کے بعد وہ حکومت کے کئی محکموں میں بطور افسر کام کرتے رہے اور کچھ سال تک وزارت مواصلات و وزارت خارجہ میں رہے اور یہاں تک کہ ۱۳۱۱ میں جیل بھیج دیئے گئے۔ جب وہ ۱۳۲۵ میں جیل سے باہر آئے تو وزارت اقتصاد اور وزارت مطبوعات میں کام کرنے لگے اور پھر روزنامہ "اصلاح" کے مدیر ہو گئے۔

صفا صاحب تالیف و ترجمہ میں فلسفہ سے شغف رکھتے ہیں اور اس مضمون میں کئی کتابیں لکھی اور ترجمہ کی ہیں اور منطق پر بھی ایک کتاب ترجمہ اور تالیف ہے۔ ان کے اشعار کا مجموعہ "نوائے کہسار" کے نام سے شایع ہو گیا ہے[1]

صفا والا قدر شاعر اور عمدہ مصنف ہیں۔ اُن کے علمی و ادبی کارنامے اُن کے علم و فضل کی وسعت پر دال ہیں[2]

صفا کی ایک نظم "لالہ آزاد" اپنی سادگی، روانی، بے نیازی اور آزادی کے جذبے سے بھرپور ہونے کی بنا پر شاعری کے دلدادہ لوگوں کی توجہ کا باعث

---

[1] خستہ۔ معاصرین سخنور، کابل ۱۳۳۹/ ۱۹۶۰ء ص ۲۵۶

ہوئی ہے اور کافی مشہور ہوئی ہے۔ یہ نظم اس بنا پر بھی زبان زد ہوگئی ہے کیوں کہ وہ افغانوں کی آزاد فطرت کے موافق ہے اور گویا لالہ کو استعارہ کے طور پر اس دیار کے لوگوں کے لیے استعمال کیا ہے۔ شاعر لالہ کو اور زیادہ رنگین بناتا ہے اور اپنی نازک خیالی اور شاعرانہ احساس سے اُسے سرمست اور بے پروا بنایا ہے اور اُسے آزادی کا جذبہ بخشتا ہے:-

زبانِ لالہ

من لالۂ آزادم خود رویم و خود بویم
در دشت مکاں دارم ہم فطرت آہویم
از نم بارانست فارغ ز لب جویم
تنگ است محیط آنجا در باغ نمی رویم

من لالۂ آزادم خود رویم و خود بویم

از خون رگ خویش است گر رنگ برخ دارم
مشاطہ نمی خواہد زیبائی رخسارم
بر ساقۂ خود ثابت فارغ ز مددگارم
نی در طلب یارم نی در غم اغیارم

من لالۂ آزادم خود رویم و خود بویم

ہر صبح نسیم آید بر قصد طواف من
آہو برگانرا چشم از دیدن من روشن
سوزندہ چراغ ہستم در گوشۂ این دامن
پروانہ بسی دارم سرگشتہ بہ پیرامن

من لالۂ آزادم خود رویم و خود بویم

از جلوۂ سبز و سرخ طرح چمنی ریزم
گشتہ است نخن صحرا از بوی دلاویزم

خم می شوم از مستی ہر لحظہ و می خیزم
سر تا بقدم نازم پا تا بسر انگیـــزم
من لالۂ آزادم خود رویم و خود بویم

جوش می و مستی بین در چہرہ گلگونم
داغ است نشان عشق در سینہ پر خونم
آزادہ و سر مستم خو کردہ بہا مونم
راندہ است جنون عشق از شہر بہ افسونم
من لالۂ آزادم خود رویم و خود بویم

از سعی کسی منت بر خود نپذیرم من
قید چمن و گلشن بر خویش نگیرم من
بر فطرت خود نازم وارستہ ضمیرم من
آزادہ برون آیم آزادہ بمیرم من
من لالۂ آزادم خود رویم و خود بویم

لالہ کی یہ آزادی، خود بینی، خود سری، خود اعتمادی، رنگینی، حسن، بو، سرمستی ناز، فخر، غرور اور صحرا، کوہ، دامن، دشت وادی، ہر جگہ اس کا وجود حسن و عشق کی آمیزش سے ہے۔ وہ بے نیاز اور بے پرواہ ہے۔ اپنی خودروئی اور آزادی پر ایسے ہی فخر کرتا ہے جیسے ایک غیور انسان، ملک یا قوم اپنی قوت بازو پر نازاں ہوتی ہے۔ صفا کی یہ نظم روانی، سادگی، پرکاری، رنگینی اور تاثر کا جواب نہیں رکھتی ہے۔

صفا نیچرل شاعری اور قدرتی منظر کشی میں مہارت رکھتے ہیں۔ چنانچہ ایک اور بہاریہ نظم میں وہ بہار کی پر رونق آمد اور سبزہ و گل کی خوبصورت منظر کشی کرتے ہیں اور اسی بہانے اپنے آپ یا لوگوں کو حرکت اور بیداری کی دعوت دیتے ہیں اور زندگی کے مقاصد کا اظہار کرتے ہیں۔

یہ سب استعارے اور کنائے کے پیرائے میں اس لیے بیان کیا کہ اس وقت
کوئی شخص سیاسی معاملات پر اعلانیہ اور براہ راست اظہار رائے نہیں کرسکتا
تھا چنانچہ دیگر شعرا کی مانند صفا نے بھی بالواسطہ کہنے کے بجائے صبا، بہار اور
دوسرے لوازم کو ذریعہ بنایا: —

بار دیگر فصل بہاراں رسید　　　موسم سرو و گل و ریحاں رسید
بلبل شوریدہ بہ بستاں رسید　　　مست و پرافشاں و غزل خواں رسید
غنچۂ من ای دلک تنگ من باز شو
رو بچمن نالۂ بلبل شنو
دشت و دمن خرم و شاداں نگر　　　ہر طرف از لالہ چراغاں نگر
خیل غزالاں بہ بیاباں نگر　　　سرخوش و آزاد و خراماں نگر
ای دل درماندہ بی تاب و تب چند خواب
خیز و زمانی سوی صحرا شتاب
بر سر کہسار نگر ابر تر　　　در زدہ از رعد بجان شور و شر
روی زمین شستہ بہ آب مطر　　　سیل برآوردہ ز ہر گوشہ سر
ای دل افسردہ تو ہم یادگیر مستی ئی
خیز و نشانی طلب از ہستی ئی [1]

صفا کی پختہ کلامی اور بامعنی شاعری کے بارے میں بہت کچھ لکھا جا سکتا
ہے لیکن اب ان کی ایک منتخب غزل کے ساتھ ان سے متعلق گفتگو ختم کی جا
رہی ہے۔ اس غزل میں شاعر شراب کا اشتیاق ظاہر کرتا ہے اور سجادہ
دستار تک فروخت کر کے شراب نوشی کرنا چاہتا ہے اور اس کی حرارت سے
اپنا سرد دل گرماتا ہے اور کہتا ہے کہ جب تک سینۂ آسا شعلوں پر جلایا نہ جائے
اس کی آواز سنائی نہیں دیتی ہے۔ وہ دعوا کرتا ہے کہ اس کی شاعری کا کوئی مصرعہ
عشق کی نوا سے خالی نہیں ہے اس لیے آئیے اس پختہ اور خوب صورت غزل

---

[1] محمد عثمان صدقی: سیر ادب در افغانستان۔ کابل ۱۳۴۴ھ ص ۳۲

پرسرد ھنیں :—

میروم پیر مغاں را حلقہ بر در ریز نم
قیمت سجادہ و دستار ساغر میز نم

سرد شد از زندگی دل تا کجا پرہیز خشک
شعلۂ بر جان خویش از آتش تر میز نم

صید معنی را پر پرواز دیگر لازم است
نیست شاہین در ہوا ہائیکہ من پر میز نم

رفتہ طوفاں پیش مستی ہائے دل از خویشتن
آب بر روئی محیط از موج گوہر میز نم

نغمۂ بی سوختن از لب نمی خیزد مرا
نالہ دارم چوں سپند اما بہ مجمر میز نم

بی نوائی عشق نبود مصرعی از شعر من
تا کند تاثیر یک رہ را مکرر میز نم

دیگران را نیست سیر آہنگ ، ساز زندگی
من صفا از ہر کس ایں پردہ خوشتر میز نم [1]

حاذقہ

حاذقہ کے والد کا نام محمد عثمان ہے ۔ وہ ہرات کے کشکک نامی گاؤں میں ۲۹ محرم ۱۳۴۰ھ / ۱۹۲۱ء کو پیدا ہوئے ۔ فارسی ادب اور عربی فقہ کا مطالعہ کیا ۔ وہ نظر محمد منیری کی بیوی ہیں اور باغ دشت میں مقیم ہیں ۔ وہ باذوق خاتون شاعر ہیں ۔ فارسی اور پشتو دونوں زبانوں میں مضمون بھی لکھتی ہیں ۔ خود ان کے شوہر کے بقول ۱۳۳۰ھ / ۱۹۵۱ء تک انھوں نے تقریباً آٹھ عدد رسائل اور

---

[1] محمد عثمان صدقی ۔ سیر ادب در افغانستان کابل ، ۱۳۴۰ ۔ ص ۴۶

کتابیں تصنیف کی ہیں :-

۱- حیات نسوان

۲- ہمکاری بہ ملت

۳- اُصول آزادی نسوان

۴- برگ سبز

۵- مہد آرین در تاریخ ہرات ازدورہ تیموریان تا عصر حاضر

۶- دیوان حاذقہ بہ استقبال پروین اعتصامی

۷- کلیات حاذقہ

۸- و ازدواج مبحث (مبحث ازدواج) بہ زبان پشتو [1]

شروع میں اُن کی شاعری کے نمونے کے لیے اُن کی ایک غزل درج کی جارہی ہے جس میں دوسروں کے ساتھ اخلاق اور نیکی کی تاکید ملتی ہے۔ انسان کو "ہوا، حرص اور ہوس" سے دور رہنے کا مشورہ ہے اچھائی اور دین کے راستہ پر چلنے کی تبلیغ ہے :-

ہوا و حرص و ہوس را بیک کنار انداز

بدوستاں نظر لطف وانکسار انداز

انیس خلق نکو شو، بہ خلق نیکی کن

براہ دیں برو و عقل را بکار انداز

ز نیک و بد شرف و نیکوئی مدار دریغ

جزائی خویش بالطاف کردگار انداز

بہ مردمان نکو خوئی یار باش و انیس

نگاہ لطف بیار نکو شعار انداز

اگر ز خلق نکو حاذقہ نداری بہر

سواد شعر و غزل را بجوئبار انداز [2]

---

[1] محمد علم غواص۔ شعرای معاصر ہرات۔ کلوپ ادبی ہرات۔ ۱۳۳۰ ش/ ۱۹۵۱ء ص ۱۳

[2] " " " " " ص ۱۴

افسوس یہ ہے کہ حاذق کے اشعار دستیاب نہیں ہیں ورنہ ان کے چمنستان شعر سے بہت سے رنگین گلاب منتخب کیے جا سکتے تھے اور اُن کی طبع رواں کے سمندر سے نایاب گہر کے نمونے پیش کیے جا سکتے تھے۔ ان کے اشعار کی دلکشی، سادگی، روانی اور پیغام میں، خانم پروین اعتصامی کی شاعری کا نمایاں اور کامیاب ترین اثر جھلکتا ہے۔

صوفی عشقری [1]

صوفی غلام نبی عشقری، ولد محمد رحیم ۱۳۱۲ق میں کابل کے نواحی علاقہ چہلتن پغمان میں پیدا ہوئے۔ مرکز کی جانب سے بہت سے ابتدائی اور صنائع سے متعلق مکاتب میں عشقری بطور معلم کام کرتے رہے اور بعد میں ذاتی دکانداری کا پیشہ اختیار کر لیا [2]

عشقری اپنے نام کے بارہ میں اس طرح کہتے ہیں:۔

شنو اول تو از نام و نشانم ۔۔۔ کہ واقف گردی زیں شرح و بیانم
غلام نبی بود در اصل نامم ۔۔۔ کہ در بارانۂ کابل مقامم [3]

عشقری کا خاندان اس علاقہ کا مشہور تاجر گھرانہ تھا جو مدتوں تجارتی سلسلہ میں بخارا سے امرتسر تک کاروبار کرتا تھا۔ جیسا کہ وہ خود کہتے ہیں:۔

تجارت پیشہ ما بود چندی ۔۔۔ بہر جا بود از ما بار بندی
تمام ہستی ما رفت برباد ۔۔۔ نصیبم بے نوائی بود او داد [4]

---

[1] موصوف کے نام اور کلام کی شرح بیان کرتے وقت نیلاب رحیمی نے اُن کا تخلص عشقری لکھا ہے اور مولانا خستہ نے معاصرین سخنور میں الف سے اشقری لکھا ہے۔

[2] خستہ معاصرین سخنور، ۱۳۳۹ش، کابل۔ ص ۲۶

[3] نیلاب رحیمی۔ شرح حال و تحلیل اشعار صوفی عشقری۔ کابل، ۱۳۵۷/۱۹۷۸ء ص ۵

[4] 〃 〃 〃 〃 〃

عشقری اپنے آپ کو بخارا کے لوگوں میں شمار کرتے تھے اور ایک دوسری جگہ خود کو " دہ بید سمرقند " کا رہنے والا بتاتے ہیں۔ لیکن اُن کے بخارائی ہونے کا ثبوت ذیل کے شعر میں مل جاتا ہے۔

شہر تم باشد اگرچہ عشقری کابلی   از بخارائی شریف آباواجداد من است[1]

عشقری دوسروں کی زبان سے اپنے آپ کو تیمور لنگ کے سلسلے سے نسبت دیتے ہیں لیکن اس پر یقین کامل نہیں رکھتے ہیں۔ چنانچہ کہتے ہیں:-

این سخن از مو سفیدان جہاں بشنیدہ ام   عشقری ہم در نژاد خویش نسل تیمور است[2]

شاعر کے تخلص کے انتخاب کے بارے میں یہ خاص بات قابل ذکر ہے کہ وہ امیر حمزہ صاحب قراں کی داستان اور اُن کے جہاد کے مطالعہ کے بعد اُن کے عقیدت مند ہو گئے چنانچہ اپنے تخلص کو امیر حمزہ کے گھوڑے اشقر کے نام پر انتخاب کیا اور ی کا اضافہ کر کے اپنا تخلص اشقری رکھ لیا۔ چنانچہ امیر حمزہ اور اُن کے گھوڑے سے اپنی ارادتمندی کا اظہار یوں کیا ہے:-

گر رسم با حمزہ صاحب قراں   سر فدائی پائی اشقر می کنم[3]

اپنی شاعری کے آئینہ میں عشقری ایک عیار اور عاشق پیشہ شخص نظر آتے ہیں اور اپنے اشعار کو عامیانہ زبان میں لکھا ہے۔ ذیل میں اُن کی ایک غزل کے دو مصرعے اُن کے کلام کی سادگی اور عامیانہ ہونے کی دلیل ہیں اور ضمناً اپنے تخلص کے بارہ میں بھی اشارہ کیا ہے:-

عشق اگر در کار و بار این جہانم می گذاشت   کرہ مہتاب، رفتن پیش من نسوار بود

در دمن امروز از دیروز افزوں تر شدہ   دار ویم فرمود دکتوری کہ آں بیطار بود[4]

جب شاعر نے یہ اشعار اپنے دوست صادق اور ہم جلیس شایق جمال مرحوم

---

[1] نیلاب رحیمی۔ شرح حال و تحلیل اشعار صوفی عشقری، کابل، ۱۳۵۷/ ۱۹۷۸ء   ص ۵

[2] " " " " "

[3] " " " " صفحہ ۱۰

[4] " " " " "

کو سنائے تو اپنی ظرافت طبع کی بنا پر انھوں نے ہنستے ہوئے کہا "صوفی صاحب اس میں بیچارے ڈاکٹر کا کیا گناہ ہے، ڈاکٹر تو معمولاً اپنے مریض سے اُس کا اسم شریف پوچھتا ہے؟ جب آپ سے آپ کا نام پوچھا، آپ نے جواب دیا، عشقری، لہٰذا اس نے گھوڑے کی دوا آپ کے لیے لکھ دی" [1]

قبل اس کے کہ عشقری کی شاعری کا مفصل جائزہ لیا جائے بہتر یہ ہوگا کہ گذشتہ مذکورہ بالا اشعار کے بارہ میں کچھ اور باتیں ہو جائیں۔ یہ عاشق پیشہ شاعر کہتا ہے کہ اگر عشق اُس کی زندگی کے کاموں میں مانع نہ ہوتا تو خلا اور سورج کی دنیا میں پہنچ جانا اُس کے لیے آسان تھا لیکن یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ افغانستانی لوگ کسی کام کی سادگی اور آسانی کی نشانی کے لیے "نسوار" کا کلمہ استعمال کرتے ہیں۔ مثلاً اگر کوئی یہ کہتا ہے کہ میرے لیے یہ کام بہت آسان ہے تو وہ یہ کہے گا —

"این کار نسوار من نیست"

جب نسوار کی بات ہوئی تو بے جا نہ ہوگا کہ یہ تذکرہ بھی ہو جائے کہ جب ہمارے شاعر نے اپنی آبائی ملکیت اور دولت سے ہاتھ دھو لیا تو بالآخر قسمت اُس کو دکانداری اور نسوار فروشی تک لے گئی جو بہت ادنا شغل شمار کیا جاتا ہے۔ چنانچہ شاعر اس بارہ میں خود کہتا ہے: —

از گردش زمانہ واد بار روزگار — سوداگر خریطۂ نسوار ہم شدم [2]

چونکہ شاعر کی زندگی کا بیشتر حصہ دکانداری میں گزرا ہے اس لیے دکانداری اور اس پیشہ کے بارہ میں بہت سے اشعار کہتے ہیں: —

شدہ عمر یکہ سودایم بہ یوسف طلعتی باشد — سر بازار اگر دکان نمی کردم چہ می کردم

گدائے عشق جاناں مستقل آئینہ ام گردید — بہ رویش تولیش را حیران نمی کردم چہ می کردم [3]

عشقری صابون مشک و روغن کاکل فروش — دور کن بہر خدا این دبلی نسوار را [4]

---

[1] نیلاب رحیمی۔ شرح حال و تحلیل اشعار صوفی عشقری، کابل، ۱۳۵۰ ش ص ۱۰

[2] 〃 〃 〃

[3] 〃 〃 〃

[4] 〃 〃 〃

یہ ہے حقیقت اور ادنیٰ دکانداری اور لاحاصل نسوار فروشی شاعر کے دل میں خلش بن کر چبھتی ہے اور وہ اس پیشہ کو چھوڑ دینے کی فکر میں غلطاں و پیچاں یہ کہتا ہے:—

این دکان بی مطاع آخر سرت را میخورد   عشقری برخیز و بردار این کمائی خوب نیست[1]

اور یا پھر یہ شعر:—

اجناس دیگری اگرت نیست عشقری   خاشاک و خاک بر دہن این دکان بریز[2]

عشقری کو سیر و سیاحت سے زیادہ دلچسپی ہے اور افغانستان میں اکثر قابل دید مقامات کے علاوہ جس میں بلخ، بدخشاں اور ہرات قابل ذکر ہیں شاعر نے ۱۳۱۰ش/۱۹۲۱ء میں ہندستان کا سفر بھی کیا اور اپنی تین مہینے کی مسافرت میں اجمیر، پشاور، امرتسر وغیرہ میں وہاں کے مشایخ اور اولیا کے مزارات کی زیارت سے مشرف ہوئے اور اپنی مسافرت کی ابتدا کے بارہ میں یہ شعر کہا:—

آرزویم بود کہ در حج روم   عازم بنگالہ شدم حیف حیف[3]

اور جب افغانستان کے اندر بدخشاں کی طرف جا رہے تھے تو یہ کہا تھا:—

دارد اندک نسبتی با لعل خوبان لعل او   زاں سبب میل دلم سوی بدخشاں بودہ است[4]

عشقری آرزوی لعل بدخشاں دارد   میرود جانب درواز خدا خیر کند[5]

یہ بتا دینا ضروری ہے کہ درواز بدخشاں کا ایک محلہ ہے اور عشقری وہاں اقامت کے وقت اس جگہ کے ایک شاعر اولیا حسین مغموم سے ملاقات اور دوستی کرتے ہیں۔ مولانا مغموم کے اشعار بخارا کے بادشاہ کے دربار میں پڑھے جاتے

---

[1] نیلاب رحیمی - شرح حال و تحلیل اشعار صوفی عشقری کابل، ۱۳۵۰ش ص ۶۳-۶۴

[2] 〃 〃 〃 〃 〃 ص ۹۶

[3] 〃 〃 〃 〃 〃 〃

[4] 〃 〃 〃 〃 〃 〃

[5] 〃 〃 〃 〃 〃 〃

تھے۔ اُن کی شہرت بخارا شہر میں اس مسدس کی وجہ سے اور زیادہ ہو گئی تھی۔ مسدس ذیل میں درج ہے:۔

ماہ ارمنی زادہ یک دمی مدارا کن   یا بیا مسلمان شو یا مرا نصارا کن [1]

صوفی عشقری کے دوستوں نے اُن سے تقاضا کیا کہ وہ اسی قسم کا دوسرا مسدس ترتیب دیں چنانچہ وہ دوسرا مسدس اس طرح ہے:۔

ای بت فرنگ آئین رحم بر دل ما کن   ای طبیم بخاک و خوں حال من تماشا کن
یا رضای خود دی جویا بگفته ما کن   شوخ ارمنی زادہ یک دمی مدارا کن [2]
یا بیا مسلمان شو یا مرا نصارا کن

یہ عاشق پیشہ شاعر اور مرد عارف ملک کے مختلف علاقوں کی سیر و تفریح کے دوران اُس دیار کے حسینوں کے حسن سے ادبی اور شعری لطف لیے بغیر نہ رہ سکا اور یوں گویا ہوا:۔

دلم آزردہ از خوبان کابل   رضا مندا از بتانِ قندھارم [3]

لیکن ہرات میں خود اُس شہر اور خصوصاً تخت ظفر کے مقام نے اُس کی توجہ کو اپنی طرف منعطف کر لیا ہے۔ چنانچہ چند ابیات ملاحظہ ہوں:۔

دفعتہ بودم ای عزیزاں بر سر تخت ظفر
بجانب شہر ہرات دو ستعش کردم نظر
عالم نور و جہانی فیض دیدم موجزن
کوہ و دشت و خاک و سنگش نیست خالی از اثر
بس سیاحت ہا نمودم، سیر کردم عالمی
من ندیدم این چنین آب و ہوائی خوب تر
یک دو بیتی عشقری در وصف آن گفت و گذشت
گر از و باور نداری رو بچشم خود نگر [4]

---

[1] نیلاب رحیمی۔ شرح حال و تحلیل اشعار صوفی عشقری۔ کابل، ۱۳۵۷ش ص ۶۷
[2] " " " " " ص ۶۷ — ۶۸
[3] " " " " ص ۔
[4] " " " "

عشقری واقعتاً صوفی اور مفلس و قلاش تھے حتی خنگ دست بھی ۔ یہ ممکن نہ تھا کہ ان چیزوں اور پریشانیوں کا اظہار نہ ہو یہ غزل اُن کے حالات کا آئینہ ہے:۔

منم کہ سایہ من فرش بوریائی من است	خرابہ ہائی جہان جملگی سرای من است
نشد بہ ہیچ شفاخانہ علاج پذیر	جہانیان تجل ازدرد بے دوائی منست
بہا اگر ہمش مفت ہم کسی نخرد	ز چوک کہنہ فروشی تجل قبائی منست
دم توش از طلبی رنجہ کن قدم سویم	کہ راحت دو جہان فرش بوریائی منست
بہیچ در بگدای نرفتہ ام گاہی	بجز خدا کہ درش مرجع گدای منست
من از کجا اثر نور معرفت یابم	کہ نان بورۂ ہر صبح ناشتای منست[1]
مہی ز گوشہ بامی بہ عشقری می گفت	کہ نقد جان عزیز تو رونمائی منست

جیسا کہ عرض کیا گیا کہ عشقری کے شاعرانہ مفہوم کو سمجھنے میں مشکل پیش نہیں آتی ہے کیوں کہ شاعر عوام کے ساتھ رہا ہے، ان کے درمیان زندگی گذاری ہے اور انھیں کی زبان میں گفتگو کرتا تھا اور اس کے باوجود جب اپنے تخت پر کوئی بچھونا نہیں پاتا ہے تو اپنے سایہ کو ہی فرش قرار دیتا ہے اور چوں کہ گھر اور قیامگاہ بھی نہیں رکھتا ہے ۔ اس لیے سارے جہاں کے ویرانوں کو اپنی منزل قرار دیتا ہے ۔ اپنی بیماری کا شاکی ہے اور اس کی قبا اس قدر پرانی اور گھس چکی ہے کہ مفت کا بھی خریدار نہیں ملتا ہے ۔ پھر بھی اپنے بوریے کو لذت بخش اور آرام دہ کہتا ہے اور وہ سوائے خدائے بزرگ و برتر کے کسی کے در کا بھکاری نہیں بنا ہے ۔ وہ اپنے آپ کو قصوروار اور ملامتی گردانتا ہے اور کہتا ہے کہ چونکہ ہر صبح روٹی کا ایک جوڑا بطور ناشتہ کھاتا ہے تو پھر کس طرح نور معرفت کے فیض سے فیضیاب ہو سکتا ہے ۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ افغانستان میں یکنان جوڑہ ئی دو خمیری روٹیوں کو ملا کر بنتا ہے اور اس کی ایک روٹی بنائی جاتی ہے ۔

---

[1] نیلاب رحیمی ۔ بیاد صوفی عشقری ۔ ژوندون شمارہ ۱۴۰۵، ۱۳۵۹ ش ص ۱۹

شاعر افغانی کا اپنی پرانی قبا کی طرف اشارہ دراصل ایرانی شاعر "افراشتہ" کے "پالتو چہاردہ سالہ اش" نظم کی جانب ہے۔ دونوں میں بڑی حد تک مماثلت ہے۔ چنانچہ مقابلہ کے لیے چند اشعار ملاحظہ ہوں :۔

پالتو چہاردہ سالہ

ای چہاردہ سالہ پالتو من ای رفتہ سرآستین و دامن
ہرچند کہ رنگ و رو نداری وارفتہ ای والتو نداری
ای رفتہ بناز و آمدہ باز صد بار د گردکان دراز
خواہم ز تو از طریق یاری امسال مرا نگہ بداری
این بہمن ودی مرو تواز دست
تا سال دگر خدا بزرگ است[1]

عشقری کو یہ سب گوارا تھا مگر ۱۳۳۵ ش میں اُن کے اکلوتے جواں سال بیٹے کی موت نے اُن کے سینہ کو داغ داغ کردیا۔ یہ قدرتی واقعہ اُن پر پہاڑ بن کر ٹوٹا اور سالہا سال کے گزر جانے کے بعد بھی باپ کے سینہ سے یہ کانٹا نہ نکل سکا۔ چنانچہ یہ شخص غزل، مرثیہ کے تمام خصائص کی آئینہ دار ہے :۔

اگرچہ چندیں سال شد از مرگ فرزندم فراموشم نگردیدست یاد قدو بالایش[2]

طویل مرثیہ کا ہر مصرعہ باپ کے شکستہ دل کی حکایت ہے۔ اپنے جوان بیٹے کے غم میں یہ شعری اظہار ہر قسم کے ابہام اور پیچیدگی سے خالی ہے۔ ہاں حنا کا پاش پاش ہونا، شب طوی" گل نشدن داغ" اور آتش بہ معنی تازہ جیسے محاوروں اور کلمات کا استعمال وہی سمجھ سکتا ہے جو افغانستان کی مقامی اور عامیانہ زبان پر قدرت رکھتا ہو :۔

---

[1] دکتر منیب الرحمان۔ برگزیدہ شعر فارسی معاصر۔ ج۔۱۔ ادارہ علوم اسلامیہ علی گڑھ ۱۹۵۸ء ص ۱۲۳

[2] نیلاب رحیمی۔ شرح حال و تحلیل اشعار صوفی عشقری ۱۳۵۷ ش/ ۱۹۵۸ء کابل ص ۴۳

گرچہ رفتی ۔ درنظر روی تو میاید ہنوز — درمشام جان من بوی تو میاید ہنوز
پورہ میدانم کہ جسم نازنینت خاک شد — درخیالم چشم جادوی تو میاید ہنوز
کوزہ ہا از خاک تو کوزہ گراں دانم کہ ساخت — یاد من لعل سخن گوئی تو میاید ہنوز
کاکل عنبرفشانت ریخت در بین لحد — حلقہ حلقہ درنظر موئی تو میاید ہنوز
پنجہ خطاط تو با خاک یکساں گشت و ریخت — درگمانم نامہ از سوی تو میاید ہنوز
چوں حنا شد پاش پاش و ریخت دست و پای تو — درنظر برق شب لوی — تو میاید ہنوز
ماہ رویت را بزیر خاک مار و مور خورد — پیش چشم تیغ ابروی تو میاید ہنوز
گرچہ از ناز و نیاز ما و تو عمری گذشت — یاد من از گرمی خوی تو میاید ہنوز
گل نگشتہ داغ توای نور چشم — عشقری — ہر نفس دل درھیاہوی تو میاید ہنوز

عشقری کی یہی وہ خصوصیات تھیں جن کی قدر و منزلت وقت کے بہت سے معروف شعرا اور افغانستان کی ادبی شخصیات نے کیں اور وقتاً فوقتاً اُس کا اظہار بھی کیا ۔ ان میں ملک الشعرا بیتاب، ملک الشعرا قاری عبداللہ، اُستاد غلام محمد نوید اور پشتو اور دری دونوں زبانوں کے شاعر بھائی جان، جو خود عشقری کے مصاحبین میں سے رہے ہیں، نے عشقری اور اُن کی شاعری کے بارے میں اپنی عقیدت اور رائے کا اظہار کیا ہے ۔

استاد غلام محمد نوید کہتے ہیں :۔

"اگر آدم از واقعیت نگذرد باید صادقانہ اعتراف کنیم کہ بعض اشعار صوفی از بزرگ ترین شعرای معاصر افغانستان بہتر است، دیگر استغنائی ایں مرد نیز از پہلو ہائی طرف علاقہ من است کہ مقام او را در نظر ما بالا بردہ است" .... [2]

اور اس صوفی منش اور درویش صفت شاعر صوفی عشقری کا اپنا شعر اس کی بے نیازی

---

[1] نیلاب رحیمی ۔ شرح حال و تحلیل اشعار صوفی عشقری، ۵ حوت ۱۹۵۸ء کابل صـ؟
[2] ″ ″ ″ ″ ″
[3] ″ ″ ″ ″ صـ۸۸

اور استغنا کا بہترین نمونہ ہے :—

ما حکمران مملکت بے نوائی ایم
این بوریائی فقر بود پایتخت ما [1]

مجوبہ

مجوبہ کا نام صفورا اور تخلص مجوبہ ہے۔ اُن کے والد منشی ابوالقاسم ایک مشہور آدمی تھے۔ مجوبہ — بادغیس کے مشہور قصبہ میں ۱۲۸۳ش / ۱۹۰۴ء میں پیدا ہوئیں۔ ابتدائی تعلیم اپنے والد ماجد سے حاصل کی اور سالہا سال ہو گئے کہ شہر ہرات میں زندگی گزار رہی ہیں۔

مجوبہ بہت اعلا مذاق کی حامل ہیں اور اُن کا یہ مذاق اُن کی شاعری میں بہ حسن و خوبی موجود ہے۔ ان کا ایک مکمل دیوان ہے اور اُن کے کلام کے نمونے اکثر و بیشتر ہرات کے رسائل اور اخبارات کی زینت بنتے رہے ہیں۔ اُن کی ایک غزل نمونہ کے طور پر ذیل میں درج ہے :—

در غریبی ہر نماز شام گریانم چو شمع	ز آتش دوری و مہجوری گدازانم چو شمع
دود سودا این چنین کاندر سرم پیچیدہ است	ز آتش غم خرمن ہستی بسوزانم چو شمع
روشنی طبع ما را تیرہ بختی بہرہ است	پیش پای خویش روشن کردہ نتوانم چو شمع
در شب دیجور من طالع شود ای بدر منیر	گر منور می کنی شام غریبانم چو شمع
غرق آب دیدہ باشد جیب دامانم ہنوز	آتش دل می کشد سر از گریبانم چو شمع

گر ز بستان وطن مجوبہ آید یک نسیم
صبح دم جان را بہ بوی او برافشانم چو شمع [2]

چونکہ شاعرہ مجوبہ نے اس عالم رنگ و بو میں ۵۵ سال قبل قدم رکھا تھا اور اُس زمانہ میں جب کہ افغانستان میں عورتوں اور بچوں کے مدارس نہیں تھے، اس لیے

---

[1] غلام حیدر یقین۔ شرح حال و تحلیل اشعار صوفی عشقری۔ کابل، ۱۳۵۵ش ص ۱۵

[2] محمد علم غواص۔ شعرای معاصر ہرات۔ کلوپ ادبی ہرات۔ ۱۳۳۰ / ۱۹۵۱ء ص ۱۸ – ۱۷

اپنے والد کے پاس رہ کر کسب کمال کیا تھا اور اپنی شاعری میں مردوں کی مانند غزل سرائی سے زیادہ دلچسپی دکھائی ہے۔ یقیناً مجوبہ کی اس کوشش اور جرأت کی داد دینی چاہیئے کیونکہ اس غزل میں اُس کی گہرائی اور گیرائی کے ساتھ ساتھ وہ افغانستان میں عورتوں کے طبقہ کی محرومی پر انتہائی شاعرانہ پیرایہ میں رنج و غم کی وضاحت کرتی ہیں۔ وہ خود اپنی روشنی طبع کے باوجود اُس کا صحیح استعمال اس لیے نہیں کرسکتی ہیں۔ کہ ملک میں طبقہ نسواں کو اپنے اور اپنے لوگوں کے لیے کار اُمداد اور فعال ہونے کے مواقع میسر نہیں ہیں۔ چنانچہ اسی غزل کا یہ شعر اس کی زندہ مثال ہے:۔

روشنی طبع ما را تیرہ بختی ہمرہ است
پیش پائے خویش روشن کردہ نتوانم چو شمع[1]

اسی طرح مجوبہ کے اندر شعرا کی مانند وطن دوستی کا درد شدت سے موجود ہے۔ یہاں تک کہ وہ اپنی جائے پیدائش سے دور رہنے کے غم کو بھی شدت سے برداشت کرتی ہیں اگرچہ یہ بات اُن کے لیے آسان نہیں ہے۔ وہ اپنے اشتیاق کو ظاہر کرتی ہوئی کہتی ہیں کہ اگر اُن کے وطن کے بوستان سے چلتی ہوئی باد نسیم کا کوئی جھونکا ادھر آجائے تو وہ اُس کی خوشبو سونگھنے کے لیے وہ شمع کی مانند اپنی جان قربان کرسکتی ہے:۔

گر ز بستان وطن مجوبہ آید یک نسیم
صبح دم جاں را ببوی او برافشانم چو شمع[2]

---

[1] محمد علم غواص۔ شعرای معاصر ہرات۔ کلوپ ادبی ہرات۔ ۱۳۳۰ھ، 1951ء ص ۱۷ ۔ ۱۸

[2] " " " " " " "

باب چہارم

وہ شعرا جو قدیم اور جدید اسلوب میں شعر کہتے ہیں۔

اس باب میں ہم ان شعرا کا ذکر کریں گے جنھوں نے کبھی کلاسیکی انداز میں نغمہ سرائی کی اور کبھی اپنے کلام کو ردیف اور قافیوں کی قید سے بے نیاز رکھا اور جدید اسلوب میں طبع آزمائی کی ہے۔

اس قبیل کے نمایندہ شعرا میں سے ہم مائل ہروی، الہام، فاراتی، لایق، بارق، آرین پور، توفیق اور ابہر کے کلام پر ترتیب کے لحاظ سے بحث اور تنقید کریں گے۔

مائل ہروی

مائل ہروی میر غلام رضا مائل ولد سید قاسم ۱۳۰۰ش/۱۹۲۱ء میں شہر ہرات میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی اور ثانوی تعلیم کے حصول کے بعد وہ ہرات سے کابل آئے، وہاں دارالمعلمین میں داخل ہوئے اور فارغ ہو کر مکاتب فراہ لیسہ ہای جامی اور سلطان ہرات میں معلمی کے فرائض انجام دیے۔ ۱۳۴۰ش/۱۹۶۲ء میں شہری مکاتب کے نگراں اور پھر موسسۂ انیس کے مستقل نشریات کے ڈائرکٹر کے منصبی فرائض انجام دیے۔ ان کی تالیفات میں ترنگ دورنگ، تفکر، راہ دشت۔ مکتب جامی۔ امواج ہرات اور غزلیات کا مجموعہ شامل ہے۔ امواج ہریوا منظوم ہے اور اُن کی مکتب جامی مطبوعاتی انعام کی مستحق قرار پائی ہے۔ انھوں نے مصری ادیب مصطفیٰ امین کی تاریخ تربیت کا ترجمہ عربی سے فارسی میں کیا ہے۔[1]

مائل ایک پرگو اور قادرالکلام شاعر ہیں اور وہ قدیم اصناف سخن پر کامل قدرت رکھنے کے باوجود شعر نو کے مبلغ بھی ہیں۔ وہ دوسرے نئے شعرا کو نئے اسلوب اور تازہ موضوعات پر لکھنے کی تلقین کرتے ہیں۔ لیکن وہ اس کوشش میں خود اپنے تئیں کامیاب نہیں ہوئے

---

[1] خستہ۔ معاصرین سخنور۔ کابل ۲۹ ۱۳ش/ ۱۹۶۰ء ص ۱۴۲

ہیں اور "وزن وقافیہ" کی پابندی سے چھٹکارا نہیں پا سکے ہیں اور نہ ہی زمانہ اور وقت کے تقاضوں سے عہدہ برآ ہو سکے ہیں۔ وہ قدما سے دور بھاگنے کی ترغیب کے باوجود اپنی شاعری میں کوئی نیا پیغام نہیں دے سکے اور نہ ہی معاشرہ سے مربوط کسی قسم کے مسئلہ کو اپنی شاعری کا موضوع بنا سکے۔ اس کی مثال اُن کا مسدس ہے جس میں وہ شعر نو کی دعوت دے رہے ہیں:۔

زمن بشاعر عصر قمر بگو بہ ادب　　کہ شعر توب نہ آن ست کہ شرر زا نیست
بہ خون دل سخن تو لش آب و رنگ بدہ　　اگر ز دل نخورد آب شعر گیرا نیست

مصرعی از قطرۂ خونی بساز
جنگی از ساز قانونی بساز[1]

ز روی قافیہ بگذر اسیر لفظ مباش　　تلاش معنی باریک جاودانی کن
بخاکیاں تو پیامی ز قدسیاں آور　　جہاں تو پُر ز نواہای آسمانی کن

نغمہ را طور دگر جولان بدہ
در تن الفاظ شیو اجان بدہ

نگو ز سبک خراساں وضد طرز عراق　　مپیچ در پی تجنیس وصفت ایہام
بمقتضی زمان شعر را دگر گون ساز　　مباش پیرو اشعار انوری و خیام

ای تو مشتاق نظیری و ظہیر
شعر را یک پردہ بالا تر بگیر[2]

کابل کے شمال میں استالف نام کا ایک سرسبز و شاداب مقام ہے۔ کابل اور گرد و نواح کے اکثر لوگ ہفتہ کے دن کی چھٹیاں گزارنے کے لیے مخصوصاً موسم گرما میں اس فرحت بخش جگہ پر جاتے ہیں۔ شاعر اس پر فضا منظر۔ سبزہ زار ارغوانی پھولوں۔ برف پوش پہاڑوں، جوئباروں، جنگلوں اور بہتے گنگناتے جھرنوں، چہچہاتے پرندوں اور جانفزا مناظر سے مست اور سرشار ہے اور خوب صورت کلیوں اور پھولوں کی مانند اشعار کہتا ہے:۔

---

1. خستہ۔ معاصرین سخنور۔ کابل ۱۳۲۹ ش / ۱۹۶۰ء صفحہ ۱۲۳
2. ایضاً
3. ایضاً　ایضاً　ایضاً　ایضاً

تردید[1]

من دل گرفته ام
از آتش شفق
از کودی فلک
از چهره زمانه سرد سیاه دل
از اشک اختران
از تابش سحر
از شام مرگ باد خموش سیاه کار
از خندهٔ افق
از ابر خیره سر
از جدول طلایی بی تاب صاعقه
از چشم ماهتاب
از شبنم سفید
از سایه های کوه عظیم ستیزه جو
من دل گرفته ام
گر ماه من چو اختر تابنده فلک
بر من کند نگه
گر بشنود دمی
فریاد می صدای دل خونچکان من
گر چشم او نگه بیاموزد از وفا
گر از لبان او
یک باره بشکند بهم افتد طلسم ناز

روزستالف[2]

یک مرغزار خوش - در شیب و در فراز
یک آسمان ابر - یک سایه نیم رنگ
گر مهر پشته را بدهد آذرین فروغ
گر ابر روی سبزه نماید گهر نثار
یک پشته ارغوان - یک کوه برف گیر
یک جویبار مست - یک جنگل غلو
رنگها فتاده بر زیر دامن افق
از نقشهای آن هنر و شعر آشکار
آوای آبشار - دستان مرغکان
آواز شاخسار - پیچیده روی هم
آهنگ جانفزا و طرب زا شود پدید
اندر خیال بسته شود شعر آبدار

---

[1] محمد سرور مولائی، شعر معاصر افغانستان، تهران، ۱۳۵۰/۱۹۷۱ء ص ۱۵۵ - ۱۵۶
[2] محمد عثمان صدقی سیر ادب در افغانستان، کابل ۱۳۴۰/۱۹۶۱ء ص ۴۲

ریزد قدح قدح

تا از دہان او

الفاظ عشق و عاشقی و آتش فروغ

دل میدہد بدہر

دل می دہم بہ ماہ جہانتاب زندگی [1]

ترديد کو پڑھنے کے بعد یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ آیا اس کا شاعر سبک قدیم کا پیرو ہے یا وہ جدید شاعری سے زیادہ دلچسپی رکھتا ہے لیکن اس تردید میں بجائے اس کے کہ وہ اس منظر سے ایک نیا پیغام دیتا، کچھ سبق حاصل کرتا اور لوگوں کو خوش کرتا، وہ روایتی شعرا کی مانند صرف عاشقانہ شکووں اور گلوں کا شکار ہے۔ وہ اس قدر دل گرفتہ ہے کہ صبح کی روشنی، اُفق کی مسکراہٹ، غروب آفتاب، چشم ماہتاب اور نہ ہی شبنم شاداب اور پہاڑ کے سایہ سے کوئی لطف حاصل کرے درحالیکہ اگر جدید شاعر ہوتا تو انھیں سامانوں سے نئی عمارت تعمیر کرلیتا ـــــ وہ تو صرف اس قدر جانتا ہے کہ اگر اُس کا محبوب اس پر مہربان ہو جائے اور عشق و عاشقی کی بات کرے تو وہ بھی "ماہ جہاں تاب زندگی" پر فدا ہوسکتا ہے۔

ان کی ایک اور نظم زورق ہے جس میں شاعر وصال یار میں گزارے ہوئے لمحات سے سرخوش اور شادکام ہے اور دنیا کی ہر شے اُس کے لیے کیف آور اور سرور انگیز ہے کیونکہ محبوب آغوش میں ہے اور پاکیزگی کے ساتھ دل کا راز دل کی دھڑکنوں سے ظاہر کیا جارہا ہے:ـــ

زورق

سیل نور از چشم ماہ تمام — وقت شام

بے دریغ از کوہ گردید سرنگون — سیم گون

---

[1] محمد سرور مولائی۔ شعر معاصر افغانستان۔ تہران، ۱۳۵۰ھ/۱۹۷۱ء ص ۱۵۵ـ۱۵۶

دره ها گر دید چوں دریائی نور — در حضور
دشت شد چوں قلزم سیماب گوں — پر فسوں
من و آن مہ پارہ عشرت قرین — ہم نشین
زورقی بودیم بحر بے کراں — شادمان
رہ سپردیم وادی کوہ و کمر — تا سحر
آرزو ہا بود کشتی بان ما — بی صدا
حرفہائی ما ہمہ روئی نگاہ — آہ آہ

راز ہائی ماہمہ ضربان دل
ای فدای عشق بازی جان و دل[1]

مائل کی اس نظم کے وزن اور وصف کے مانند ایران کے فارسی شاعر رشید یاسمی نے بھی تقریباً اسی قسم کی ایک خوب صورت نظم لکھی ہے جس میں یاد میں "کوئی محبوب" کو "مشکسا" اور اسی کی خاک کو کیمیا اور رنگ گل کو اپنی محبوبہ کا طفیل اور فیض سمجھتا ہے اور مائل کے سارے خوب صورت الفاظ کے جادو کے مقابلہ میں رشید یاسمی کے اشعار پڑھنے سے تعلق رکھتے ہیں :—

باد اگر از جانب مشکوی تست — مشکساست
خاک گر از راہ سر کوی تست — کیمیاست
رنگ گل سرخ و شمیم نسیم — ای ندیم
گر نہ ز رخسار تو و روی تست — از کجاست
خار کہ در دست تو افتد گل است — مقبل است
شیخ کہ دم می زند از آبرو — تا کہ او
دور ز تاثیر دو جادوی تست — پارساست
دل سوی درگاہ تو آورد نیاز — در نماز
روی روان وقت دعا سوی تست — این دعاست

---

[1] خستہ۔ معاصرین۔ شعر معاصرین سخنور کابل ۱۳۳۹/۱۹۶۰ء صہ ۱۷۵

آنچہ بود تنگ تراز آن دہن ... قلب من
وانچہ سیہ فام چو گیسوئی تست ... روز ماست [1]

الہام

محمد رحیم الہام ۸-۱۳۰اھ ش/ ۱۹۲۹ء میں شہر کابل میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی اور ثانوی تعلیم غازی اسکول میں حاصل کی۔ اس کے بعد ادبیات سے ذوق اور دلچسپی رکھنے کی بنا پر دانش کدہ ادبیات کابل میں داخلہ لے کر بی۔ اے۔ کی سند لی اور سالوں تک مجلہ "وژمہ" کے اڈیٹر اور پھر امریکہ جاکر زبان شناسی کا کورس کیا اور واپسی میں اسی کالج میں زبان شناسی کے استاد کی حیثیت سے درس و تدریس کا کام شروع کردیا۔

الہام اگرچہ قدیم ادبیات کے نمایندہ ہیں مگر وہ جدید ادب سے بھی اتنا ہی تعلق رکھتے ہیں اور دونوں ہی میں شاعری کرتے ہیں۔ وہ کئی سال تک افغانستان ریڈیو میں ادبی پروگرام "سرود ہستی" کے پروگرام کے انچارج بھی رہے ہیں اور اس طرح جوانوں اور شعر و ادب کے شیدائی لوگوں کو دری شاعری سے دلچسپی پیدا کرنے میں بڑا اہم کردار انجام دیا ہے۔

الہام نے تصنیف کے میدان میں۔ "دستور زبان دری" نامی کتاب لکھی ہے۔ اُن کے مقالات اور اشعار زیادہ تر ادبی مجلات میں شایع ہوئے ہیں۔ اُن کے اشعار پختہ، موثر اور تاریخی تلمیحات کا مرقع ہوتے ہیں اور افغانستان کے عوام کے رنج و غم اور تمدنی اور تہذیبی مسائل کا عکس ہوتے ہیں۔

اُن کا ایک منظومہ ترجیع بند کی صورت میں "بہار شاعر" کے عنوان سے پیش خدمت ہے جس کو وہ روایتی شاعری قالب سے نکال کر جدید شاعری کے پیرایہ میں ڈھال گئے ہیں۔

---

[1] محمد سرور مولائی۔ برگزیدہ شعر معاصر افغانستان انتشارات نور، تہران ۱۳۵۰/۱۹۷۱ء ص ۸

الہام نے بہار کی آمد پر اس کے خوب صورت مناظر کو گل و بلبل معشوق اور گیت کو مصور کیا ہے لیکن وہ اپنی دنیا کو بے رنگ دیکھتا ہے۔ اُس کی اپنی آواز اُس کے گلے میں گھٹ گئی ہے چنانچہ وہ جنگلی پھولوں، چہچہاتے بلبلوں اور بہار تازہ سے درخواست کرتا ہے کہ وہ "بے ریا محبت" کی مسکراہٹ اُس کے چہرے پر بکھیریں اور اُس کے دل کو خوش کریں :—

بہار شاعر

آندم کہ لالہ ہا چو شہیدان بہ رستخیز
رنگین کفن بر آمدہ محشر بپا کنند
و آندم کہ بلبلان جفا دیدۂ خزان
بر شاخہ ہا بر آمدہ گل را صدا کنند
گویند شد بہار
آندم کہ دلبران گریزندہ از وفا
با عاشقان شوند دگر بارہ در چمن
آن گیسوان بناز بیاراستہ بہ گل
وین۔ نوشکفتہ غنچہ۔ فرو کردہ ریختن
گویند شد بہار
آندم کہ بر دو ساحل دریا کبوتران
پرہائی نازنین بہوس شست و شو کنند
و آں سو، میان موجہ گرداب، خیل قو
عشق گستہ را بہ تغزل رفو کنند
گویند شد بہار

---

۱ محمد سرور مولائی۔ برگزیدہ شعر معاصر افغانستان، انتشارات رز، تہران۔ ۱۳۵۰/۱۹۷۱، ص ۳۱

گویند شد بهار و لیکن مرا چه سود
زیرا که هیچ نغمه نخندد و بکام من
بشکسته اند شاخ گل آرزوی من
اشک است و آه، مونس هر صبح و شام من[1]

من شاعرم ولی غزلم خفته در گلو
چون موج رود - رفته به اعماق رودبار
یا چون شراب کهنه - نهان مانده در سبو
دیوانه وار جوشم و بر خود زنم شرار ......
بشگفت شنبلید و بخندید یاسمن
این هم بهار، مصرع رنگین روزگار
آیا شگفته می شودم غنچه مراد
زین غنچه شگفته وزین خنده بهار
این رنج من به چیست
که هر لفظ من به شعر
خاموش می شود و فریاد می شود
ای غنچه های وحشی و آزاد کهسار (کوهسار)
ای بلبلان نغمه گر و مست و نا قرار
وی نوبهار - ای گل شاداب روزگار
آخر کنید بر رخ من هم تبسمی
باری - ترنمی
کز مهر بی ریا دل من شاد می شود[2]

---

[1] محمد سرور مولائی - برگزیده شعر معاصر افغانستان، انتشارات روز، تهران ۱۳۶۰، ص ۲۴۰
[2] » » » » »

اتنی خوب صورت بہار کو شاعر الہام نے اپنی خوب صورت ذہانت اور اعلا ذوق سے مجسم کیا ہے جس کے سحر سے پڑھنے والا حیرت زدہ ہو جاتا ہے اور اپنے آپ کو بہار تازہ کی رنگینیوں میں کھویا ہوا پاتا ہے۔ لیکن شاعر اپنی بے بضاعتی اور محرومی کا ذکر کر کے ہر پڑھنے والے کو اپنا ہم نوا بھی بنا لیتا ہے۔

اسی طرح کی ایک اور خوب صورت اور سراپا مجسم نظم نقش رواق بامیان بھی الہام کے قوت تخیل، بلند پروازی اور زور بیان کا مکمل نمونہ ہے۔ نادر تشبیہات، انوکھے استعارات کے لباس میں آسمانی سیاروں کا جھرمٹ، رقص درخشندگی اور زہرہ کی چنگ نوازی سماں باندھ دیتی ہے۔ بامیان قدیم کی گڑیاں سوز و ساز کی نازک اور نرم سفیر بنی ہوئی ہیں اور اپنے طرب انگیز نغموں سے راز کے خلوت کدوں کے پردے اٹھا رہی ہیں: یہ راز، یہ سحر اور یہ لطف ملاحظہ ہو ؎

ای خداوند طرب را دختران
آسمان ذوق ما را اختران
یادگار جاودان آریان
لعبتان باستان بامیان
قاصدان نازنین سوز و ساز
پرده برداران خلوت گاه راز

در گلوی تان شگفت آواز بود	تارهای چنگ تان را ساز بود
دیدهٔ بیدار تان ناز آفرین	لب خموش، انگشت ها ساز آفرین
عقده های نغمه ها کلک هنر	باز بگشائید یکبار دگر
زهره کی از دست خویش افگند چنگ	تو چرا داری به ساز خود درنگ
جلوه دارد فره کوستان هنوز	در جبین ملت افغان هنوز
گوشها مان ساز تان را خورست	دل درون سینه ها بازیگر است
چنگ تان بشکست گر تار زمان	من ز تار دل کنم پیوند آن
گرد کلفت گر بر آن بنشسته است	بادهای نی کجا دم بسته است

سینہ ہائی شرح پاکش می کند — پُر فروغ و تابناکش می کند
بازساز زندگی را سر کنید — نغمہ را پر سوز و جاں پرور کنید
تا بلرزد برگ از باد سحر — زخمہ زن بر چنگ ہائی نغمہ گر
فر دیریں بر جبین کوہسار — خیرہ می تابد ز فرطِ انتظار
باستانی زیر و بم آہنگ ہا — خفتہ بر تار است زیر زنگ ہا
ای سرانگشتاں بلرزانید تار — تا کند زنگ خموشی ہا فرار
ذوق ما با سوز و ساز آغشتہ اند — بر رواق بامیاں بنوشتہ اند...[1]

الہام کی یہ خوب صورت نظم مثنوی کی شکل میں ہے۔ اس کی روانی اور سادگی اپنی آپ مثال ہے۔ الہام نے اپنی عادت کے مطابق اس میں بھی اپنے ملک کی تاریخی اور نسلی چیزوں یعنی آریان، بامیان، فرہ کوشاں اور ملت و افغان کا ذکر کر کے ایک طرح قومی افتخار کو نمایاں کیا ہے اور دوسری جانب کی" اور" سینہ ہائی شرحہ" جیسے کلمات کے استعمال سے مولانا روم کی مثنوی معنوی کی جانب اشارہ بھی کیا ہے:-

بشنو از نی چوں حکایت می کند — وز جدائی ہا شکایت می کند
کز نیستاں تا مرا ببریدہ اند — از نفیرم مرد و زن نالیدہ اند
سینہ خواہم شرحہ شرحہ از فراق — تا نمایم شرح درد اشتیاق
ہر کسی کو دور ماند از اصل خویش — باز جوید روزگار وصل خویش[2]

الہام نے ایران کے دوسرے شعرا کی مانند اپنے ملک میں شہنشاہیت کو ختم کرنے اور جمہوری نظام کو دعوت دینے کا ذکر اپنی شاعری میں کیا ہے۔ وہ جمہوری علم کو آزادی، خوشحالی اور مساوات کا نشان سمجھ کر اُسے ہمیشہ سر بلند دیکھنا چاہتے ہیں:—

سرفراز ایں بیرق افغانیاں — یاد تا باشد زمین و آسماں
تا بہ گیتی نام یزداں باشدا — تا بہ دلہا نور ایمان تا بدا

---

[1] ادب، شمارہ اول۔ سال ۱۳۵۴ھ ش، ۱۹۷۵ء صفحہ ۱۵۲—۱۵۳
[2] رضا زادہ شفق۔ تاریخ ادبیات ایران، اردو ترجمہ، ندوۃ المصنفین، دہلی ۱۹۶۹ء صفحہ ۳۶۵

تاکہ در بینندہ نور دیدن است — تاکہ اندر سینہ مہر میہن است
تاکہ انسان را خرد یار یگر است — تاکہ خورشید است وماہ واختر است
تاکہ گرد ماہ بر دور زمین — تاکہ باشد نام مہر و نام کین
تا نہنگان راست در دریا مقام — تاکہ شیران راست در بیشہ کنام
تا بدریا موجہا دارند سیر — تا بہ پہنا بازہا دارند طیر
تا بہ تارماست ساز آرزو — تاکہ در دلہاست سوز جستجو
تا شب و روز است دور آفتاب — تاست پائی رفتن و گردش تاب
بیرق جمہوری افغان بلند — باد تا باشد زمیں اندر روند[1]

یہ نظم جو دعائیہ شکل میں ہے اپنی سادگی، روانی اور شیرینی میں یکتا ہے اور اس کی ترکیبیں انتہائی عام فہم ہیں۔ شاعر کی آرزو یہی ہے کہ جب تک یہ سب کچھ موجود ہے حتیٰ کہ خدا کا وجود ہے اور سینوں میں ایمان ہے۔ یہ علم بلند رہے۔

علامہ اقبال نے اپنے فارسی کلام سے افغانستان اور ایران کی ادبی اور شعری شخصیتوں کو بھی متاثر کیا ہے۔ اُن کی فکر و نظریہ اور پیغام ان شعرا کے لیے مشعل راہ بنا ہے۔ الہام بھی اقبال کی شخصیت اور فکر سے اس قدر متاثر ہیں کہ جب لاہور میں دسمبر ۱۹۷۷ء میں علامہ اقبال کی صد سالہ سالگرہ منائی گئی تو الہام نے اس تقریب میں شرکت کی اور علامہ اقبال نے افغانستان کی مسافرت کے دوران اپنی جو نظم "مسافر" کے نام سے فارسی میں لکھی تھی، اُس کے جواب میں ایک طویل قطعہ "جواب مسافر" کے نام سے منظوم کیا۔ جو درج ذیل ہے:-

جواب مسافر

اندر آن وقتیکہ آن دانائی راز — حضرت اقبال پیر سرفراز
آن خدیو ملک فقر و بے نیاز — شمع سال روشن و لیکن بی گداز

---

[1] الہام - ادب، شمارہ اول ر ۱۳۵۲ - کابل -

کرد سوئے کشور افغاں گزر | دفتری بنوشت در ختم سفر
اندر آں دفتر بسی دُر سفتہ است | نکتہ ہائی بہتر از دُر گفتہ است
ہمچو لعل و چوں دُر و گوہر عزیز | نزد ہر افغان شد آں دفتر عزیز
گرچہ آں پاکیزہ بود ہمراز ما | باخبر از درد و سوز و ساز ما
کام وی شیریں بود از جام جلال[1] | پیر بلخ آں راز دان باکمال
گرچہ بود اندر کنار گنج بخش[2] | انکہ از غزنی بہ لاہور راندہ رخش
گرچہ بُد لعل بدخشانی نگیں | کرد چوں در کلک شعر انگشترین
گرچہ آں دانائی راز انجمن | گفت با دنیا بہ لفظ ما سخن
گرچہ اندر شعر ش آں صاحب یقین | گفتہ بود ایں نکتہ جہر آفریں
"آسیا یک پیکر آب و گل است | ملت افغاں در آں پیکر دل است"[3]
گرچہ درس از بوعلی آموختہ بود | دیگ فکرش باسنائی پختہ بود[4]
باز ہم خود را مسافر خواندہ بود | دین لقب بر دفتر خود ماندہ بود

خواستم من ہم خطابی آورم | آں مسافر را جوابی آورم
گرچہ من مہجورم از نور وصال | میزنم اندر ہوائے عشق بال
اشک چشمی می فشانم پُر ز درد | از زخم تا بستر دا آہستہ گرد

صبح گاہاں چوں برید خوش خرام | بہر ما آورد ایں خرم پیام
گفت۔ راہ خط لاہور گیر | مقصد نزدیک و راہ دور گیر
روبداں جای کہ باشد مہد راز | یادگار روزگاران دراز

---

[1] علامہ اقبال نے خود توضیح کی ہے اور مولانا جلال الدین رومی صاحب مثنوی کی طرف اشارہ کیا ہے۔
[2] علی بن عثمان ہجویری حلالی غزنوی معروف بہ داتا گنج بخش۔ صاحب کشف المحجوب ہیں۔
[3] علامہ اقبال کی مثنوی کا سفر ہے۔
[4] ابو المجد آدم بن مجد الدین سنائی، صاحب تذکرۃ الاولیاء حدیقۃ الحقیقۃ۔

هر درخت باغ وی افسانه یی — هر گلش بنشانده فرزانه یی
آبها در حوض‌های شالیمار — می‌جهد مستانه و سیماب وار
تا رسد بر تربت صاحب دلی — راز دانی، راد مردی، مقبلی
تا نهد بر تربت اقبال سر — گردد از اسرار هستی با خبر

چون شنیدم این پیام خوشگوار — شوق آتش شد به جانم زد شرر
درد دل من رازها آمد پدید — سوز جانم را سازها آمد پدید
برگ بی برگی گرفتم در لبساط — لاف درویشی زدم از انبساط
همچو شاهین از فراز کوهسار — پر کشودم بی‌خبر دیوانه وار
محمل من بود بال جبرئیل — آنکه هست الهام یزدان را بدیل
جرعهٔ جام سنائی در دهان — درد هجویری نهان اندر بیان
سید افغانیم بر ره دلیل — پرتوم از شمع بلخی در سبیل

آمدم اینک به پیش شاه عشق — پیش اقبال این چراغ راه عشق
آنکه از رمز خودی آگاه بود — درد بود و سوز بود و آه بود
آنکه زنجیر غلامی پاره کرد — دردهای مرد ما را چاره کرد
از کلام الله کلید تازه یافت — سوی باغ آرزو دروازه یافت
رهبر خود جستجو را برگزید — در خطرها آرزو را برگزید
از رموز سرّ حق آگاه گشت — هر کجا با خلق او همراه گشت
نالهٔ مظلوم در شعرش دوید — دست گشت و دامن ظالم درید
از شراب زندگی سرشار شد — آنقدر شد نشئه تا هشیار شد
سنگ زد چندان به مینای فرنگ — تا که سازد محو زان مینا شرنگ
مردمان هند را بنیغش فزود — گرد ذلت از رخ ایشان زدود

---

۱ الهام، ادب شماره چهارم ۱۳۵۹ ش / ۱۹۷۷ع ص ۱۳۹ — ۱۴۰

باشد از افلاک برتر نام او   صد سلام بر روان پاک او
من بہ درگاہش نیاز آوردہ ام   تحفۂ از سوز و ساز آوردہ ام
قطرہ چند از دو چشم بر چکید   خون دل بد شعر شد سویش دوید
تا شود گلدستہ بر سنگ مزار
تا ابد ماند در آنجا یادگار

اس مثنوی میں جس سے کم و بیش مثنوی معنوی کی جھلک نمایاں ہے شاعر نے مدرہ اختصاص ماہرانہ انداز میں اقبال کے سفر افغانستان کی بات کی ہے اور قبال کو ضمناً افغان کے قدیم شعرا کا پیرو اور ارادتمند بتایا ہے جن میں مولوی رومی بلخی، سنائی، غزنوی، بوعلی سینا کا نام قابل ذکر ہے۔ انھوں نے افغانستان کے تاریخی اور تمدنی شہروں میں بلخ اور بدخشاں وغیرہ کا بھی ذکر کیا ہے۔ پھر اقبال کے 'وطن و مدفن لاہور اور شالیمار کا قصیدہ پڑھا ہے اور اقبال کے قرآن سے استفادے اور اپنے شعور و بصیرت سے پُر اشعار اور پھر انھیں سے ہندستانیوں کو بیدار کرتے اور انگریزوں کے خلاف علم بغاوت بلند کرنے کی ترغیب کی تعریف بھی کی ہے۔ اسی طرح اقبال کے اسرار حقیقت کو سمجھانے اور شعر میں مظلوموں کی فریاد کو سمونے اور ظالموں کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرنے کا ذکر بھی کیا ہے۔ درحقیقت الہام کی یہ مثنوی اقبال جیسے مفکر اور درویش کے اوصاف کے شایان شان ہے۔ اور ہر افغانی اور ہر مسلمان کی عقیدت اور ارادت کی نمایندگی ہے۔

الہام قدیم کے شیدائی تھے اور قدیم و جدید دونوں شعرا کی مانند مادر وطن کے علاوہ اس مادر عزیز کی عظمت اور تقدیس کا قصیدہ خواں ہے جس نے اسے وجود بخشا ہے۔ اسے تنومند اور طاقتور بنایا ہے۔ اگر آج وہ ضعیف اور ناتواں ہو گئی تو کیا ہوا وہ آج اس کی ہمت اور جواں مردی کی یار و غمگسار ہے۔ الہام کو اپنے بچپن کے دن نہیں بھولے اور اپنی ماں کی زحمت، مشقت، لطف و مہربانی کا مزہ آج بھی اسے یاد ہے اس لیے وہ اس کے حضور میں، قدموں میں تہنیت اور درود نچھاور کر رہا ہے :-

من ار چند ره سوی پیری سپارم — بسر جز هوائی جوانی ندارم
بکوه سرم برف پیری نشسته — ولی کوه هوشش ثابت واستوارم
اگر ناتوانی تنم خسته سازد — نگویم که من ناتوانمند و زارم
وگر دیو پیری کند حمله برمن — چو رستم دمار از نهادش برآرم
مرا عمر اکنون فزون گشته از چل — ولی طفلم ونیست زین گفته عارم
جوانم جوانم ببینید برمن — که فرخنده مرمادر پیر دارم
چنان نشه خیز است طبعم ز لطفش — که شاداب تر از گل کوکنارم
طرب زاست از وی بهار خیالم — فدایش کنم غنچه نوبهارم
چو من هیچکس نیست خرم بگیتی — که از فرهٔ مادرم شادخوارم
گر این چرخ گردان شود آسیائی — لبش باید تنم چست تر سربرآرم
فتد کوه اندوه اگر بر دل من — گرانیش را هم طرب می شمارم
گر افتم به گرداب هائی خروشان — به امواجش آمیزم و گوهر آرم
به پرخاش اگر جنگ محنت زچشم — به سقار مردم کشد پایدارم[1]

شگوفان بود گلشن آرزویم — بسی غنچه می خندد از شاخسارم
از یراکه ای مادر مهربانم — بگیتی توئی یاور و غمگسارم
زیادم نرفتست ایام خردی — که می ساختی هردم امیدوارم[2]

---

[1] ادب۔ شمارہ اول، ۱۳۵۴ھ / ۱۹۷۵ء صفحہ ۱۵

[2] اسی موضوع پر سعدی کے اشعار بھی ہیں لیکن وہ اشعار ایک مغرور اور خود پسند لڑکے کے ہیں۔ جب کہ الہام کے ان اشعار میں لڑکا فرمانبردار و احسان مند ہے اور بچپن میں ماں کی تمام زحمتوں کو یاد کرکے نادم ہے۔ سعدی کا قطعہ ذیل میں ہے:-

چه خوش گفت زالی به فرزند خویش — چو دیدش پلنگ افگن و پیلتن
گر از عهد خردیت یاد آمدی — که بیچاره بودی در آغوش من
نکردی درین روز بر من جفا — که تو شیر مردی و من پیرزن

(گلستان سعدی مصور۔ نولکشور لکھنؤ ۱۸۸۹ء صفحہ ۱۹۲)

کہ می دادیم شیر از شیرہ جان ‌‌ ‌ زہر رنج میداشتی برکنارم
نمی خفت چشمت بہ شب تا سحرگہ ‌ ‌ چو می دیدی از ناز ہم اشک بارم
کنون نیز ای مادرم ہست روشن ‌ ‌ ز فانوس مہر تو شبہائی تارم
توئی ابر رحمت کہ در سایہ تو ‌ ‌ سر خود ز فردوس برتر بدارم
زبون است در پیش من کہکشاں ہا ‌ ‌ کہ ہمت بلند آوریدی ببارم
چو در کودکی زار و بے چارہ بودم ‌ ‌ تو سیپارہ بگذاشتی در کنارم
تو اندر دلم عشق کشور فگندی ‌ ‌ تو آزادگی را بکردی شعارم
تویم درس خدمت بمردم بدادی ‌ ‌ کزاں درس باشد بسی افتخارم
سزاوار شان ہمایونت اکنوں ‌ ‌ ندارم یکے چیزی و شرمسارم
ترا من چو شایستہ خدمت ندانم ‌ ‌ گل شعر خود پیش پایت بکارم
بدرگاہ والایت ای مادر من ‌ ‌ سرم با درود و تحیت گذارم

یہ نظم جسے شاعر نے اپنی والدہ کے اوصاف میں لکھا ہے اپنی اہمیت کے باوجود جا بجا سکتہ اور بے اثری سے پُر بھی ہے۔ مثال کے طور پر اسی نظم میں دوسرے شعر کا پہلا مصرعہ جو اعلا تشبیہہ کا نمونہ ہے،" بکوہ سرم برف پیری نشستہ" کا دوسرا مصرعہ" ولی کو ہوش ثابت و استوارم" شکستگی سے خالی نہیں ہے۔ اسی طرح نظم کا ۲۷ واں شعر" ترا من چو شایستہ خدمت ندانم" ضعیف نظر آتا ہے۔ جب کہ اسی کا دوسرا مصرعہ" گل شعر خود پیش پایت بکارم" بہت عمدہ اور اعلا ہے۔

الہام نے پانچویں شعر میں یہ کہا ہے:۔

مرا عمر اکنوں فزون گشتہ از چہل
ولی طفلم و نیست ازیں گفتہ عارم

ٹھیک یہی مفہوم سعدی نے اپنے اس شعر میں ادا کیا ہے اور زبان زد.

لہ ادب، شمارہ اول، ۱۳۵۴ھ/۱۹۷۵ء ص۱۵۱

خاص و عام ہے :—

چہل سال عمر عزیزت گذشت　　مزاج تو از حال طفلی نگشت [1]

دو سال قبل اس نظم کو پڑھنے کے بعد اور شعری ذوق رکھنے کے بنا پر اس مقالہ کے مصنف (خاکسار لعل زاد) نے ایک نظم لکھی جو کابل سے شایع ہونے والے مجلے ترجمان میں چھپی ۔ اس کے چند اشعار یہ ہیں :—

مادرم ای مادر والا گہر　　ای فدائی ہمت جان پسر

ہستیم مرہون لطف دمہر تو است　　زندہ می سازی مرا با یک نظر

تو مرا با خون دل پروردہ ای　　گر یہ ام در جان تو میزد شرر

میر سید گر اندکی دردی بمن　　دیدہ ات از گریہ می گردید تر

وقت بیماری و ناآرامی ام　　می نمودی شب بہ بالینم سحر

اور اخیر کے دو شعر پر یہ نظم ختم ہے :—

شعر من شایستہ وصف تو نیست　　چوں نگنجد وصف تو در این اثر

مادران را صد درود و صد سلام　　زین چہ باشد تحفۂ مقبول تر [2]

صد درود و صد سلام　　ان دو نظموں میں بہت حد تک یکسانیت ہے۔

الہام کی یہ چند طویل نظمیں اُن کے ایک پُر گو شاعر ہونے کی دلیل ہیں ۔ جن میں ماضی کی عظمت رفتہ اور بزرگ شعرا، صوفیا اور مشاہیر کی خصوصیات کے اعتراف کے ساتھ شاعر کا زبان و بیان پر قدرت رکھنا اور پھر قدیم و جدید سبک میں خوب صورت تشبیہوں اور تمثیلوں سے انھیں موثر بنانا، الہام کا کمال ہے۔

---

[1] Moral Book, By : Sayed Mazhar-ul-Hassan, G.A. Asghar and Co., Allahabad, 1911, PP.3.

[2] غلام محمد لعل زاد، ترجمان، کابل ، جلد ۳، ۱۹۷۳ م

فارانی

محمود فارانی ۱۳۱۸ھ/۱۹۳۹ء میں بمقام کابل پیدا ہوئے ۔ انھوں نے بی ۔اے تک کی تعلیم کابل میں حاصل کی اور کابل یونیورسٹی کے شعبہ شرعیات کے سند یافتہ ہیں ۔ اردو، فارسی، دری اور عربی میں شاعری کرتے ہیں اور ترجمہ کرنے کی حد تک انگریزی زبان سے آشنا ہیں ۔ چنانچہ فارسی میں انگریزی سے ترجمے بھی کیے ہیں ۔

وہ طرز قدیم و جدید دونوں میں شاعری کرتے ہیں ۔ اب تک ان کے دو مجموعے "آخریں ستارہ" اور "رویای شاعر" کے عنوان سے کابل سے شایع ہو چکے ہیں ۔[1]

فارانی کے کلام کے مطالعے سے یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ وہ بڑے پختہ اور پُرگو شاعر ہیں اور ان کے شاید و باید اشعار پر سست اور ضعیف ہونے کا گمان کیا جا سکتا ہے ۔ ان کے اشعار موثر اور دلچسپ ہوتے ہیں ۔ وہ بہترین اور شیریں کلمات اور الفاظ سے اپنے منظوموں کو حسین بناتے ہیں اور ان کے اشعار جو گوناگوں اور متنوع عنوانات کا مرقع ہوتے ہیں ۔ نہ صرف اثرانگیزی کی دلالت کرتے ہیں ۔ بلکہ شاعری کی دنیا میں فارانی کی وسیع معلومات اور دسترس کا بیّن ثبوت ہیں ۔ چنانچہ اس کی مثال ان کے ایک جدید منظومے "معبد دل" میں بدرجہ اتم پائی جا تی ہے ۔ اس میں انھوں نے روایتی انداز میں خوب صورت کلمات استعمال کیے ہیں اگرچہ بعض نامانوس کلمات و اصطلاحات غمزہ ہای شیطنت آمیز اختراں "برف جاوداں، پرتو ملایم مہتاب" کا استعمال کم اور خال خال ہوتا ہے ۔ لیکن شاعر اپنے محبوب

---

[1] محمد سرور مولائی ۔ برگزیدہ شعر معاصر افغانستان ۔ انتشارات زر ۔ تہران ۱۳۵۰/۱۹۷۱ء

کو کائنات کے گوشہ گوشہ میں، حریم دل میں اور فطرت کی خلاقی کے ہزار صد رنگ اور جلوؤں میں تلاش کرتا نظر آتا ہے ۔ ابر گہر بار، موج سرشار، سبز کوہسار غرض تلاش کا نا متناہی سلسلہ دل کی مرموز دنیا میں جاری رہتا ہے ۔ چنانچہ دل کی اس پرستش گاہ تک کی منزلیں طے کرنے کے لیے شاعر کہاں کہاں سراغ رسانی کرتا ہے۔

معیار دل

در ظلمت عمیق افقہائی دور دست
در کاخ نیلگون و پراز ابر آسماں
ہر جا نگاہ من
گیرد سراغ تو
در چین وتاب پیچ وخم ابر پارہ ہا
در غمزہ ہائی شیطنت آمیز اختران
ہر جا نگاہ من
در قلب نیم روشن وخاموش کوہسار گیرد سراغ تو
در قلو سپید ازاں برف جاودان
ہر جا نگاہ من
گیرد سراغ تو

در پر تو ملایم مہتاب نیم شب
در رقص برگہائی زر اندودۂ خزان
ہر جا نگاہ من
گیرد سراغ تو

لے محمد عثمان صدقی، میر ادب در افغانستان۔ کابل ۱۳۴۰ھ / ۱۹۶۱ء ص ۲۴ — ۲۳۲

در کاروان کوچک، پروین شب سفر
در کورہ راہ پرشکن وپیچ کہکشان
ہر جا نگاہ من
گیرد سراغ تو

نی نی میان عالم مرموز خویشتن
در معبد نہان دل ودر حریم جان
این جا نگاہ من
گیرد سراغ تو

ان کی ایک نظم حاضر ہے۔ جس کا سراپا حزن وملال سے پُر ہے۔ اگرچہ اس کے ہر مصرعہ کی قرأت دل نشیں اور نشاط انگیز ہے اور اس کا ہر حرف شاعر کی استادی اور مہارت کا مظہر ہے اور نئے نئے مضامین ومفاہیم کا منبع ہے۔ جیسے اہرمن کے قدموں کی آہٹ سے مُردوں کا لرزنا اور دوزخی روحوں کے پنجہ سے فرشتوں کے سپید پروں کا خونیں ہو جانا وغیرہ ہیں۔ وہ اپنے معاشرہ کو بہ حیثیت قدردان کے تعارف کراتا ہے اور شاعر کے ذریعہ سیاہ شدہ اوراق کو محض بیہودہ جانتا ہے اور اپنے تجربات اور اندازوں سے یہ نتائج اخذ کرتا ہے کہ کوئی بھی شاعر کی نگارشات کو قابل قدر نہیں جانتا ہے اور جو انتہائی افسوسناک بات ہے:—

در نیمہ ہائی شب
وقتی کہ سایہ ہائی شیاطین شب نورد
آہستہ می خزد بہ دل تنگ کوچہ ہا

وقتی کہ مردگان
در گورہائی تار
لرزند از صدائی قدم ہائی اہرمن
وقتی کہ بالہائی سپید فرشتگان

نخوئیں شود ز پنجہ ارواح دوزخی
وقتی کہ روی شہر
افسوں دمد الہہ جادو گر ہوس
واندر سکوت خلوت کم نور کاخ ہا
پیچد نوائی وسوسہ انگیز بوسہ ہا
تن ہائی سیم گوں
اندام ہائی گرم
عریاں شود بہ پیش نگاہ ہائی برق خیز [1]
وقتی کہ با نسیم
آید صدائی خندہ مستان رہ گزر
و آں زماں خموش را
در پشت پنجرہ
بر بسترش نشستہ در پرتو چراغ
بیہودہ می کند ورق چند را سیاہ ... [2]

زندگی سے زیادہ اہم چیز دنیا میں کیا ہے اور پھر شاعر جیسا حساس اس کو کس نظر سے دیکھتا ہے۔ چنانچہ فارانی کا بھی نقطہ نظر اس بارے میں ایک مخصوص حیثیت رکھتا ہے۔ انھوں نے اس خیال کو پرانے اسلوب میں ڈھالا ہے۔ لیکن اپنی تازگی اور جدیدیت سے بھرپور ہے:—

زندگی

زندگی چیست برق رخشانی
کاز آغوش ابر ہا خندد

---

[1] محمد سرور مولائی۔ برگزیدہ شعر معاصر افغانستان۔ انتشارات رز تہران، ۱۳۵۰ش ص ۱۲۸-۱۲۹

[2] محمود فارانی۔ آخرین ستارہ۔ کابل ۱۳۴۳/۱۹۶۴ء ص ۳۸-۳۹

یا شهابی که نیمه شب بدرود
راه این کاخ بیستون بندد
موج مستی که گاه رقص نسیم
در بر آبها فرو لغزد
نالهٔ بی کرانی، شبان پائیز
در دل تنگ دره ها لرزد
نور لرزان شمع صبح گهیس
که دمی بزم را کند روشن
ظلمت شب که با تبسم صبح
از فراز جهان کشد دامن
بوی جان پروری که از مجمر
همرهٔ شعله ای برون ریزد
نغمهٔ دل نشین و سحر آمیز
کز سر انگشت چنگ زن خیزد
نفس بسملی که بازی دهر
خون او را بخاک آمیزد
اشک رخشنده ایکه لمحهٔ چند
سر مژگان دلبر آویزد

حرف کوته - حیات زود گذر
لحظه یی هست بین مرگ و عدم
لیکن این لحظهٔ پر از اسرار
ابدیت بزاید از هر دم

---

۱. محمود سرور مولائی - برگزیده شعر معاصر افغانستان، انتشارات رز تهران - ۱۳۵۰ ص ۱۱۸-۱۲۹

در برش خفته جاودانیها
به نهادش نهفته راز زمان
دل او، همچو قید دریا ژرف
پهناش چون سپهر بی پایاں
هدف آفرینش گیتی است
این معمای دلکش و مرموز
این طلسم شگفت و راز شگرف
سر سربستہ رمز فکرت سوز... ؎۱

اگرچہ شاعر نے ایک طرف زندگی کو شاعرانہ تمثیل اور احساس رسائی کی بنیاد پر بہت جلد گزر جانے والی چیز کہا ہے اور اسے "برق درخشان"، "شہاب" "نور لرزاں"، "نفس بسمل" اور "لحظہ بین مرگ و عدم" قرار دیا ہے اور دوسری جانب اس کی اہمیت پر تاکید بھی کی ہے۔ اور پھر اس کو "ابدیت زا" "جاودان" اور "ہدف آفرینش گیتی" بھی سمجھا ہے۔

اسی قسم کی ایک اور نظم مشہور شاعر "اسداللہ حبیب" نے بھی تقریباً اس مفہوم اور عنوان سے نظم کی ہے۔ جسے موازنہ کے لیے پیش کیا ہے۔

زندگی

زندگی در قاب ہر تصویر
در ایمائی ہر پندار
نقش ها محو مجہولیست
لیک این مجہول
لیک این محو

؎۱ محمود فارانی۔ آخرین ستارہ۔ کابل ۱۳۴۴ش ص ۳۷

آں تناور شاخ پُر بار لیست
کہ زلالِ رود بار دست ہا سیراب می گردد
آفریں، بر جویبار جارہ؟ آن دست
آفریں آبی کہ از وی
شاخسار زندگی سیراب می گردد

اگرچہ دونوں نے زندگی کی یکساں تعریف کی ہے لیکن اس کے شاعرانہ نقطۂ نظر اور اخذ شدہ نتائج میں تھوڑا تفاوت پایا جاتا ہے اور وہ بھی اس مفہوم کے ساتھ کہ اول الذکر اپنے نظریہ کو اس طور پہ رازدارانہ اور کنایتاً ظاہر کرتا ہے اور مؤخر الذکر دعوا کرتا ہے کہ زندگی کو مزدور اور دہقان کا ہاتھ سیر آب اور بار آور بناتا ہے۔ تجزیہ اور بیان کا یہ انداز غالباً زمانہ اور اس کے ناسازگار ہونے کی نا پر ہے۔ کیوں کہ فارانی نے اپنی زندگی کو اس وقت سے ۱۲ سال پہلے بیان کیا ہے جب کہ آزادی بیان جیسی کہ ہونی چاہیئے، وجود ہی نہیں رکھتی تھی۔ اور اسد اللہ حبیب اپنی اُس زندگی کا ذکر کر رہے ہیں۔ جس میں ان کی نظمیں انقلاب کے محافظ اور مدافع کی حیثیت سے استعمال ہوئی ہیں اور اُس کے لیے ہر قسم کی سہولت میسّر اور بہم ہے۔

فارانی کی ایک نظم یا جسے ہم قطعہ کہیں "پاسبان" ہے جس میں وہ ایک مرد پیر کا قیافہ مجسّم کرتا ہے جو رات کے اندھیرے میں انتہائی خستہ حالی میں پاسبانی کے فرائض انجام دے رہا ہے اور جس وقت وہ بلب کی روشنی میں ایک دکان کے تنور دم میں ایک بچگانہ جوتے کی طرف نگاہ ڈالتا ہے تو اُسے اپنے بچے کی حزن و ملال میں ڈوبی ہوئی آواز سنائی دیتی ہے جس نے کہا تھا کہ بابا کل عید ہے اور میں ننگے پیر ہوں۔

یہی سبب ہے کہ فارانی کو اپنے معاشرہ کا نمائندہ مانا جاتا ہے اور وہ اپنے پیغام کو لوگوں کے احساس اور شعور کے ادراک اور اُن کے فقر اور تنگدستی

۱؎ شورائی فرہنگی دانشگاہ کابل۔ در کوچہ ہائی سرخ شفق گزینۂ شعر و ادب، کابل ۱۳۶۰، ۹۱

کے درد کو سمجھتے ہوئے، اپنے کلام میں سموتا ہے اور اُن کی دانش اور فہم کے مطابق بات کہتا ہے۔ اگرچہ موضوع بہت معمولی اور گھسا پٹا نظر آتا ہے۔ لیکن اُسی فطری انداز اور سادگی میں ڈوبا ہوا مجسم اور بیان کیا گیا ہے۔ ہم اسے مل کر کر پڑھیں:—

پاسبان

بازار در سیاہی شب غرق گشتہ بود
خفاش پیر و کور
در آسمان تیرہ و مرموزی پرید
یک جوجہ سگ خموش
در زیر یک دکان قصابی فتادہ بود
ترسیدہ می جوید یکی پارہ استخوان
بر سنگفرش سر خیاباں در آں طرف
در پرتو بنفش یکی نیلگوں چراغ
یک پاسبان پیر
در انتظار خندہ صبح ایستادہ بود
آواز زنگ ساعت یک برج دور دست
یک بار قلب خاموشی ژرف را شگافت
چشمان پاسبان
از خشم برق زد
او خستہ بود و تیرہ شب بی سحر ہنوز
اندام شہر را بہ بر خویش می فشرد
چشمان نیمہ باز و پر از خواب پاسبان
در پرتو بنفش ... [1]

[1] محمد سرور مولائی۔ برگزیدہ شعر معاصر افغانستان، انتشارات رز تہران ۱۳۵۰۔ ص ۳۰

از شیشہ ہائی پنجرہ روشن دکان
بر گنجہ ہائی خفتہ آں میخکوب، ماند
دانگہ نگاہ او چو یکی خستہ عنکبوت
آہستہ روی موزۂ طفلانہ می خزیار
در گوش او صدائی غم انگیز کودکی
پیچید با ترانۂ یک یاد رہ گزر
فرداست عید و بابا یم برہنہ است ...[1]

لایق

غلام مجدد لایق" خلیفہ عبد الغنی کے صاحبزادہ ہیں۔ اُن کی پیدائش ۲۲ر میزان ۱۳۰۹۔ش/۱۳۴۹۔ق ھ میں جنوبی افغانستان کے ایک صوبہ کے پرامن دیہات شرن۔ کتہ واز میں ہوئی ...[2]

لیکن برگزیدۂ شعر معاصر افغانستان" کے مصنف نے لکھا ہے کہ سلیمان لایق ۱۳۰۹۔ میں ایک مذہبی گھرانے میں متولد ہوئے اور اسی بنا پر ابتدائی ثانوی تعلیمات دینی اور شرعی علوم کے مدرسہ میں حاصل کی اور کابل یونیورسٹی کے دانش کدہ شرعیات میں داخلہ لیا۔ وہاں ایک سال بہ حیثیت طالب علم رہے۔ لیکن سیاسی اسباب کی بنا پر کالج سے نکال دیے گئے۔ پھر کچھ وقفہ کے بعد دانش کدہ ادبیات میں داخلہ لیا اور وہاں سے ادبیات اور فلسفہ میں بی۔ اے کیا اور قومی اخبار" انیس" میں عہدہ دار کی حیثیت سے کام کرنے لگے۔ دو سال تک" مجلہ ژوندون" کے مدیر رہے۔ وہاں سے ریڈیو افغانستان میں ملازمت کی اور وزارت اطلاعات میں ۱۲ر سال کام کرنے کے بعد سرکاری ملازمت

---

[1] محمد سرور مولائی۔ برگزیدہ شعر معاصر افغانستان۔ انتشارات رز تہران، سال، ۱۳۵۰، ص ۱۳۱
[2] خستہ معاصرین سخنور ۱۳۳۹، ش، ۱۹۶۰ء کابل ص ۱۵۷

۱۳۴۷ش۔ رسالہ "پرچم" کے اجرا کا امتیاز حاصل کیا اور انھوں نے کئی بار شعر و ادب کی دنیا میں مقابلہ کر کے امتیازی تمغات بھی حاصل کیے ہیں۔ وہ قدیم و جدید دری فارسی میں اچھی شاعری کرنے کے لیے مشہور ہیں۔ شاعری میں سیاسی، سماجی، تاریخی اور ملی مسائل پر خاص توجہ کی ہے یہ اگرچہ لایق ذمہ دار اور انقلابی شاعر ہیں پھر بھی اُن کی جوانی کے ایام کی شاعری میں اور اب جدید شاعری تک میں اُن کی آزادہ روی اور زندہ دلی کا مشاہدہ کیا جاسکتا ہے۔ چنانچہ مثال کے طور پر انگور اور اس کی شراب سے متعلق اُن کی ایک نظم پڑھنے سے تعلق رکھتی ہے۔

انگورہا

این چیست این انگورہا
این دانہ ہا این نور ہا
این ہمدم مہجور ہا
این داروی مخمور ہا
این نور ہا انگورہا

- - - - - - - - -

در آب او آتش نہان
در آتشش سحری عیان
سحرش دوائی عاشقان
عشقش جنون جاودان
از تلخیش شیرین جہان

- - - - - - - - - -

راہش رہ عصیانگری
یا درد ہا دو را نگری
یا درد ہا درما نگری
یا جان و سر قربانگری
قربان ایں عصیانگری [1]

اس منظومہ میں اگرچہ شاعر انگور اور شراب کا بیان کرتا ہے اور اس کی کڑواہٹ سے دنیا کو میٹھا بناتا ہے لیکن براہ راست شراب یا مے دختر رز اور اسی قسم کے نام کی مثالیں استعمال نہیں کی ہیں اور فقط انگور اور انگور کے پانی کا ذکر کرتا ہے اور پڑھنے والے کو بہکانے کے لیے پس پردہ انگور کی شراب پی رہا ہے۔ بہرحال جو کچھ بھی ہو ان کے اشعار پرکشش، جاذب اور دل میں گھر کر جانے والے ہیں اور روح سے بغاوت پر آمادہ کراتے ہیں کہ شراب خواری کو ایک بری چیز ہونے کی بنا پر بھی اُسے دوست رکھتا ہے اور خود کو اس پر قربان کر دیتا ہے۔ یہاں صرف مقابلہ کے لیے ایران حاضر کے ایک جدید شاعر نادر نادر پور کی نظم بہ عنوان "شعر انگور" بھی قابل ملاحظہ ہے۔

نادر نادر پور نے ایران کے روایتی شعرا کے محبوب موضوع انگور اور اُس کے کشید کو نئے رنگ اور استعارے اور کنائے سے پیرائے میں پیش کیا ہے۔ انگور کے دانوں کو وہ بوڑھے باغبان کے خون اور اشک کا نام دیتا ہے اور نتیجتاً اسے باغباں کا خون ہی قرار دیتا ہے۔ جسے دوسرے مفت خور پی کر لذت بخش لطف لیتے ہیں۔ مستی کرتے ہیں اور آخیر میں اپنے سبک الفاظ کو انگور کے دانے اور شعر کو اس کے رسیلے نوشوں سے تشبیہ دیتا ہے جو اس کی جانفشانی، عرق ریزی اور غور و فکر کا ثمرہ ہے۔ جنھیں آسانی سے شراب یا انگور کی مانند بہت زیادہ آسانی سے حاصل نہیں کیا جا سکتا ہے اور نہ ہی پیا جا سکتا ہے:۔

---

[1] سلیمان لائق، بادبان، مطبعہ تعلیم و تربیہ کابل، ۱۳۶۰ ش۔ ۱۹۸۱ء ص ۱۸۔۱۹

شعر انگور[1]

چہ می گوئید ؟
کجا شہد است ایں آبی کہ در ہر دانۂ شیرین انگور است ،
کجا شہد است یک اشک است ،
اشک باغبان پیر رنجور است ،
کہ شبہا راہ پیمودہ ۔
ہمہ شب تا سحر بیدار بودہ ۔
تاکہارا آب دادہ ۔
پشت را چون جفتہ ہائی مو دوتا کردہ ۔
دل ہر دانہ را از اشک چشماں نور بخشیدہ
تن ہر خوشہ را با خون دل شاداب پروردہ ۔
چہ می گوئید ؟
کجا شہد است ایں آبی کہ در ہر دانۂ شیریں انگور است .....
شما ہم ای خریداران شعر من !
اگر در دانہ ہائی نازک لفظم
ویا در خوشہ ہائی روشن شعرم
شراب و شہد می بینید غیر از اشک و خونم نیست
کجا شہد است؟ ایں اشک است ، ایں خون است ۔

جیسا کہ شروع میں ہم نے یہ بتایا تھا کہ سلیمان لائق قدیم اور جدید دونوں طرز میں شاعری کرنے کا ملکہ رکھتے ہیں اور عشق انقلاب دونوں سے بیک

---

[1] دکتر جعفر مؤید شیرازی شعر فارسی از مشروطیت تا امروز، تہران، ۱۳۵۰/۱۹۷۸ء صـ ۱۰۲۲

صحبت نبرد آزما ہو جانے کی طاقت رکھتے ہیں اور پہاڑوں میں چوپانی کرتے ہوئے رکھوالے کے عشق اور درد کو اُس کی بانسری کی درد انگیز آوازیں منعکس کرتے ہیں :-

آوائی شب[1]

در نیمہ شب ا از کوہساری۔
آید صدائی
فریاد نائی
چوں موج دریا

....

شاید شبانی عاشق جوانی
از مہر روی
از برق موی
نالد شبانگاہ

....

عشق شبانان، برق شنابان
رسوا دغر یان
مغلوب توفان
ساحل ندارد
خوش کنج کوہی - دو داز گرہی
با مہر سوزان
با اشک لرزان
دریا دروی

---

[1] سلیمان لائق۔ بادبان، مطبعہ تعلیم و تربیہ سال ۔ ۱۳۴۶، کابل ص ۱۷

ہمارے شاعر میں ایک خاصیت اور ہے کہ اُس نے اپنے وطن کے تاریخی شہروں، مقامات، اشخاص اور دوست ممالک اور دنیا کے اچھے شہروں تک کی تعریف و توصیف کے بارہ میں نظمیں لکھی ہیں جن میں شاعر کا اپنے وطن پر فخر کرنا اور محبت کرنے کا جذبہ تو پنہاں ہے ہی ساتھ ہی انسانیت اور تاریخ سے دوستی کا خیال جھلکتا ہے :—

غزنین خاموش[1]

ای غزنہ - ای خرابۂ خاموش و بی صدا
ای کشتی شکستۂ دریای روزگار
آیا کجا شدند
آں جنگاوراں
آں ہای و ہوگراں
آں ہا کہ از تخار و ہری تا بہ مرز ہند
با خون خلق شہرت خود را نبشتہ اند
آں خاندان و دولت و آیین غزنوی
مداح معانی و استاد عنصری
آں خواجۂ بزرگ
آں جمع افسران
و آں جملہ شاعران
در خاکہای غمزدہ در زیر تپہ ہا
آیا کجا بہ خواب ابد آرمیدہ اند
نی کاخ مرمرونہ در آن سرو لعبتی

---

[1] سرود مولائی برگزیدۂ شعر معاصر افغانستان چاپ زر - تہران ،

نی کوس دولت و نه شکوه و صلابتی
نی صوت بربطی
نی چنگ و چنگیان
نی شور مطربان
نی های هوی نه مستی خوبان بارگاه
نی انعکاس خنده به دهلیز قصرها
نی پیلبان نه پیل، نه خنگان نوبتی
نی حاجبان، نی قلعه گشایان، نه بندگان
نی تخت طاوسی
نی قهر پاسبان
نی آیت ز شوکت و نیروی این و آن
تنها در آن میان دو منار ایستاده اند.....
محمود آن نبردی یکتا جهان کشای
سلطان یمین دولت و مسعود پهلوان
با جمله دودمان
رفتند و دیگران دنبال کاروان
نی گرد ره به جای و نه راه دلاوران
چون سایه فانی شب تاریک گشته اند
آن بزم ها و عربده ها و عشق ها
آن خنده ها غریو گوئی ها و نشه ها
گوئی که خواب بود
یا چرخ چنبری
در مرز خاوری
بر لوح پاک سادهٔ غزنین منزوی
نقش عبث برای تفنن کشیده بود [1]

---

[1] محمد سرور مولائی - چاپ ذر تهران، سال ۵ شماره ۱، ۱۹۷۰ع ص ۱۴۲-۱۴۴

اس نظم میں جو تازہ اور سادہ اسلوب میں پیش کی گئی ہے۔ اگرچہ شاعر نے غزنین، اُس کے سلاطین اور اپنے ملک کے افتخار و عظمت کا ذکر کرنا چاہا ہے۔ لیکن اُس کی انقلابی فطرت اور استبداد سے نفرت اُسے مجبور کرتی ہے کہ وہ اپنی ہر فرصت کو مطلق العنانیت اور آمریت اور شہنشاہی سلطنتوں کی مذمت میں صرف کرے اور ہر جگہ عوام اور جمہور کا ذکر کرے۔ چنانچہ جب اس نے اس شعر میں یہ اشارہ کیا ہے۔

آنہا کہ از تخارہ وہری تا بہ مرز ہند　　باخون خلق شہرت خود را نبشتہ اند تو

تو اُس کا مقصود ایک طرف تو ملک سے محبت کے احساس کا مظہر ہے اور ملی اور تاریخی مفاخر کا ادعا ہے اور دوسری طرف محمود اور مسعود غزنوی کے جہاں بانی اور پہلوانی کا ذکر بھی ہے۔

بہر حال شاعر غزنین کو "کشتیٔ شکستہ دریائی روزگار" سے تشبیہ دیتا ہے اور اُس خاموشی میں جلال، عظمت اور تاریخی شکوہ گزشتہ کا نشان سوائے "دو میناروں" کے اور کوئی چیز نہیں پاتا ہے۔

یہاں پھر ایرانی شاعر نادر نادر پور کی ایک شاہکار نظم بنام "قم" پیش کرنا خالی از دلچسپی نہ ہوگا جو سادہ اور سلیس زبان میں اس مذہبی شہر کا سراپا کھینچ کر رکھ دیتی ہے کہ کس طرح مردوں اور عورتوں کے مذہبی پہناوے سے لے کر صاف ستھرے سنہرے گنبد اور روشن یار مجمع میں پریشان حال اور مفلوک الحال سائلوں کا انبوہ بھی ہے، کالے چہرے سوکھے اور بے رونق ہونٹ ان کی غربت کی داستان سناتے ہیں اور پڑھنے والے پر عجیب و غریب تاثر ڈالتے ہیں:۔

قم

چندیں ہزار زن
چندیں ہزار مرد

زنہا لچک بسر
مرداں عبا بدوش
یک گنبد طلا
با لک لکان پیر
یک باغ بے صفا
با چند تنک درخت
از خندہ ہا تہی
وز گفتہ ہا خموش
یک حوض نیمہ پُر
با آب سبز رنگ
چندیں کلاغ پیر
بر تودہ ہائی سنگ
انبوہ سائلان
در ہر قدم براہ
عمامہ ہا سفید
رخسارہ ہا سیاہ

لائق نے ۱۵ اکتوبر ۱۳۵۷ / ۵ جنوری ۱۹۷۹ء کو جمہوریہ روس کی ریاست تاجیکستان کے شعرا کے ایک وفد کی افغانستان میں آمد پر ایک ایک استقبالیہ ترکیب بند نظم کیا تھا جسے پڑھ کر شاعرانہ جذبات کا اندازہ بہ خوبی لگایا جا سکتا ہے:-

ای دوستاں بہ کشور افغان خوش آمدید
چون جان باز گشتہ بہ جانان خوش آمدید

ا؎ ڈکتر جعفر مؤید شیرازی، شعر فارسی از مشروطیت تا امروز تہران ۱۳۵۷، ص ۳۵۸

از سرزمین کار و شراب و سرود عشق
لبریز مهر و خرم و خندان خوش آمدید
از کشور بزرگ و سرافراز لینینی
تا سرزمین غرش و توفان خوش آمدید
ما همنبرد و هم دل و هم کیش و همرهیم
از مرز تا به مرز بدخشان خوش آمدید
ما و شما رفیق و شفیق و برادریم
یک قلب واحدی که میان دو پیکریم

ما تازه تا تلاطم طوفان رسیده ایم
فریاد رعد غرش دریا شنیده ایم
ما با سلاح کشتی نور شکوهمند
دام طلسم و هیبت شبها شکسته ایم
پشت مکان چو خالق دریا نشسته ایم
تقدیر خود به عرصه پیکار بسته ایم
ما با جهان کهنه و اندیشه و عمل
پلهها شکسته ایم، علایق گسسته ایم
ای واصلان خرم ساحل خوش آمدید
زینت دهان کشتی و منزل خوش آمدید

دل می تپد به سینه من لایق آمده است
آن شاعر عطش زده عاشق آمده است
با شعر و با ترانه و با یک جهان دل
با شور و حال و خصلت یک تاجک آمده است
از سرزمین چشمه خورشید لیننی
لایق برای همدمی لایق آمده است
بر آموی فسانه سرا ما دو سا حلیم
او شهرگ حیات دو خلق است و ما دلیم

پایان وزندہ باد شعار برابری
آئین عشق وشیوہ گرم برادری
ہموار باد راہ نبرد نو آوران
گسترده باد دامن صلح وسرا بیری
تابندہ باد خاطرۂ جاوداں ثور
باضربہ ہائی قاطع وتصمیم رہبری
ما در نبرد ثور ہنر راشنا ختیم
ذوق تلاش وشور ظفر راشنا ختیم

اس طویل ترکیب بند میں جس کا بیشتر حصّہ طوالت کی بنا پر حذف کر دیا گیا ہے۔ شاعر نے اپنے جیل جانے، دوستوں کے قید ہونے کا واقعہ بیان کیا ہے کہ کس طرح داؤد خاں کی رئیس جمہوری سابق افغانستان از ۱۹۷۳ تا ۱۹۷۸ء) کامیابی اور شکست ہوئی اور پھر انقلاب ثور کی تشریح کی ہے اور تاجیکی شعرا کے استقبال میں ضمناً تاجیکی اور افغانی عوام سے متعلق اپنے احساسات کا اظہار کیا ہے اور قابل ذکر بات یہ ہے کہ شعرا کے وفد میں تاجیکستان کے ایک شاعر ان کے ہم تخلص لایق بھی ہیں اور دونوں کی مماثلت کو شعر میں بیان بھی کیا ہے جس میں ایک طرف لنین کی سرزمین اور وہاں کے نظام کی اخلاص مندانہ توصیف وتعریف بیان کرتے ہیں اور دوسری جانب اپنے اخلاص اور صمیمیت کو اپنے ہمنام شاعر پر ظاہر کرتے ہوئے افغان اور تاجیک دونوں کو دوست بھائی اور ایک جان دو قالب بھی کہتے ہیں:۔
یہ کہا جا سکتا ہے کہ لایق پشتو اور دری فارسی دونوں زبانوں کے شاعر ہیں۔ چنانچہ اب تک ان کے تین مجموعے بنام (چونغر) "اسم کوہی (کینر دی" "غزدی)" "یادونہ او، درد مندونہ - یادہا ودرد منداں) پشتو زبان میں شایع ہو چکے ہیں۔ ایک اور قطعہ جو ذیل میں پیش کیا جا رہا ہے، شاعر کے اعتراف اور دفاع کا نمونہ ہے اور وہ "چونغر" کے عوض افغانستان

کی وزارت اطلاعات اور کلچر سے پانچ سو روپئے کے مستحق قرار دیے گئے تھے: (دس امریکی ڈالر[1])

به وزیر

شنیده ام که مرا قیمت کتاب غزل — رسیده است به حسن نظر به ده دالر
سه سال عمر که بردم بسر در ایجادش — هزار قطعی سیگار کرده خاکستر
چه خواب ها که سپردم بغارت سحری — چه شعرها که نوشتم به صرف خون جگر
چه خنده ها که به لب های طفل معصومم — چو موج رفت به یغما ندید چشم پدر
چه لحظه ها که ز آغوش نرم و بیتابی — فرار کردم و انشاد کرده ام چو نغز
چه سوز ها که نهفتم به ذره ذره آن — چه درد ها که ورق کرده ام بایں دفتر
چه رنگ ها که از آن رنگ برده هر غزلش — چه عشوه ها که ربود دست از جهان دفتر
شبانگهیکه غروب ستارگان برخاست — سحر بگهیکه کهسار داد تاج قمر
درین دقایق پر شور ذوق بیتابم — زهر پدید و برنگی گرفت و رنگ اثر
بزلف شب ز سرشک ستارگان بستم — هزار لولو لالا ـ هزار دُر دُرر
چه نغمها که کشیدم ز برگ لاله و گل — بساز های غروب و بسوز های سحر
ولی به پاس همین آن سگان درگاهت — سگان مرتبت و پول و چوکی و دفتر
ز بدسگالی به بازی گرفت کار مرا — حذر ز بی ادبی های .... گذر
نه هر که جامه پاکیزه داشت آدم شد — کجا قضاوت شعر و کجا فراست خر
من آن نیم که کند خر درو زنگار مرا — و یا بحادثه پایان کنم کرامت سر
همای همت من ناز آسمان نکشد — که خرقه پوشم و اما غرور زاد هنر[2]

---

[1] لایق. بادبان ـ مطبعه تعلیم، ترجمه ۱۳۶۰/۱۹۸۱ء کابل ص ۱۶۸
[2] " " " " " " " " ص ۱۶۹
[3] " " " " " " " " ص ۱۷۱

جس طرح اس منظومہ کی تاریخ میں درج ہے کہ شاعر نے اسے ۱۳۴۱ش یعنی تقریباً ۲۰-۲۲ سال قبل منظوم کیا ہے اور اسی کے ساتھ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس حقیر معاوضہ سے سخت ناراض ہوا ہے اور اس ناخوشی کے اسباب کو اس وقت کے وزیر ثقافت کے نام کرتے ہوئے بیان کیا ہے اور تین سال تک جب تک اس کتاب کو طبع ہونے کا وقت نہیں آگیا ہے، ان سگرٹوں کو جنھیں جلاکر راکھ کیا ہے اور اُن راتوں کو جنھیں جاگ جاگ کر یہ اشعار کہے ہیں، اس نظم میں اُن تمام کو دُہرایا ہے اور اُس انعام کو جو اس کے بدلے دیا گیا ہے، حاصل کرکے انتہائے غم و غصّہ کا اظہار کیا ہے اور آخری شعر میں اس وزیر موصوف کا نام نقطوں میں لکھ دیا گیا ہے اور پھر ہجو گوئی کی حد تک اُتر کر یہ کہنا " کجا قضاوت شعر و کجا فراست خر " بڑی جرأت کی بات ہے اور غالباً شاعر اپنے " غم و غصّہ کے احساس کو اس سے بہتر پیرایہ میں بیان کرنے کا یارا نہیں رکھتا تھا اور آخر میں اپنے استغنا اور بے نیازی کا دعوا کرنے سے بھی باز نہیں رہ سکا ہے کہ زمانہ کے حادثات اُس کے سر کو کسی کے سامنے جھکا نہیں سکتے اور باوجود خرقہ پوش ہونے کے وہ اپنے ہنر پر افتخار کر سکتا ہے۔

وطن لایق کے لیے بڑی اہم ترین شے ہے۔ چنانچہ انا اور ادعا کے باوجود وطنیہ جذبہ حب الوطنی سے لبریز ہے۔ ملاحظہ ہو:۔

دوست دارم ایں وطن را

دوست دارم ایں وطن را
دوست دارم سنگ او را کوہ او را
دوست دارم قلب خود را خانۂ اندوہ او را
دوست دارم ایں وطن را
خاک او را
ابرہائے مست بیباک او را

بر فراز کوہ ساداں آسمان پاک اورا
دوست دارم ایں وطن را
لانۂ ویران اورا
خانۂ دہقان اورا
در بر آزادہ کوہستان صدائی ہی ہی چوپان اورا
بہمن و توفان اورا
غرش و عصیان اورا

دوست دارم ایں وطن را
وادی شاداب اورا
آمو و مرغاب اورا
باد اورا، ابر اورا، آب اورا
رستخیز موج از خود رفتہ و گرداب اورا
دشت ہائی خشک گرما گشتہ و بی آب اورا

دوست دارم ایں وطن را
لحظہ ہائی تنگ اورا
چہرۂ خشمیدۂ آژنگ اورا
صلح اورا جنگ اورا
سرگزشت زندۂ جاوید با فرہنگ اورا

دوست دارم ایں وطن را
باز گردوں تاز اورا
دلہ نبرد قہر و طوفان آیت اعجاز اورا
بر فراز دور دست آسمان پرواز اورا

بال بی آوازہ اورا

دوست دارم ایں وطن را
ظلمت شبہائی اورا
در نبرد زندگانی جادہ غم ہائی اورا
خلق بی ہمتائی اورا
در افقہائی زبان استارہ فردائی اورا
رزم اورا، فتح اورا، آیندہ زیبائی اورا!

اس منظومے میں جو کہ ثابت وزن کے نہ ہونے کی بنا پر ایک ہی قسم کے قافیہ پر مشتمل ہے، شاعر نے پڑھنے اور سننے والے کے احساسات کو برانگیختہ کرنا چاہا ہے اور اُس میں اگر ایک طرف سنگ، کوہ، آسمان، ابر، وادی، دریا، دشت صحرا اور انسانوں کے اوصاف کو بدرجہ احسن بیان کیا ہے تو دوسری جانب حماسہ آفرینی، علم و تمدن پر فخر کا بھی ذکر کیا ہے چنانچہ "لحظہ ہائی ننگ اورا" اور "سرگزشت زندہ جاوید با فرہنگ اورا" وغیرہ کا جگہ جگہ بیان کیا ہے اور شاعر نے اپنے انقلابی شاعرانہ رسالت کو بہ حیثیت پیغامبر مدِنظر رکھتے ہوئے "خانہ دہقان" "بی بی چوپان"، اورا، خلق بی ہمتائی" جیسے الفاظ کو نظر انداز نہیں کیا ہے۔
تقریباً اسی مضمون اور عبارت کی حامل ایک نظم ایران کے ہم عصر شاعر، فریدون مشیری، نے اپنے وطن پرستانہ جذبات کے تحت منظوم کی ہے جو پیش ہے:-

نیایش

آفتابت!
کہ فروغ رخ زرتشت در آن گل کردہ است
آسمانت!
کہ زخم خانۂ حافظ قدحی آوردہ است

کوہسارت!
کہ برآں۔ ہمت فردوس، پر گسترده است
بوستانت!
کہ نسیم نفس سعدی، جان پرورده است
ہم زبانان منند!
مردم خوب تو۔ ایں دل بہ تو پرداختگان
پیش شمشیر بلا!
سر و جان باختگان، غیر تو نشناختگان
قد برافراختگان سینہ سپر ساختگان
مہربانان منند!
نفسم را پر پرواز از تست
بہ دماوند تو سوگند، کہ گر بگشایند
بنمادم از بند، ببینند کہ آواز از تست
ہمہ اجزایم با مہر تو آمیختہ است
خون پاکم کہ در آں عشق تو می جوشد و بس
تا تو آزاد بمانی، بہ زمین ریختہ باد.....[1]

یہ نظم جو اپنی جگہ جدید ہونے کے ساتھ ساتھ بہت دلچسپ اور مکمل بھی ہے، شاعر کے انھیں کلمات کے استعمال کا مرقع ہے جن سے افغانستانی شاعر نے استفادہ کیا ہے جیسے، آفتاب، آسمان، کوہسار، بوستان اور اسی طرح "مردم خوب" جیسی چیز افغانستان کے شعرا کا تشخص ہے۔ کیونکہ وہ انقلاب کو اپنا مقصود اور مدعا جانتا ہے، وہ "قہر" "توفان" اور "نبرد" کا ذکر کر کے ملک کے آئندہ دنوں کے لیے "رزم"، "فتح" اور خوب صورت مستقبل کا متوقع

[1] مجلہ سخن، شمارہ ہفتم، خرداد و تیر ۲۵۳۷/۱۹۷۸ء، تہران ص۱۹۱-۱۹۰

اور آرزو مند ہے اور ایرانی شاعر بھی وطن پرستانہ جذبات کے ساتھ اپنے سارے وجود کو وطن کی خاک میں ملا دینا چاہتا ہے اور وطن کی آزادی کے لیے خون بہانا چاہتا ہے۔ اس کے علاوہ ایرانی شاعر نے، آفتاب، آسمان، کوہسار اور بوستان۔ جیسے استعارات سے اپنے وطن کی تاریخی اور ادبی شخصیتوں کا بحسن وخوبی تعارف کرایا ہے۔

بارق شفیعی

اُن کا نام محمد حسن ہے۔ وہ ۱۳۱۰/۱۹۳۱ء میں کابل میں پیدا ہوئے اور ثانوی تعلیم بھی اسی شہر میں تمام کی۔ کچھ سالوں تک اُنھوں نے سرکاری ملازمت کی اس کے بعد انجمن میں تربیت افکار کے رکن بنائے گئے۔ بہت زمانہ تک رسالہ ژوندون کے شعری اور ادبی حصّہ کے اڈیٹر کی حیثیت سے کام کرتے رہے اور بہت دنوں تک یہ مجلہ اُن کی ادارت میں شایع ہوتا رہا۔

بارق نے شروع میں قدما کے طرز پر اشعار کہے لیکن بہت جلد جدید شعرا کے طرفداروں میں ہو گئے اور یہاں تک کہ اُن کو افغانستان کے جدید شعرا کے پیش روؤں میں شمار کیا جا سکتا ہے۔ وہ کیا اپنی تحریر میں اور کیا اپنے شعر میں وقت کی ضرورت اور تقاضہ کا ذکر کرتے اور اُس کے ہم قدم اور دفاع کرتے رہے ہیں۔ اسی بنا پر بارق نہ صرف شاعری کے قالب کو تازگی بخشنے کی اہمیت کے قایل ہیں بلکہ مضمون کی تازگی اور اجتماعی زندگی کو شعر میں منعکس کرنے کو لازمی قرار دیتے ہیں اور اس کام کے لیے قدیم سانچوں کو بھی ناقابل نہیں سمجھتے ہیں[1]

بارق کے اشعار کا پہلا مجموعہ جو اُن کے قدیم اور جدید دونوں طرز کا نمایندہ ہے "ستاک" کے عنوان سے ۱۳۴۲ ش میں کابل میں شایع ہوا[2]

---

[1] محمد سرور مولائی۔ برگزیدہ شعر معاصر افغانستان "چاپ زر۔ تہران۔ ۱۳۵۰/۱۹۷۱ ص ۳۶

[2] " " " " " " " " ص ۳۷

اُن کے اشعار کا ایک نمونہ جو ذیل میں نقل کیا جا رہا ہے وہ شاعر کی بلند پرواز اور ناقابلِ تسخیر روح کا نمایندہ ہے۔ اس میں اُس نے اپنی بلندیِ فکر اور جوان و روشن تخیل، اپنی قیمتی زندگی اور پھر اپنی آرزوؤں اور تمناؤں کا مفصل ذکر کیا ہے اور اگرچہ اشعار شعرِ جدید کا انداز رکھتے ہیں لیکن پھر بھی وزن اور آہنگ سے خالی نہیں ہیں وہ اپنے آپ کو "عقاب و عنقا" سمجھ کر یہ بتاتے ہیں کہ اُن کا شکار مشکل ہے۔ وہ اپنی فکر کو "چراغِ راہ" اور "نورِ زندگانی" کہتے ہیں اور اپنے اشعار کی خزاں کو باغِ ہستی کی بہار کے زوال سے تشبیہہ دیتے ہیں اور آخر میں اپنے آج کو کل کا معمار قرار دیتے ہیں۔

معمارِ فردا[1]

مشو در فکرِ تسخیرِ خیالم
بہ دام آوردن عنقا خیال است
عقابِ چرخ تازم
شکارِ من محال است
بہ اوجِ من پریدن!
نہ کارِ مرغکِ بشکستہ بال است
جہاں پیرا فکرِ جوانم:
چراغِ راہ و نورِ زندگانی است،
منم نیرویِ ہستی
کمالم در جوانی است
نہ پیلا فگندن من!
بہ آئین جہاں داری وبال است

---

[1] بارق شفیعی۔ شہرِ حماسہ۔ کابل ۱۳۵۸/۱۹۷۹ء ص ۹۲

روانم روشن از اندیشۂ پاک
دلم سرشار ذوق جستجو ہا
درون سینہ ام بین
بہشت آرزو ہا
خزان شعر من ہم :
بہار باغ ہستی را زوال است
منم آں اختر رخشندہ عشق :
فروغم نور چشم رہروان است
نگیر دکس عنانم
زمینم۔ آسمان است !
شکوہ و تابش من :
جمال زندگی را جلال است
بیا آیندہ را در حال من بین
بود امروز من معمار فردا
مکن بیہودہ ویران
مرا کاخ تمنا
سر راہم گرفتن :
بہ یزداں ! کار دیو بد سگال است [1]

بارق شفیقی نے شاعری کی اصناف میں طبع آزمائی کی ہے۔ ذیل میں اُن کی ایک غزل پیش کی جارہی ہے۔ جسے انھوں نے "رہی معیری" ایرانی شاعر کی غزل کے پہلے شعر کو متعارف کرانے کے بعد اپنی غزل لکھی ہے۔ رہی معیری کا شعر اِس طرح ہے :۔

---

[1] بارق شفیق۔ شہر حماسہ، کابل ۱۳۵۸/ ۱۹۷۹ء صـ ۹۲ـ۹۴

داروی سوز درون ما شراب ناب نیست — آتش این لاله را افسردگی از آب نیست

بارق کی غزل کا عنوان "گوہر نایاب" ہے اور انھوں نے ایرانی شاعر کے کلام سے الہام حاصل کیا ہے:-

ہر دل بیتاب را تاب شراب ناب نیست — آتش است این درد دل پیمانہ آخر آب نیست

طاقت پروانہ خواہد آرزوئی آتشین — شعلہ را در برکشیدن کار ہر بیتاب نیست

موج شو از خود برا، بر دوش طوفان سیر کن — گرد خود گشتن بجز خاصیت گرداب نیست

ہر قدم در زندگانی انقلاب دیگر یست — ہوش کن! صحرائی ہستی بستر سنجاب نیست

گرم فریادم کہ جان زندگی سرد است سرد — دین حرارت در دل خورشید عالمتاب نیست

بارق، این جا دیدۂ غواص کور افتادہ است

ورنہ اندر بحر شعرم گوہر نایاب نیست [1]

بارق کی یہ غزل روایتی غزل گوئی کی بنیاد پر سات اشعار پر مشتمل ہے اور اشعار کے عدد کی بنا پر اگرچہ اس روایتی معیار پر پوری نہیں اترتی ہے۔ لیکن آخری دور میں پانچ ابیات کی غزل بھی لکھی گئی ہے۔ بہر حال یہاں تو مقصود شاعر کی شاعری کی نوعیت سے ہے کہ اگرچہ اس حقیقت کے باوجود کہ بظاہر تو غزل ہے لیکن اس کا ہر مصرعہ شاعر کے اندرونی انقلابی رنگ کا آئینہ دار ہے اور آتش، آرزوئی آتشیں، شعلہ، موج، توفان، گرداب، صحرائی ہستی، فریاد و خورشید عالمتاب جیسے کلمات اس بیان پر دال ہیں۔

اب آئیے بارق شفیعی کی ایک نظم کا مطالعہ کریں جو نہ صرف جدید طرز میں ہے۔ بلکہ ۲۲ سال قبل کی اس وقت کی تصنیف ہے جب کہ آزادی اور انقلاب جیسی مطبوعات کا نام و نشان تک نہ تھا، کابل میں چھپی تھی۔ اپنے نالوں سے مخاطب ہو کر یوں کہتا ہے:-

---

[1] بارق شفیعی، شہر حماسہ، کابل ۱۳۵۸/۱۹۷۹ء، ص ۱۰۵

ای ناله سالهاست که بیرون جهی ز دل
هنگامه سازوگرم
پرسوزوآتشین
شبها
به گاه تیرگی مرگ بار غم
از گیر و دار دهر
وز دست رنجها
در پیچ و تاب موج سبکسیر آه من
زی آسمان بسوز تمناشدی بلند
پر درد و شعله خیز
تند و شرر فزا
لیکن
نسوخت پرده اوهام گرمیت
برقی نزد شراره‌ات اندر نگاه من
نی سوختی سپهر
نی کاخ قدر قدس
نی رخنه کرده بدل پاسبان او
تا چند و تا کجا
در بند آن و این
محبوس وهم و ترس، گرفتار مهر و کین
ای ناله
یا خموش و یا آسمان بسوز
تا باز گرددآ نشنوی این پرده راه من
در آن بلند جای
از قدسیان عرش.

وز محرمان بزم حقیقت کنم سوال
کائی آں کہ رستہ اید ز غوغائی مہر و کیں
آں جا چرا چنان
ایں جا چرا چنیں .... [1]

شاعر اپنے نالہ سے خودشاکی ہے کہ اُس کی اس قدر زیادہ حرارت اور گرمی کے باوجود اور پریشانیوں کی بنا پر اُس کا ہاتھ دعا اور مہر یار کے لیے آسمان کی طرف اٹھتا ہے کہ وہ اب تک سماج کی خرافات اور نابرابری کے اوہام کے پردے کو چاک نہیں کر سکا ہے اور آسمان کے اس زبردست اور بلند کاخ کو جلا کر راکھ نہیں کر سکا ہے۔ چوں کہ اُس زمانہ میں شعرا اور مصنفین ظلم و استبداد کے خلاف واضح طور پر نہیں لکھ سکتے تھے۔ اس لیے کہا جا سکتا ہے کہ شاعر نے کاخ سپہر کو کاخ سلطنت کا کنایہ بنایا ہے اور اس منظومہ کے آخری ابیات میں اُس کی مراد سوشلزم سے ہے اور بہت سے کلمات سے سوشلسٹ اور اس کے نظام کو مدِ نظر رکھا ہے۔

شاعر نے اپنی پرشور پیدا نشتی روح کے خلاف اسی لیے شکوہ کیا ہے کہ دل نالہ اور احساسات کے اظہار سے اس سکوت کو توڑ دے کیونکہ اخذ شدہ نتائج اور تجزیہ سے ظاہر کرتا ہے کہ وہ اپنے سماج کو اپنی خواہشات کے مطابق فعال اور متحرک نہیں پاتا ہے اور اُسے "مُردوں کی بزم" سے تشبیہہ دیتا ہے اور "شبستان قبرہا" کہتا ہے اب اُن کی نظم ملاحظہ ہو:۔

شبستان قبرہا ...... [2]

ای دل خموش باش
کمتر بہ سینہ زن

---

[1] محمد عثمان صدقی۔ سیر ادب در افغانستان۔ کابل۔ ۱۳۴۰/۱۹۶۱ء ص ۴۲ ۔ ۴۳

[2] محمد سرور مولائی، برگزیدہ شعر معاصر افغانستان۔ انتشارات ذر، تہران، ۱۳۵۰/۱۹۷۱ء ص ۳۹

آهسته تر بتپ که محیط تو کوچک است
گیرم قفس شکست
پرواز گاه کو
این جا فضا کثیف تر از سینه ها بود
این نغمه های گرم
وین ناله های درد
هر چند گرم تر برود بی اثر شود
این زخمه ایست سرد.
خاموش و بی صدا
افسرده تر ز انجمن مرده ها بود
گر در سکوت شب
با بال آتشین
بی نردبان کاه کشان بی چراغ مه
از چرخ بگذری
وز بام عرشیان
پر شور تر فغان کنی پرسوز تر نوا
گر کوه های سخت
یکسر شوند آب
وآن آبها بخار.
وین تیره خاک چشمه آتش چو آفتاب
این زنده مردگان
چون شعله های سرد
از پا فتاده اند
باری مکن خروش
آرام شو خموش

زیں بیشتر روان من بینوا مسوز
حیف است از چو منی
بیہودہ سوختن
در بزم مردگان و شبستان قبرہا ..... [1]

جیسا کہ ہم نے اس نظم سے اندازہ کیا ہے کہ شاعر اوضاع زمانہ سے راضی نہیں اور اپنے لوگوں اور معاشرہ کو سست اور بے حس قرار دیتا ہوا کہتا ہے کہ اگر کوئی معجزہ پیش آجائے جو اپنے "بال آتشیں" سے اپنی شخصیت کو "بام عرشیاں" پر پہنچا دے اور ایسے نالے سر کرے کہ سنگین پہاڑ پانی پانی ہو جائیں اور وہ پانی بھاپ بن جائیں لیکن پھر بھی "این زندہ مردگان" جس سے مراد سوسائٹی کے افراد ہیں، اپنی جگہ سے نہیں ہلیں گے۔ پھر اسی لیے ان مردوں کی بزم میں بے کار جلنے کی ضرورت محسوس نہیں کی جاسکتی ہے۔ اسی بنا پر وہ اپنے دل کو خاموش رہنے کی نصیحت کرتا ہے اور بے نوا شاعر کی روح کو نہ جلانے کی درخواست کرتا ہے۔

بارق شفیعی ہمیشہ سوسائٹی کی پریشانیوں، عدم مساوات، ظلم، استحصال اور ہوس رانی پر غمزدہ رہتا ہے۔ چنانچہ ایک اور منتخب اور مندرجہ ذیل منظومہ میں شاعر جب یہ محسوس کرتا ہے کہ اس معاشرہ میں کوئی بھی نیک اور پاک باز انسانوں کو کسی قابل نہیں سمجھتا ہے تو وہ خود اپنے صبر کا دامن ہاتھ سے چھوڑ دیتا ہے۔ اور اس ضرب المثل کے مانند جو لوگ اکثر استعمال کرتے ہیں "خواہی نشوی رسوا ہم رنگ جماعت باش" اپنے آپ کو آزاد چھوڑ کر ہوا و ہوس کا خواہش مند ہوتا ہے۔

آمال ..... [2]

ای شعلہ ہای شوم ہوسہای نابکار
باشید بعد ازیں ہمہ در فکر کار من

---

[1] محمد سرور مولائی برگزیدہ شعر معاصر افغانستان۔ انتشارات ندا تہران ۱۳۵۰ / ۱۹۷۱ء ص ۳۹ — ۴۰
[2] ایضاً ص ۴۲ — ۴۵

چون آتش جهنمی لذت گناه
سوزید هستی دل پرهیزگار من
کانجا نه جای جلوهٔ دلهائی پارساست

آن جا که عشق جلوهٔ آمال دوزخیست
ارجی نمی نهند سپید و سیاه را
شبها نهند لب به لب روسپی بتی
تا صبح سرکشند شراب گناه را
پرهیزگار نیست، اگر هست بی نواست

ای روشنی جان من اندیشه هائی پاک
ای شمع شعر دلکشم، ای اختر جمال
زین پس چراغ بزم هوس های من شوید
کانیست در زمانهٔ ما جلوهٔ جمال
دنیای ذوق را همه جا اهرمن خداست

آن جا که دختران فریبا برند دل
جام شراب باشد و زیبائی بی حجاب
اندیشه شهوت و جان مست لذتست
دیوا نگیست راه دگر کردن انتخاب
دنبال عقل و هوش شدن سخت نا بجاست

ای شاهد برهنهٔ بزم هوس برقص
ای روسپی نژاد پیاپی شراب ده
وز تارهائی روح من و زخمهٔ دلم
کیفیتی به نغمه بریز و رباب ده
بنگر که ساز هستی من نیز دل رباست

من نیز ذوقی دارم و دل دارم و امید
تا چند یاد منت هر آن و این کشم

با ہر کہ ہر چہ است بسازم بہر کجا
دیگر نہ رنج و سوسۂ مہر و کین کشم

کاین چند روزہ عمر، بہ این غم کشی خطا است

جب شاعر یہ مشاہدہ کرتا ہے کہ اُس کے عہد میں اور گرد و پیش، نیکی اور بدی اور سپید و سیاہ کا فرق نہیں ہے۔ باوجودیکہ برائی، خرابی، عیاشی اور ہوسبازی کا ذکر کرتا ہے۔ لیکن آخر آخر میں پارسائی کا کوزہ توڑ دیتا ہے اور چاہے جو کچھ ہو کہتا ہوا اپنے آپ کو عیاشی اور ہوسرانی کے سپرد کر دیتا ہے۔ وہ چیز جس کو اس قدر جلد اپنے آپ کو حوالہ نہیں کر دینا چاہیئے تھا اور تسلیم کر دینا ممکن نہ تھا، لیکن افسوس کہ اس نظم میں اپنے دوسرے منظوموں کے برعکس اپنی جنگجو روح کو زبردستی اپنے ہاتھوں سے کھو دیتا ہے۔

ایک اور شعری قطعہ جو ذیل میں نقل کیا جا رہا ہے۔ جس میں شاعر جمہوریہ روس میں عوامی انقلاب، وہاں کے لوگوں کی بہادری اور رہبر انقلاب لینن کا ذکر کرتا ہے اور لینن اور اُس کی پارٹی کو سلام کہتا ہے اور چونکہ لینن اور روس کے عوام نے اپنی پارٹی کی رہنمائی کی روشنی میں سرمایہ داروں کی طاقت کے محلات کو انقلاب کی صدا سے سرنگوں کر دیا تھا، اس لیے اُن کا احترام کرتا ہے۔ جدید طرز میں لکھی ہوئی نظم اس طرح ہے۔

در بیکران ہستی ز رفنائی آسمان
از مہر شعلہ ہائی فروزان آفتاب
تا تنگنائی سینہ ہر ذرہ، روزگار
دیدہ است بیشمار
عریان و بی حجاب

اعجاز آفرینش نیروی انقلاب

آری ، جهان ما
بزم ستارگان درخشان آسمان ،
اندر مسیر شعله درخویش هر زمان ،
در جلوه گاه هستی جاوید و بیکران ،
در طول قرنها ،
دیده است بی حجاب
رقص پدیده ها ،
بازیگران صحنهٔ تمثیل انقلاب
اما ندیده است ،
دنیای اختران ،
جز در سپهر هستی انسان پدیده ئی
خلاق و باشکوه ، جهانسا زوبی مثال
انسان که در دیار لینن ، مهر انقلاب ، استارهٔ زمین
آری درین دیار
دهقان و کارگر
مردان کارزار
در روشنی دانش حزب کبیر خویش
از بعد قرنها
از بعد قرنهائی فراوان بردگی
یکباره پرده هائی نظام کهن درید
نظم نو و جهان نو ، عصر نو آفرید
شیپور انقلاب
فریاد توده ها ،
لرزاند کاخ قدرت سرمایه راچنان

کز رعب و ہیبتش،
لرزید برج قلعه و پشتنه ستم گراں
اعلام کرد عصر رہائی خلق ہا
زین کار بی نظیر،
از ما درود باد! به آن حزب پیشتاز
بر خلق قهرمان
و ز ما درود باد به آن رہبر بزرگ
بر لینن کبیر......[1]

بارق روس کے سوشلسٹ انقلاب کے اس حد تک زیر اثر ہیں کہ وہ دعوا کرتے ہیں کہ جہاں آفرینش، ہمارا زمانہ اور ہماری یہ دنیا یعنی سورج، چاند، ستارے اور یہ آسمان ان تمام طویل صدیوں میں منعقد ہونے والے انقلابات کے معجزات مشاہدہ کر چکے ہیں۔ لیکن لینن جیسے انسان کی مثال نہیں دیکھی ہے۔ جو کہ ایک درخشاں ستارہ کی مانند اپنے عوام کو انقلاب کی طرف لے گیا، پرانے نظام کے پردوں کو چاک کیا، نیا نظام پیش کیا اور اسی اپنے بے مثال کارنامہ کی بدولت وہ اور اُس کی جماعت قابل درود و ستائش ہیں۔

افغانستان کے اس شاعر کی مانند ایران کے دو شعرا فرانس کے عوامی انقلاب کے حامی رہے ہیں وہ بھی لینن اور اُس کے انقلاب کے مداح اور ثنا خواں رہے ہیں اور اُس کی تعریف میں بارق کی طرح نظمیں لکھ گئے ہیں۔ اُن میں ایک معروف شاعر عارف قزوینی ہیں دوسرے وحید دستگردی ہیں۔ وحید نے تو اُسے "نور عدل بر ظلمات ظلم" اور کاوہ آہنگر سے تشبیہ دیتے ہوئے مبارکباد دی ہے۔

ای لینن ای فرشتہ رحمت کن قدم رنجہ زود بی زحمت
تخم چشم من آشیانہ تست ہین بفرما کہ خانہ خانہ تست

[1] تنظری۔ ترانہ ہای دوستی، کابل ۱۳۵۹/ ۱۹۸۰ء/ ص ۱۳

به زنجیر بیرا ز من پیام کز اشراف — دگر بدوش تو بار گران نخواهد ماند
گدائی کوی خرابات را بشارت ده — که منقریب شده کامران نخواهد ماند۔[1] عارف

چو شد ظلمات ظلم وکین جهانگیر — به ظلمت نور عدل و داد شد چیر۔۔۔
لینن کارگر با لشکر سرخ — هویدا گشت در دشت اختر سرخ
جهان از بطن حوا صلب آدم — دو کاوه زاد نه افزون و نه کم ۔
یکی از اصفهان ایران بیاراست — ز مسکو دیگری گیتی بپیراست
"نژادی" ازان یک تا مور شد — وزین یک زنده تا کار گر شد
نخستین با درفش کاویان خاست — دوم با اختر سرخ از جهان خاست
مبارکباد این جنبش لینن را — که جنبانید چون حلقه زمین را۔[2] وحید

بارق شفیعی کو اپنے یہاں افغانستان میں انقلاب ثور کے بعد لینن کی اس سرزمین اور انقلاب کے نتائج دیکھنے کا موقع ملا اور وہ بھی ریاست تاجکستان جو اس کے مسلک اور ہم قوموں کا مامن و مسکن تھی چنانچہ خوشی اور سرشاری میں وہ جو قصیدہ پڑھتا ہے وہ معمار اور دوستانہ ہے ۔

پیام دوستی۔۔۔۔[3]

من پیام دوستی از افغاند یار آورده ام
زی شما با خود درود بی شمار آورده ام
چون نسیم نو بهاراں در گلستان هنر
از دیار آشنا پیغام یار آورده ام
می ندانم مردم خوشبخت شهر آفتاب
من پیام اختر شب زنده دار آورده ام

---

[1] یحیی آرین پور، از صبا تا نیما جلد دوم، تهران — ص ۳۵۱
[2] " " " " " — ص ۴۲۷

من سلام گرم "پیشتاهنگ خلق" خویش را
بر رفیقان عزیز تر هم جوار آورده ام
زی شما ای پیشتازان بزرگ انقلاب
مژدهٔ پیروزی پر افتخار آورده ام
مژده جهان آفرین انقلاب ثور را
زی دیار انقلاب و صلح و کار آورده ام
ممتنع و سهل و بی پیرایه می گویم سخن
نیز بجای شعر زی شاعر شعار آورده ام
سخت می بالم که در گلزار "مولانای بلخ"
گلبن امید عینی، آبیار آورده ام
عشق را چون پوشکینم مرهتر را گور کی
نقش لاهوتی به شعر شعله بار آورده ام
خرده بر لطف نواسنجان با غم داده اند
گر گلستان سخن را مشت خار آورده ام
نیک دریا بید جانم را که زی بزم شما
بعد عمری آرزو و انتظار آورده ام
از نسیم هر نفس هر دم شگوفا می شوم
غنچه دل را تو گوئی زی بهار آورده ام
گر نگردد ارمغان و دلپذیر دوستان
این دل پر مهر را بهر چکار آورده ام [1]

اس قصیدہ میں قدما کا مخصوص طرز و انداز جھلکتا ہے اور خود افغانی شاعر استاد خلیل اللہ خلیلی کا رنگ نمایاں ہے جو قدیم طرز اور سبک کے نمایندہ ہیں ،

---

[1] گ. نظری، ترانہ ہائی دوستی، کابل، ۱۳۵۹ھ/۱۹۸۰ء ص ۲۲ — ۲۴

خلیلی نے جو کہ ۱۳۴۲/۷۳-۱۹۷۲ء میں منعقد ہونے والے امیر خسرو کے صد سالہ جشن میں شرکت کے لیے آئے تھے، ایک مسدس پڑھا تھا اور جس کا یہ شعر قابلِ ذکر ہے۔ بعد بارق نے اسی کی پیروی میں کہا تھا:۔

خسرو ادربار گاہت ارمغان آوردہ ام
از شبستان سنائی داستان آوردہ ام

من ز باغ عنصری گلہائی سرخ شعر را
بر مزار رودکی بہر نثار آوردہ ام

وزن آہنگ اور قافیہ شاہد ہیں کہ بارق نے خلیلی سے الہام حاصل کیا ہے۔ بارق کے کلام کے دقیق مطالعہ کے بعد قاری اس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ موصوف جدید شعرا کے کارواں کے ہم سفر اور جدید طرز کے شاعر ہیں۔ لیکن گاہ گاہ کارواں گزشتہ کے نقش پا پر بھی نظر ڈالتے ہیں اور انھیں نظر انداز نہیں کر سکتے۔

اگرچہ اُن کے بیشتر اشعار جدید ہیں لیکن غزل اور قطعات سے بے بہرہ نہیں رہے ہیں۔ اگر ایک طرف وہ جدید طرز میں لاہوتی اور نیما یوشیج کے پیرو ہیں۔ تو دوسری طرف قدما کی طرز میں رہی معیری اور خلیلی سے بھی چشم پوشی نہیں کی ہے اور مجموعی حیثیت سے بارق کو آتش جواں اور انقلابی شاعر گردانا جا سکتا ہے۔

عبدالحی آرین پور (رستاق)

آرین پور کے بارہ میں رواں فرہادی ... لے نے اپنے "نہال" نامی مجموعہ

لے دیوان خلیلی، چاپ بنیاد فرہنگ ایران، تہران ص۳۶

کے مقدمہ میں جو کہ ۳۰ سال قبل ۱۳۴۳ش / ۱۹۶۴ء میں شایع ہوا تھا۔ لکھا ہے کہ جس کے حساب سے ۱۹۸۵ء میں وہ ٹھیک ۵۱ سال کی عمر کے ہو گئے ہیں اور اس حساب سے غالباً اُن کی پیدائش ۱۳۱۳ کی ہوگی۔

"نہال" کے مقدمہ میں اُن کی سوانح حیات کا ذکر اس طرح ہوا ہے :-

"رستاقی نے اپنے بچپن کا زمانہ دریائے آمو کے حسین ساحل کے ٹیلوں میں بسے علاقہ رستاق میں بسر کیا اور ثانوی تعلیم حاصل کرنے کے لیے کابل کے دار المعلمین آئے اور سیاسیات اور قانون کی تعلیم حاصل کرنے کے دوران بہت زیادہ شاعری کی ہے۔ چار سال سے وہ فاریاب کے شہر میں کبھی تو وکیل عمومی رہے ہیں اور ایک زمانہ تک ہرات میں تحریرات کے ڈائریکٹر اور اس کے بعد بامیان صوبہ کے سیغان اور کہمرد کے علاقہ میں حاکم مقرر ہوئے اور فی الحال اپنے مولد تخار کے منطقہ میں ینگی قلعہ کے حاکم کی حیثیت سے مقرر ہیں"۔۔۔۔[1]

رستاقی کی شاعری کے بارہ میں فرہادی کا تبصرہ ان الفاظ میں ہے :-

"تا چند سال پیش آرین پور رستاقی تلمیذی در مدرسہ سبک ہندی بود و بیم آں می رفت کہ جز ہماں تلمیذ چیزی نماند ہماں۔ بود کہ بادہائی مساعد زورق اورا بساحل شور انگیز فردا برد و از اسارت دریکی از جزایر حزن آور دیروز بر کنار گردید"۔۔۔۔[2]

اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ رستاقی کا شعری ذوق اور وجدان کس قسم کا ہے۔ وہ خدا، رسول صلعم، وطن اور محبوب کے بارے میں اپنے کس قسم کا تصورات اور عقاید کا اظہار کرتے ہیں۔ چنانچہ سب سے پہلے اُن کی ایک حمد پیش کرتے ہیں۔ جو ذیل کے عنوان کے تحت درج ہے۔

---

[1] نہال۔ مقدمہ (ج۔ د) کابل ۱۳۴۴ / ۱۹۶۵ء

[2] " " " " " " " "

به پیش گاه خداوند

الٰهی درین کشور آب و گل — عطا کردهٔ بهر من باغ دل
به باغی که ایمن ز باد خزاں — نرنجیده از شوقی باغباں
زمینش ز خاک ارم پاک تر — هوایش زمینو فرخاک تر
ز جوئی ازل آبیاری شده — نه ممنون ابر بهاری شده
در آن باغ کردی مرا باغبان — نمودیم را بائی سود و زیان
چو من بے خبر بودم وبی کمال — ز جهلم پذیرفت باغم زوال
ره آبیاری نیاموختم — خود از تشنگی باغ را سوختم
خدایا توئی کارساز همه — سوی تست روی نیاز همه
توئی خرمی بخش باغ جهاں — ز تو رنگ گیرد بهار و خزاں
کرم کن ز گلزار لطف عمیم — نسیم فرح بخش عنبر شمیم
که یکبار باغم گلستان شود — معطر ز بوئی گلم جان شود[1]

اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں اپنی مدحیہ نظم کو شاعر صاف دل اور پاک اور روشن دماغ کے ذکر کرکے ساتھ شروع کرتا ہے، اپنے آپ کو اس دنیا کا باغبان کہتا ہے لیکن اپنی جہالت پر افسوس کرتا ہے کہ باوجود خدا کی رہنمائی کے اس کے باغ کو سرسبز یعنی علم و معرفت کے نور سے منور نہیں کر سکا ہے اور جس کے نتیجہ میں اس کا دل معرفت الٰہی سے خالی ہے اور بنجر ہو گیا ہے۔ وہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں گریہ وزاری کر رہا ہے کہ وہ اسی کے قلب کے گلزار کو رونق اور تازگی بخشے تاکہ وہ معرفت حق کی باد نسیم سے فیضیاب ہو جائے۔

اسی طرح اب ہم یہ بھی دیکھیں کہ رستاقی خداوند بزرگ و برتر سے ہم کلام ہو کر حضور محمد صلعم کے دربار میں کیا عرض کرنا چاہتا ہے۔ پہلے تو وہ آنحضور کی صفات علی

---

[1] آرین پور، نہال کابل ۱۳۴۴ ش / ۱۹۶۵ء ص ۳۰۲

یں نغمہ سنج ہوتا ہے اور اس سلسلہ کو اس طرح مختصر کرتا ہے کہ شاعرانہ گریز کے پیرایہ میں سرودِ کائنات کی مدح کرنے سے اپنی زبان کو قاصر اور عاجز سمجھتا ہے اور کہتا ہے کہ جس کی تعریف خدا کرتا ہے بندہ کی کیا مجال ہے کہ زبان کھولے وہ اپنی اس حقیقت گوئی میں صادق ہے کیونکہ ایک انسان کے سیکڑوں الفاظ اللہ تعالیٰ کے ایک حرف اور کلمہ کے برابر وہ اعجاز اور اثر نہیں دکھا سکتے جو اُس کے پیغمبر کی شان میں خود اُس نے کہا ہو، شعر کے آخری حصہ میں شاعر اپنی تیرہ بختی جہالت، بدبختی، دنیا کی بے مہری اور لوگوں کے مظالم کا ذکر کیا ہے اور فریاد کی ہے اور حضور کی بارگاہ میں ان سب کی چارہ جوئی کی درخواست کی ہے :-

بہ پیش گاہ محمدؐ [1]

ای ملکی شیوہ قدسی صفات	باعث ایجاد ہمہ کائنات
ای گہر لجّۂ بحر ازل	تازہ بہار چمن لم یزل
جائیکہ وصف تو خدا می کند	لب بہ سخن بندہ چرا می کند
نامہ سیاہم و گنہ افتخار	جاہل و غفلت زدہ و نابکار
تیرہ و تاراست بس ایام ما	منقلب افتادہ سرانجام ما
صلح و صفا در ہمہ عالم نماند	مہر و وفا در دل آدم نماند
ہر کہ قوی دست و توانا بود	غصب کن حق دگرہا بود

چارہ بے چارگی ما نما
رحم بہ آوارگی ما نما

افغان کے دوسرے شعرا کی مانند رستاقی بھی اپنے وطن سے بے پناہ محبت کرتا ہے۔ اپنے ایک ترجیع بند نما منظومہ میں شاعر نے حتی الامکان ملک کی تمام قابل ستائش چیزوں کا ذکر جن میں گذشتہ دور کے عظیم النسانوں اور تعمیرات اور سابقہ شان و شوکت شامل ہے، انتہائی فخر اور غرور کے ساتھ

---

[1] آرین پور نہال کابل ۱۳۴۴ش / ۱۹۶۵ء ص ۳۰۱

کیا ہے اور وہ بھی اس خوب صورتی کے ساتھ بیان کیا ہے کہ استعارات اور تلمیحات کو اس کا حصّہ بنا دیا ہے۔ مثلاً "نہ کرسی آسمان" کا اشارہ ظہیر فاریابی کے مشہور قصیدہ کا مطلع ہے جو قزل ارسلان کی مدح میں لکھا گیا ہے۔ اسی طرح کابل کے وصف میں صائب کے کہے ہوئے قصیدہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے، رستاقی نے اپنے قصیدہ وطنیہ میں "دل دادہ ز دست صائب آنجا" کا وہی مدعا بیان کیا ہے:-

بہ پیش گاہ وطن

ای مامن و زادگاہ افغان — گہوارہ پاک رادمردان

ای خطہ رادمرد پرور — خال رخ تو عروس خاور

ای صعوہ تو حریف شہباز — آہوت بہ شیر می کند ناز

پیوستہ ترا چنین کنم یاد

تا دامن حشر باشی آزاد

بلخ تو کہ مادر بلاد است — مہد فضلائی پاکزاد است

چوں مولوی آفتاب عرفان — آن محرم رازہائی قرآن

در منطق و فلسفہ توانا — فرزند تو بوعلی سینا

این واقف رازہائی حکمت — آن مست ز بادۂ طریقت

ہرات کہ زادگاہ جامی ست — آغوش چہ مردہائی نامی ست

ہر شب بہ مزار پیر انصار[1] — صد بوسہ زند سپہر دوار

غزنی تو بارگاہ مسعود[2] — شاہنشہ روزگار محمود[3]

منزل گہ اولیائی واثق — مہد فضلا و اہل تحقیق

چوں خسرو ملک جاں سنائی — خورشید ادب فشاں سنائی

[1] مراد خواجہ انصاری سے ہے۔

[2] مسعود غزنوی پسر محمود غزنوی۔

[3] محمود غزنوی۔

در کنگره های قلعه بُست — آثار جلال شوکت تست
لعلیکه تراست در بدخشان — نایاب بود به چشم دوران
از خاک مزار فیض آثار — از مهد ظهیر تا به قیصار
این خطه بود همه صفاخیز — فرزانه پرست و مردانگیز
نه کرسی آسمان همین جا[1] — اندیشه نهاده در ته جا
ای مامن و زادگاه افغان — گهواره پاک راد مردان

پیوسته تراکنم چنین یاد
تا دامن حشر باشی آزاد

بگرامی و بامیان تو داری — معمورهٔ باستان تو داری
هر ذره او زبان تاریخ — در پیچ و خمش جهان تاریخ
بوم و بر با صفاست کابل — جان پرور و دلرباست کابل
منزل گر کاروان چین است — انگشتر خاک را نگین است
دل داده زدست صائب آنجا — بی می شده مست صائب آنجا
ای خطه راد مرد پرور — خال رخ نوعروس خاور
تو وارث کشور یمائی — شیرازه نسل آریائی
آمو به زبان بی زبانی — از شوکت تست ترجمانی
ای ورد زبان آرین پور — وی جان جهان آرین پور

پیوسته تراکنم چنین یاد
تا دامن حشر باشی آزاد

مامن و زادگاہ، گہوارہ پاک، خال رخ نوعروس خاور، آفتاب عرفان، محرم راز ہائی قرآن، واقف راز ہائی حکمت مست زیادہ طریقت فرزانہ پرست، معمورہ باستان، لعل بدخشان منزل گر کاروان وغیرہ جیسی خوب صورت ترکیبیں اور استعارے نظم کا کمال ہیں اور شاعر کی روانی قلم سلاست زبان

---

[1] نہ کرسی فلک نہد اندیشہ زیر پا تا بوسہ بر رکاب قزل ارسلان نہد۔ ظہیر فاریابی

اور انداز بیان کا واضح ثبوت ہیں۔

دستاقی نے اسی ایک وطنیہ غزل میں مخصوص طور سے کابل کی شان میں جو باتیں کہی ہیں وہ نہ صرف ایک طرف شاعر کی اپنی اس خصوصی سرزمین سے محبت اور عقیدت کی مظہر ہیں بلکہ دوسری جانب کابل کے حسن اور اس کے دلکش اور تاریخی مقامات کا درجہ بھی متعین کرتی ہیں:۔

کابل

خوشا عشرت سرائے کابل و دامان کہسارش
کہ ناخن بر دل گل میزند مژگان ہر خارش

خوشا وقتیکہ چشم از سوادش سرمہ چین گردو
شوم چوں عاشقاں و عارفاں از جاں گرفتارش[1]

ز وصف لالہ اورنگ بر روی سخن دارم
نگ را چہرہ خون سازم ز سیر ارغوان زارش

چہ موزوں است یارب طاق ابروی پل مستان
خدا از چشم شور زاہدان یا دانگہدارش

حصارِ مار پیچش اژدہائی گنج را ماند
کہ می ارزد بہ گنج شایگان ہر خشت دیوارش

نماز صبح واجب می شود بر پاک داماناں
سپیدی می کند چوں در دل شب یاسمن زارش[2]

---

[1] عاشقاں و عارفاں، کابل کی قدیم آبادی کی دو پرانی زیارت گاہیں ہیں۔

[2] بڑی دیوار ہے جہاں کوہِ آسمائی اور شیر دروازہ جو فی الحال کابل کے داخلی حصے میں رکھ دیے گئے ہیں۔ ساتویں صدی میں اسلامی افواج کی فتح اور برتری کا مظہر تھے اور سلاطین نے اس کو تعمیر کروائے تھے۔ اب بھی اپنی جگہ پر قائم ہیں۔

[3] ہاشم اُمید وار ہروتی، دیوان خلیل اللہ خلیلی تہران ۱۳۴۱ صہ۱۲۱

رستاقی نے فطرت اور قدرت دونوں کا گہرا مطالعہ کیا ہے زندگی کے بار
میں شاعر کا تجزیہ اور مشاہدہ دوسری رباعیوں اور فارسی کے جدید شعرا کے
مقابلے میں کمتر نہیں ہے چنانچہ زندگی کو شعلہ خاموش، شمع سحر، آفتابی نشستہ
اشک استادہ مژگان آتش کارواں رفتہ شمع درماندہ، خواب ناشدہ تعبیر، جلوہ آرزو
نقش خیال ابر، بحر اور آرزو ہائی خاک گردیدہ جیسے بیسیوں خوبصورت
ترکیب بند جملوں، اصطلاحوں، تشبیہوں اور استعاروں سے، مثال دیتے ہوئے
نظم کو آراستہ پیراستہ نہیں بلکہ موثر اور دل نشیں بھی بنایا ہے۔ ملاحظہ ہو :۔

دخمۂ حیات

زندگی چیست شعلہ خاموش زود بشکستہ ہمچو شمع سحر
بوی پیچیدہ در دل غنچہ گل خندیدہ بر رخ صرصر

آفتابی نشستہ بر لب بام اشکی استادہ بر سر مژگان
آتشی کاروان رفتہ سحر شمع وا ماندہ در رہ طوفان

زندگی خواب نا شدہ تعبیر جلوہ آرزو و نقش خیال
آں چہ خواہد ز تو ہمہ ممکن ہر چہ خواہی از و محال محال

ابر لیکن چہ ابر دریا بار بحر اما چہ بحر طوفان خیز
آدمی نا خدائی گم شدہ راہ اندر آغوش موجہا بہ ستیز

زندگی دخمۂ کہ خفتہ دراو عشق ہائی وصال نا دیدہ
سر بسر گامہائی گشتہ شہید آرزو ہائی خاک گردیدہ

زندگی نام تلخی و آلام — در گذر بے وفا گذاشتنی
مظہر رنج و ناامیدی ہا — این ہمہ لیک دوست داشتنی [1]

شاعر نے زندگی کا جو نقشہ کھینچا ہے وہ بہت مختصر اور پل بھر کا ہے کوئی شخص اپنی آرزو اور مراد پر قادر نہیں ہو سکا اور خواہش کے مطابق لذت حاصل نہیں کر سکتا ہے اور اگرچہ زندگی، تلخ، بے وفا اور مایوس کن ہے اس کے باوجود عزیز اور دوستی کے لائق ہے۔ لیکن یہاں یہ کہنا پڑے گا کہ زندگی صرف ان لوگوں کے لیے عزیز اور دوست ہو سکتی ہے جو اُس کے اسرار کا پتہ لگاتے رہے ہیں ورنہ کتنے ہی ایسے افراد موت کی آرزو کرتے ہیں اور شرم اور مصیبت کی زندگی کے خواہش مند نہیں ہیں۔

رستاقی کو طبیعت اور فطرت سے بھی بے حد لگاؤ ہے اور وہ اس میدان میں بھی دوسرے شعرا سے پیچھے نہیں ہیں۔ جدید طرز میں انھوں نے اپنی ایک نظم "قو" میں ایک خوب صورت تالاب کی منظر کشی کی ہے جس میں دو قو ہیں۔ شاعر تالاب کے پُرسکوت پانی پر نظر ڈالتا ہے پھر سرخ شفق کا مطالعہ کرتا ہے وہاں کی آب و ہوا اور فضا سے لطف اندوز ہوتا ہے اور جس وقت سورج غروب ہو رہا ہے وہ اُن دو خوب صورت بطوں کو دیکھتا ہے جو اَب رات کی تاریکی میں گھر کر رہ گئے ہیں اور اُس منظر سے گھبرائے معلوم ہوتے ہیں:۔

قو

بگاہ غروب
ز تاب شفق
برنگ گل سرخ رنگین شدہ
ہوا خوشگوار و
زمین دلکشا

---

[1] عبدالقیوم قویم بحث ہائی در زمینہ ادبیات، موضوعات انوار کتب ہا و انتقاد ادبی کابل ۱۳۴۹ ش

کف بادصورت گرد موج آب
چو سرلوحهٔ سیم صورت پذیر
در آن گل زمین
بر آن تازگی
در آغوش تالاب خاموش و نرم
دو تا قوی زیبا شده جایگیر
من و آرزو
ببال خیال
پریدیم از آنسوی ابرها
فرا اوج آن برکهٔ بی نظیر
که افتاد مهر
بکام غروب
دو تای قوی زیباد آن آبگیر
بژرفای تاریک شب شد اسیر...... [1]

قو کے بارہ میں ایران کے معاصر شاعر مہدی حمیدی نے بھی ایک بڑی دل نشین غزل تصنیف کی ہے جو اس نظم کے مقابلہ میں اپنا ایک رنگ رکھتی ہے:

مرگ قو

شنیدم که چون قوی زیبا بمیرد | فریبنده زاد و فریبا بمیرد
شب مرگ تنها نشیند بموجی | رود گوشه دور و تنها بمیرد
در آن گوشه چندان غزل خواند آن شب | که خود در میان غزلها بمیرد
گروهی بر آنند کاین مرغ شیدا | کجا عاشقی کرد آنجا بمیرد
شب مرگ از بیم آنجا شتابد | که از مرگ غافل شود تا بمیرد

---

[1] عبدالحی آرین پور۔ نہال، کابل ۱۳۴۴ ش صـ ۱۶-۱۷

من این نکته گیرم که باور نکردم | ندیدم که قوی بصحرا بمیرد
چو روزی ز آغوش دریا برآمد | شبی هم در آغوش دریا بمیرد

تو دریائی من بودی آغوش واکن
کہ می خواهد این قوی زیبا بمیرد [1]

دونوں نظموں میں 'قو' کی تعریف کی گئی ہے اور دونوں شاعروں نے اُسے خوب صورت 'قو' کا نام دیا ہے اور دونوں نے انھیں پانی (تالاب و دریا) کا ایک خوب صورت جز تسلیم کیا ہے۔ جو فرق ان دونوں میں نظر آتا ہے وہ یہ ہے کہ ایک کا مضمون جدید طرز میں ہے اور دوسری کا قدیم انداز ہے۔ ایک تو کو تالاب کی حسین آغوش اور مناظر فطرت میں پیش کر رہا ہے اور دوسرا استعارے کے طور پر معشوق کی آغوش کو اپنے لیے "بجائے دریا" خواہش مند معلوم ہوتا ہے لیکن 'قو' کی خوب صورتی کا حق اور پانی سے اُس کے لگاؤ اور عشق کو دونوں شعرا نے انتہائی مہارت اور چابکدستی سے پیش کیا ہے:

توفیق

اُن کا نام عبدالحسین اور والد کا نام مرزا غلام حسین ہے۔ وہ ۱۲۹۷/۱۹۱۸ء میں قندھار شہر میں پیدا ہوئے اور چار سال بعد اپنے والد کے ساتھ شہر ہرات میں سکونت اختیار کی اور علمی اور ادبی تعلیم وہیں پائی۔

توفیق نثر و نظم میں ایک خاص انداز تحریر اور شیوہ کے مالک ہیں۔ اُن کا نثر و نظم دونوں ہی اُستادانہ فن کا مظہر اور قابل ستائش ہوتی ہے۔ نازک تخیلات اور انوکھے اور نادر سٹائل اُن کا اپنا منفرد انداز ہے۔ ان کی بعض تصنیفات درج ذیل ہیں:

الف۔ نظم:

۱۔ جوانی توفیق کہ دارای غزلیات و قطعات و مثنویات است۔

[1] دکتر منیب الرحمان۔ برگزیدہ شعر فارسی معاصر۔ ج۔ ۱، دانش گاہ اسلامی علی گڑھ ص ۲۷

۲۔ ادبیات توفیق، کہ دارای غزلیات و قطعات و مثنویات است۔

۳۔ سرود توفیق، کہ مشتمل بر تصانیف است

۴۔ مقصود توفیق، کہ مدایح و مناقب است

۵۔ فراغت ہا، کہ عبارت از قطعات جدیدہ است

۶۔ التوفیق، کہ منظوم سخناں حضرت محمد (ص) است

ب۔ نثر:

۱۔ عشق توفیق

۲۔ قطرات اشک۔۔۔۔[1]

۳۔ سایہ روشن (شعر) جام (نثر)، برقہ ہا (نظم ونثر) اور بوئیار (مجموعہ شعر) جیسی اور دیگر تصانیف بھی توفیق کے نام سے وابستہ ہیں جو مستقلاً شائع ہو چکی ہیں۔[2]

اُن کی شاعری کا ایک نمونہ ذیل میں پیش کیا جا رہا ہے۔ جو ترکیب بند سے مشابہ ہے۔ لیکن پہلے اور دوسرے مصرعوں اور ابیات بھی ہم قافیہ ہیں اور اسے توفیق کی جدّت کہا جا سکتا ہے۔ پہلے تو شاعر اپنے فرار اور آزردہ خاطری کا ذکر کرتا ہے اور کہتا ہے کہ جب کبھی تو نے مجھ سے دوری اختیار کی۔ لیکن اُسی طرح سے میری کہی ہوئی بات کو فراموش نہیں کر دینا چاہیئے اور جب کبھی میں نے اس دنیا سے رخت سفر باندھا اور تو میری مدد سے آزاد ہوا تو خود غرض اور ریاکار دوست میرے گرد و پیش جمع ہو جائیں گے، تیرے راستے میں بیٹھ جائیں گے اور ہر ایک تجھ سے اپنا مدعا بیان کرے گا۔ میری آرزو یہی ہے کہ اُس وقت بھی تو میرے طومار کو فراموش نہ کر اب ہم کو یہ دیکھنا ہے کہ "مرا فراموش مکن" میں شاعر کیا کہنا چاہتا ہے۔

مکن فراموش

ای از بر ما نمودہ آہنگ — وی گوش نکردہ عذر و زاری

---

[1] محمد علم غواص۔ شعرای معاصر ہرات، کلوپ ادبی، ۱۳۳۰۔ ش / ص ۱۳

[2] محمد سرور مولائی۔ شعر معاصر افغانستان، انتشارات رز، تہران، ۱۳۵۰۔ ش / ص ۸۵

ای مانده مرا غمین و دلتنگ — وی برده ز ملک دل قراری
آخر چو شد ؟ ز قهر ز جنگ — ای آهوی من شدی فراری
من از تو جدا هزار فرسنگ — سودای تو بوده یادگاری
باری چو بما پسندی این ننگ — پامال کنی حقوق یاری
بر ساغر عشرتم زنی سنگ — بر خاک مزلتم گذاری
اظهار مرا مکن فراموش

روزی که ترا خلاص بینند — ز اندیشه عاشق جگر سوز
بس گرگ که بینی که در کمینند — ظاهر به لباس بره و میش
در پای تو چون خط زمینند — از بهر دو روز مقصد خویش
بسیار که خدمتت گزینند — خوش بین و بمن بد اندیش
با آنکه نه آن نه این چنینند — یک قوم خوانند ترا یکی خویش
وانکه که براه تو نشینند — هر یک بتو نامهٔ کند پیش
طومار مرا مکن فراموش

شاعر اپنے ایک اور جدید اسلوب کے منظومہ میں ایک آدمی کے برخلاف چلنے والے نشانات کے منظر کو پیش کرتا ہے اگرچہ ہوا بھی چل رہی ہے اس نے کتنی خوب صورت قدرتی اور فطری منظر کشی کی ہے جس کے مطالعہ سے انسان سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے گویا کہ وہ منظر اُس کی آنکھوں کے سامنے آگیا ہے۔ شاعر ہوا سے سوال کرتا ہے کہ رہنورد منزل پر پہنچ گیا۔ ہے۔ لیکن ہوا کوئی جواب نہیں دیتی ہے اور خاموشی سے کہتی ہے "گیا" اور دیکھنے یا پڑھنے والا اُس کے منزل پر پہنچنے پر مشکوک ہے :۔

جای پای

به روی سنگ فرش آمد زد ها
به زیر شاخه های خشک امید

۱۔ محمد علم غواصی۔ شعرای معاصر هرات، کلوپ ادبی، ۱۳۳۰۔ ص ۱۵

فراز برف ہای کشتزاران
رد پای است نا ترتیب و پیداست
کہ عابر سخت ناد لخواہ رفتہ
بہ راہ کورہ و شوار مترد ک
شیار پا بہ روی چہرہ برف
گزار عابری پیداست مبہم
کہ گاہی ایستادہ ۔ گاہ رفتہ

صدای یاد نخواداشت از دور
کہ ای انسان رد پای شماہست
رہ دور حیات آدمی زاد
بہ ہر جا خواہ نشستہ خواہ رفتہ ۔۔۔۔[1]

بہ مابین گلو فریاد دارم
کہ ۔۔۔۔۔۔۔ نشنیدم
چہ می نابیدی ای باد؟
رسیدہ ۔۔۔۔۔۔۔۔
آخر این را ہر و بجای؟
خموش پاسخم گفت
آہ ۔۔۔۔۔ رفتہ ۔۔۔۔۔[2]

ایک اور دوسرا منظومہ بھی ہے جس میں توفیق نے اپنے سادہ طرز کلام اور شیریں بیانی

---

[1] محمد سرور مولائی ، برگزیدہ شعر معاصر افغانستان ، انتشارات رز ، تہران ۱۳۵۰ ش ص ۵۹، ۶۰

[2] " " " " "

کا اعجاز دکھایا ہے اور بے وفا محبوب کے کبوتر سے جو اُسے اُس کے محبوب نے بطور یادگار دیا تھا، اُس کے دعارہ شکن ہونے اور کبوتر کے اُڑ جانے کے بعد یادوں کا اظہار شعر میں یوں کرتا ہے:۔

یادگار او

از بہر یادگار
روزاں سوز وساز
داد آن پری مرا
زیبا کبوتری
چوں چہر خود قشنگ، چوں دست خود سپید
بگرفتمش بہ شوق
پروردمش بہ ناز
جا دادمش ز مہر
بر روی میز کار
او آرمیدہ بود
تا صبح می شگفت، تا شام می رسید۔
چوں عہد او شکست
چوں مہر او گسست
یک روز صبحگاہ
این نغز یادگار
چوں یار نیمہ راہ
ہم بی جہت پرید، ہم بی سبب رمید
از بعد ہفتہ ہا
در فرصت غروب
چوں ماہ نیمرنگ

از کوپہ می گذشت
پرسید شرمسار
کو یادگار من
گفتم زبام عشق ، بعد از تو او پرید

کتنی خوب صورت نظم ، کتنا عمدہ اور حسین خیال اور کس قدر سادہ رواں زبان اور شیریں کلمات۔ نظم کیا مرقع ہے ، ایک دلربا منظر ہے جو عشق ، بے وفائی اور حسرت ناک تو بصورت انجام پر ختم ہوتا ہے۔

توفیق کے کلام کی مختلف خوبیوں کے ذکر کے بعد اب اُن کی آخری اور خوب صورت غزل پر اُن کے ذکر کو ختم کیا جا رہا ہے۔ اس غزل میں شاعر اپنی محبوبہ کے ظلم و جور سے نالاں ہے اور اُس کے "سرمو" ہو کر "اور "کمری" سے خوب خوب استفادہ کیا ہے۔ جس میں پہلے تو جزئی معنی میں اور کم ہونے میں استعمال کیا ہے اور دوسری طرف معشوق کی کمر کی باریکی کے معنوں اور تیسرے کمری جو اصطلاحاً افغانستان میں کوئی بھاری بوجھ اٹھانے کے لیے استعمال ہوتی ہے اور انسان کی کمر کو توڑنے اور جھکا دینے کا باعث ہو جاتی ہے اور خصوصاً اگر کوئی شخص درد کمر میں مبتلا ہوتا ہے تو اُسے کمری کہتے ہیں اور اسی طرح "گزری" بھی استعمال ہوا ہے۔ جس کا مطلب عبوری کے ہے سرسری اور موجودہ کے ہے۔ اسی طرح آرام دنا آرام اور جگر گوشہ اور بے جگر جیسے کلمہ کو بھی خوب خوب برمحل استعمال کیا ہے:

مثل پری

عاشق روی تو ام ای بجمال ، بچو پری
کار من با تو پری ، گریہ و دیوانہ گری

لہ محمد سرور مولائی ، برگزیدہ شعر معاصر افغانستان۔ انتشارات رز تہران۔ سال ۱۳۵۰/ ص ۳۰ ۔ ۶۱

سر موی تری ای موکمر۔ لز ما واقفت
کہ چسانیم زسر بازی زلفت کمری
مگزراز عہد و چو سرواز سر ما ہم مگزر
قد و بالائی توبگزار کہ نیم گزری
سرپیوند توام بود گسستی تو بہ جور
ای خدا شاخۂ امید بہ ایں بی ثمری!
بہ قیامت چہ بسا وعدۂ دیدار کہ ماند
از سر کوئی تو پسند کہ گردم سفری
تو دل آرام دریں شہر و دل من نارام
تو جگر گوشہ و توفیق بہ ایں بی جگری۔۔۔[1]

اکھر

میر عبدالقادر اکھر، پسر میر نجم الدین ۱۲۹۵/ ۱۹۱۶ء کابل کے شمال میں جبل السراج پروان میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی مروجہ تعلیم مکتب منوچہری میں حاصل کی پھر حبیبیہ کا اعلا کورس پڑھنے کے بعد پروان کے روزنامہ میں ادارہ کے رکن بنے پھر پشتون ژغ نامی رسالہ میں مدیروں کی فہرست میں شامل ہوگئے۔ ۱۳۲۸/ ۱۹۴۹ء میں ان کے اشعار کا کچھ حصہ ترانہ ہائی دل کے نام سے شائع ہوا۔۔۔۔[2]

لیکن کتاب در کوچہ ہائی سرخ شفق میں ان کا سال پیدائش ۱۳۱۸ ہجری/ ۱۹۳۹ء درج ہوگیا ہے اور جس کی بنا پر اصل عمر میں ۲۳ سال کا فرق ہو جاتا ہے۔ اسی طرح اس کتاب میں اُن کی اعلا تعلیم کے بارے میں انھیں یعنی گراڈ یونیورسٹی کا ڈاکٹر لکھا گیا ہے اور اُن کی مشغولیت کو کابل یونیورسٹی کے زبان و ادبیات کے کالج میں روسی زبان و ادب کے ڈائریکٹر کی حیثیت سے ظاہر کیا گیا ہے۔

---

[1] محمد سرور مولائی۔ برگزیدہ شعر معاصر افغانستان۔ انتشارات رز، تہران ۱۳۵۰ھ، ص ۲۰۔۲۱

[2] خستہ، معاصرین سخنور۔ کابل ۱۳۳۹/ ۱۹۶۰ء، ص ۳

پھر اُن کو افغانستان کے جمہوری شعرا اور مصنفین کی انجمن (ج ۔ د ۔ ا) کا ممبر بنایا گیا ہے۔

ابہر کے کلام کے بارے میں ابتدا ، اُن کی ایک غزل سے ہوتی ہے جس میں اُنھوں نے خوب صورت تشبیہات اور دوسری صنائع استعمال کی ہیں۔ وہ عشاق کے آہ وفریاد کرنے کا سبب یہ بتاتے ہیں کہ گریہ سے اُن کے گلے رندھے ہوئے ہیں اور گلستان میں اس وجہ سے نہیں جاتے ہیں کیونکہ "باد نسیم پیرہن یار بوی ناز بودارد"۔[1]

فغاں کند آنکس کہ عشق او دارد — ازان کہ ہر نفس گریہ در گلو دارد
قفس بسوی چمن کن لطف ای صیاد — کہ صید دام تو امروز ہای وھو دارد
زخاک سر نزند ہیچگہ بگلشن دہر — گلی کہ چون گل رو یتو رنگ و بو دارد
بیا نہ سینہ من رشک گلستان گشتہ — زبس کہ داغ توای شوخ لالہ رو دارد
نمیروم بہ تماشای گلستاں ہرگز — نسیم پیرہنت بوی ناز بود ارد
زخواب ناز بخیز و ببین کہ عاشق تو — بہ آب دیدہ دو پای تو شستشو دارد
بیا کہ پیش تو ایں ابہر ستم زدہ است
زدست ہجر یکی عرض رو برد دارد[2]

ابہر نے خود کو دوست کے بالیں پر تصور کیا ہے اور اپنا حق جتایا ہے کہ اُسے خواب ناز سے بیدار کرے تاکہ دوست یہ دیکھے کہ عاشق اپنے آنسوؤں سے اُس کے پیروں کو دھو رہا ہے۔

اس عاشقانہ غزل کے بعد ابہر کی ایک نظم ملاحظہ ہو جس میں انداز تو غزل کا رکھتا ہے لیکن یہ منظومہ روسی خلاباز گاگارین سے متعلق ہے جو بعد میں ایک ہوائی حادثہ میں ہلاک ہوگیا تھا۔ شاعر نے اسی سانحہ سے متاثر ہو کر نظم میں یہ بتایا ہے کہ یہ جری اور عظیم انسان ، زمین کی بھلائی کے لیے فضا کو قہرمانہ تسخیر کرتا ہے اور انسان اُس کے نام کو زندگی کی کتاب میں سنہرے حروف

---

[1] اسم گل

[2] خستہ معاصرین سخنور ، کابل ۱۳۳۹/۱۹۶۰ ۔ م ص ۱۲ ۔ ۱۳

یں لکھتا رہا ہے۔

تسخیر فضا

آں روز جہاں بشادمانی — برداشت شراب ارغوانی
آں روز تمام مردم دہر — بودند بہ عیش وشادمانی
آں روز رسیدہ مژدہ نو — انسان بہ فضائی آسمانی
آں مرد بزرگ گاگارین — گیہاں نورد و گیہانی
فرزند بشر در آسمانہا — جویندہ سر کہکشانی
بنمود برای صلح گیتی — تسخیر فضا بہ قہرمانی
بنوشت بشر بخط زرین — نامش بہ کتاب زندگانی
آں روز بنام نامی او — صد کوچہ و جادہ شد نشانی
روزی بہ ہزار عزت و شان — آمد بہ دیار باستانی
بگذاشت قدم بہ کشور دوست — بر رسم و رواج میہمانی
یکبارہ سپہر نیلگوں گشت — یکبارہ برنگ ارغوانی
یکبارہ قبای سرخ پوشید — یکبارہ چہ ماتم جہانی
گفتم چہ الم سپہر سر کرد — از بہر کسی است نوحہ خوانی
گفتند کہ بسوخت گاگارین — در حادثہ طیارہ رانی
پروانہ صفت بسوخت "گیری" — بر شمع وطن بہ نوجوانی
بر کند نہال آرزو ہا — گردوں بہ یکاں ناگہانی بلہ

شاعر نے اس فضائی سفر میں اپنے ملک افغانستان کو شامل کر لیا ہے۔ اور گاگارین کی المناک موت پر اپنے رنج و غم کا اظہار کرتے ہوئے یہ بتایا ہے کہ کس طرح وہ شمع وطن پر پروانہ صفت نثار ہو گیا ہے۔

روس کی ایک اور ریاست تاجیکستان بھی افغانستان کے عوام جیسا تمدن اور کلچر رکھتی ہے بشاعر ابھر نے اپنی ایک نظم "پیام دوستی" میں اپنی اس ہم مسلک ریاست کے بارہ میں جن خیالات کا اظہار کیا ہے وہ ملاحظہ ہو : ے

درود خلق دور انساز افغان — بہ خلق تاجکستان می فرستم
بہ خلق قہرمان تاجکستان — درود از کابلستان می فرستم
بسلک رود کی این گوہر دل — کہ افروز دچراغان می فرستم
فروزان گوہر رخشندۂ دل — بہ شہر شعر و عرفان می فرستم
سخن چون لعل زیبا و دل انگیز — بہ عنوان بدخشان می فرستم
حدیث نغز دسبک خراسان — بیاران سخندان می فرستم
بسوی لالہ رویان دوشنبہ — گلاب سرخ لغمان می فرستم
سرود رود کابل تا دل سند — کہ گشتہ مست وغلتان می فرستم
غرور موج ہای رود پنج شیر — بور زاب خروشان می فرستم[1]
بہ خوارزم و سمرقند و بخارا — سلام بلخ و پروان می فرستم
بہ ترسون زادہ آن مرد سخنور[2] — شقایق از بدخشان می فرستم
بہ مرزا میر شکر اشعار خلقی[3] — بود شایستۂ آن می فرستم
گذشت ایام دوری و جدائی — پیام وصل جانان می فرستم
بہ خلق شوروی از خلق افغان — درود گرم و سوزان می فرستم[4]

مذکورہ بالا منظومہ میں شاعر خلق افغان کے درود و سلام کو تاجیکستانی عوام

---

[1] تاجکستان کے ایک دریا کا نام [2] تاجیکی زبان کا مشہور شاعر [3] تاجیکی شاعر کا نام روسی تاجیکستان کا پایہ تخت دوشنبہ ہے اور لغمان ایک افغانی شہر کا نام ہے جو کابل کے مغرب میں وہاں سے ۱۷ کیلو میٹر کے فاصلہ پر ہے۔ سمرقند اور بخارا وسط ایشیا کے دو مشہور شہر ہیں اور بلخ اور پروان شمالی افغانستان کے علاقے ہیں۔

[4] در کوچہ ہای سرخ شفق ص ۵۶-۱۵۴

کے نام بھیجتا ہے اور وہاں کے لوگوں، شخصیتوں اور ادبی اور تاریخی مشاہیر کو اور پھر اسی طرح افغانستان کی تاریخی سرزمینوں کا بلستان بدخشاں، خراساں، بلخ اور پروان کو ایک دوسرے کے مساوی یاد کیا ہے اور سب سے آخیر میں تاجیکستانی ادبی شخصیات ترسوں زادہ میر و امیر شکر کو شقایق کے پھول اور خلق افغان کے اشعار ہدیتہً بھیجتا ہے اور اگر شاعر کی کہی ہوئی باتوں کو ہم تعلقات اور عدل کا میار قرار دیں تو اس لحاظ سے ترسوں زادہ عشق کا شاعر معلوم ہوتا ہے جسے ابہر شقایق کے پھول بھیجتا ہے اور مرزا امیر شکرا نقلاب اور بہادری کا شاعر ہے کیونکہ جو تحفہ اُسے نذر کیا گیا ہے وہ خلق افغان کے اشعار ہیں۔

گذشتہ صفحات میں بارق شفیعی نام کے شاعر نے بھی تقریباً اسی عنوان اور مضمون کے مانند ایک نظم لکھی ہے جس کے چند اشعار دوبارہ نقل ہیں:

من پیام دوستی ز افغاند یار آوردہ ام	زی شما با خود درود بی شمار آوردہ ام
چوں نسیم نوبہاران در گلستان ہنر	از دیار آشنا پیغام یار آوردہ ام
من سلام گرم پیشاہنگ خلق خویش را	بر رفیقان عزیز ہم جوار آوردہ ام
من ز باغ عنصری گلہائی سرخ شعر را	بر مزار رودکی بہر نثار آوردہ ام[1]

[1] بارق شفیعی۔ شہر حماسہ۔ کابل، ۱۳۵۸ھ / ۱۹۷۹ء، ص ۲۴۲ — ۲۴۱

پانچواں باب

وہ شعرا جو جدید اسالیب میں طبع آزمائی کر رہے ہیں

اس باب میں اُن شعراء کے حالات اور کلام کا ذکر ہے جو جدید طرز میں شعر کہتے ہیں۔ عموماً ایسے شعرا کو جدید اور اُن کی شاعری کو نئی شاعری کا نام دیا جاتا ہے کیونکہ یہ شاعری نہ صرف اپنے زمانہ کے تقاضوں کے مطابق ہوتی ہے۔ بلکہ موضوع، مواد، متن، زبان اور بیان کے حساب سے ایک جداگانہ حیثیت رکھتی ہے اور اُن میں بیشتر شعرا وہ ہوتے ہیں جو جوان ہیں اور اُن کے کلام میں عصر حاضر کے مسائل کو پیش کرنے اُن سے نبرد آزما ہونے اور اُنھیں عوامی زبان میں بیان کرنے کا طریقہ بھی آتا ہے۔ وہ اجتماعی، سیاسی اور اقتصادی مشکلات سے باخبر رہتے ہوئے معاشرہ کے دُکھ سُکھ کا بہ خوبی اندازہ رکھتے ہیں۔ چنانچہ قدرتی طور پر اُسے چشم دید بیان کرتے ہیں اور سننے اور پڑھنے والے بھی اُسی قدر اُن کے کلام سے متاثر ہوتے ہیں۔

چنانچہ ہم محمد ظاہر شاہ کے دوران حکومت کے آخری برسوں میں شائع ہونے والے تمام رسالوں، روزناموں اور دیگر مطبوعات میں ان اثرات کو بہت واضح طور سے اُبھرتا ہوا دیکھتے ہیں کہ کس طرح شعرا نے ان مصائب کو، نابرابری کو اور استحصال کو امکانی حد تک محسوس کیا ہے اور اپنی تخلیقات کا بڑا حصہ اس کی نذر کر دیا ہے۔

جو کارنامے چوتھے باب کے شعرا نے فارسی دری کی شاعری کو جدید تر بنانے میں پُرانے سانچے بدل کر قافیوں اور بحروں کو توڑ کر انجام دیے تھے، اُنھیں اس دور کے شعرا نے بہت آسان بنانے کی کوشش کی اور اس مہم میں اُنھوں نے ایران کے نئے شعرا اور مغرب کی ترقی یافتہ سوسائٹی کے مطالعہ سے مدد لی اور اس جدیدیت

کو استحکام بخشا اور نئی شاعری کو روز بروز کمال و تمام تک پہنچانے
میں رہنمائی کر رہے ہیں۔

اس گروہ کے نمائندہ شعرا میں جن لوگوں کا کلام اس وقت تک میسر ہے
اور جن کے نمونۂ کلام پیش ہوں گے اُن میں واصف باختری، رؤیں، اسداللہ
حبیب، آئینہ، ازہر، فکرت اور لیلا کاویان کے نام قابل ذکر ہیں۔

واصف باختری

واصف باختری ۱۳۲۱/۱۹۴۲ء بلخ شہر میں مزار شریف نامی مقام میں پیدا
ہوئے۔ ابتدائی اور ثانوی تعلیم دبیرستان باختر میں حاصل کی پھر حبیبیۂ کابل میں
اس کی تکمیل کرنے کے بعد کابل یونیورسٹی کے دانش کدہ ادبیات و زبان سے بی۔ اے
کی سند حاصل کی اور پھر باہر جا کر کولمبیا یونیورسٹی متحدہ امریکہ سے ماسٹر ڈگری حاصل کی۔
فی الحال آجکل وہ وزارت تعلیم و تربیت کے شعبہ ترجمہ و تالیف کے صدر اور
افغانی جمہوریہ کے شعرا اور مصنفین کی انجمن کے رُکن ہیں [1]

واصف باختری کی زندگی اور مشاغل کے مذکورہ بالا واقعات کے علاوہ
میرے ایک دوست نے اُن کے بارے میں مزید جدید اطلاعات فراہم کی ہیں [2]
"از بیست سال بہ این سو شعر و مقالہ می نویسد ولی تاکنوں دفتر شعری از و
بچاپ نرسیدہ است۔ و در زمینۂ فلسفہ و جامعہ شناسی نیز آثاری

---

[1] در کوچہ ہای سرخ شفق۔ گزینۂ شعر امروز، شعرای فرہنگی پوہنتون کابل، ۱۳۶۰ھ ص ۱۶

[2] برتولت برشت ۱۸۹۸ء میں جنوبی جرمنی کے اکسبرگ شہر میں پیدا ہوا۔ بیس سال کی عمر میں
اپنا پہلا ڈرامہ لکھا پھر برلن گیا اور ۱۹۲۸ء میں "اپرای سہ پولی" ڈرامہ اسٹیج کیا جو ساری
دنیا میں اس کی شہرت کا باعث ہوا۔ وہ ۱۴ اگست ۱۹۵۶ء میں مشرقی برلن میں فوت
ہو گیا۔ اس شاعر کو اور اُس کے ڈرامہ کو بیسویں صدی کے ادبیات کی تاریخ
کا ایک ہنرور اور عظیم فن کار سمجھا جاتا ہے۔ مجلہ سخن تہران، شمارہ ۷، ۱۰
ص ۱۷۱-۱۷۲

نگاشتہ است اگر عمری و مجالی بود این نوشتہ ہای پراگندہ گرد خواہد
آمد و در غیر آن ۔ ای بسا آرزو کہ خاک شدہ ''

واصف کی شاعری پر تبصرہ کی ابتدا اُن کی ایک طویل نظم "پرسش' سے
کی جارہی ہے جو اس نے برتولت برشت کی شخصیت اور فکر سے الہامی طور پر
متاثر ہوکر انتہائی خوبی کے ساتھ منظوم کی ہے اور جس میں " بدگہر تاریخ
پردازان افسوں ساز '' اور سوسائٹی کی اصل زندگی کا ذکر ہے جو اس طویل
تاریخ میں انجانے طور پر ناجائز قرار پاگئی ہے اور بار بار ارباب اقتدار کے
اور حکمرانوں کے فائدہ کے لیے لکھی گئی ہے مثال کے طور پر " اہرام مصر "
کو " فرمصر " نے " دیوار چین " کو قیصر چین " نے '' تاج محل " کو شاہ جہاں
نے، قطب مینار کو قطب الدین ایبک' نے تعمیر کیا ہے، لیکن کسی شخص نے
مزدوروں اور صناعوں کے قلم، آلوں اور فن معماری کی عرق ریزی اور مزدوروں
کی جانفشانی کا ذکر نہیں کیا ہے۔ جنھوں نے نگرانوں کے کوڑے کی مار کھا کر
اور صرف بھاپ کی اُجرت پاکر ان یادگار عمارتوں کو لاثانی بنا دیا ہے۔ ان کے
بار۔۔یں کچھ نہیں لکھا گیا ہے جب کہ ان یادگاروں کے خالق کو وقت کے
حکمرانوں کے حکم پر دنیا کی نظروں سے پوشیدہ رکھا اور گمنامی کی تاریخ کے
قبرستانوں میں دفن کر دیا ہے اور واقعتاً یہاں نظم کے شاعر کو حق دینا چاہیئے
کہ وہ اپنے انتقامانہ احساسات اور جذبات کو " نفرین باد بر آئین تان " جیسے
کلمات پر ختم کر لے :

پرسش

شعر از برتولت برشت

شما ای بردگان آز !
شما ای بدگہر تاریخ پردازان افسونساز !
کہ بی آزرم
ز جادویان دنیای کہن افسانہ بنوشتید و از کشورکشایان ستمگر داستان گفتید

وز آن خود کامگان اہرمن کردار
خدایان ساختید اندر پرستشگاہ پندار سیاہ خویش
و دامان پلید آن ستم کیشان خود بین را
ز دیبای سپید ابرہا پاکیزہ تر خواندید من اینک پرستشی دارم
کی اندر سنگر بیکار جان بسپرد ؟
کی اندر کارزار مرگ پای افشرد ؟
تز دد رراہ ننگ آگیں دشمن گام
بخودش آرزد تا ہم نبرد انش زبوں باشند و دشمن کام
کرا شد دودماں برباد ؟
کرا شد زندگی تاراج ؟
کی بر پیکان زہر آگیں دشمن سینہ کرد آماج
کی تا پیرایہ زرین پیروزی
بروی سینہ فرماندھان تابید
نگارین کاخہای شہریاران را کی آذین بست ؟
و اندر سدہ ہای تیرہ پیشین
کہ برپا داشت شہرستان بابل را ؟
برای پیکر فرمان روایان در کران نیل
ہر جہار اکی پی بنہاد ؟
دد یوار ستر گ چیں بادست کی بارنج کی شد آباد ؟
شما ای بد گہر تاریخ پردازان افسوں ساز
کہ نفرین باد بر آئین تان آیا نمیدانید ؟
کہ ما ہستیم ۔ ما آن راستیں سازندگان تاریخ راکز خون ھا
وز اشک گرم کودک بیمار ما
ہر برگ ایں دیرینہ دفتر را نشان باشد
شما ای بد گہر تاریخ پردازان افسونساز

کہ نفرین باد بر آئین تان آیا نمیداینید ؛
کہ ما ہستیم ما آن راستین سازندگان تاریخ را کہ
ز ژرفنای تیرہ و خاموش دنیائی کہن راہی بسوی
مرزہای - مرزہای روشن امروز بکشادیم ......

واصف ایسا شاعر ہے جو طویل نظمیں لکھتا ہے اور معاشرہ کے مسائل اور تاریخی واقعات کو موضوع بناتا ہے اور اُس گفتگو اور مسئلہ کے ہر پہلو کو بڑی تفصیل کے ساتھ قاری کو متعارف کراتا ہے جو خود اپنی جگہ شاعر کے مطالعہ، معلومات اور سخن پردازی پر دال ہے۔

اپنی ایک اور دوسری نظم "عقاب ازاوجہا فریاد میدارد" میں واصف باختری شہر بابل کے مغرور اور متکبر فرماں روا کے قدیم افسانہ کو دہراتا ہے کہ کس طرح وہ لوگ اپنی تباہی کا سبب خود بنے، ساتھ ہی وہ لوگوں کو ہوشیار کرنا چاہتا ہے کہ جب تک موقع ہے اُسے غنیمت سمجھیں اور قبل اُس کے کہ اس چار پانچ زندگی کی لرزتی ہوئی شاخ کے لمحات ہم سے چھین لیے جائیں، ہم زندگی کے پھول کی اس پتی کی شبنم کو اپنے خون سے سرخ نگینہ بنائیں اور تاریخ کی انگشتری میں اُسے لگا دیں۔ یعنی اس سے قبل کہ ہم اس دنیا سے رخت سفر باندھیں، ہم کو چاہیئے کہ اپنا کوئی کارنامہ تاریخ کے اوراق پر ثبت کر جائیں : ملاحظہ ہو :-

عقاب ازاوجہا فریاد می دارد

چنین گفتند در افسانہ ہای باستان افسانہ آرایان
کہ بابل این ابر شہر، این سپیدار کہن در جنگل تاریخ
چو شد بر سرزمین ہای دگر (چیرہ)

---

[1] در کوچہ ہای سرخ شفق، گزینہ شعر امروز، کابل، ۱۳۶۰ ش / ۱۹۸۱ء صفحہ ۱۷ - ۱۹

گل آزرم بر شاخ رواں پژمرد سالاران بابل را
و هر یک خویشتن را ایزدی پنداشت
غرور شهروندان نیز از آئین سالاران فزونی یافت
خدا شد خشمگیں زین ناپکاری ها
سزای داد ایشان را شگفتی زا
که از آن پس ندانستند
زبان یک دگر آنان
یکی را گر درودی گرم بر لب بود
بگوش دیگرای دشنام می آمد
به بابل شهر زآن پس ابرکیں گسترده دامان بود
زبانها دردها چون زبان گرزه ماران بود
روانها زهر خشم و کینه را آگنده انبان بود
جبیں ها سوی هم از کینه آژنگین
سرود مهر خاموش و خروش خشم آهنگیں
دگر در باغ دلها جز گیاه هرزه نفرین نمی روئید
سخن از چنگ و دندان بود و هر واژه بزهر آلود پیکان بود
کنون ای همنورداں بشاخ کینه ها پیچیده پیچک وار
مگر ما نیستیم آن بابل سرگشتگان کز خشم و کیں ناروا ین میوه های تلخ نخل
خامی پندار

ستیزانیم باهم چون زبان هم نمیدانیم
چه نادان هم سراپائیم
روانها شیشه های از شرنگ رنج آگنده
سخن ها سبزه های خاکسود از سردی پائیز
و دلها چون تهی گهواره های کودک امید .....
نپنداریدایں فرجام رویش هاست

که هر فرجام آغاز ست دره تا بیکران باز است
اگر رهوار راز ره خسته پندار جز بیراه جز تکرار راهی را نمی پوید
چرا آئینه اندوه باید بود
غریو اَرود باید شد
شکیبا کوه باید بود
زبونی تکمد رخت ناتوان را باد
غرور بارور را جنگل انبوه باید بود
عقاب ازاد جها فریاد میدارد ....
افقها ناکرانمند است
زبازوی سیاه شهر شب پرواز باید کرد
مبادا اهریمن شب های سنگیں پا
درفش خویش را بر دامن سنگر برافرازد
مبادا این مرغ آتشبال زریں گام
که دارد لحظه های زندگانی نام
زلرزاں شاخه عمر پسنج ماکند پرواز
مبادا چوں گل خشکیده بگذارند مارا درمیاں برگهائی دفتر تاریخ
مبادا بر فروزان آتشی کز هیمه پاک روان ما بود روشن
فتد خاکستر تاریخ
کہ گر خاموش شد ایں تابناک آتش
نباشد واژه امید را آرش
شبستان گسستن را اگر از چل چراغ باز پیوستن فروغی بود
زخون خویشتن ایں شبنم برگ گل هستی
نگین سرخ بنشانیم بر انگشتر تاریخ ....[2]

---

[1] مجلہ 'عرفان'، شمارہ ۵، ۶، ۱۳۵۳ھ، ش/۱۹۷۴ء ص ۸۷-۸۹

[2] انگریز شاعر بائرن (۱۷۸۸-۱۸۲۴) نے عثمانیوں کے خلاف یوروپ کو بھی اس قسم کی نظمیں سنا کر بیدار کیا۔

واصف باختری کی ایک اور طویل ترین نظم جس کو متعارف کرانے اور پیش کرنے کے بعد اُن کے کلام کا ذکر ختم کیا جائے گا، انگریزی زبان کے مشہور رومانی شاعر بائرن کی اُس نظم کی یاد دلاتی ہے جو اُس نے یوروپ کے لوگوں کو عثمانی ترکوں کے خلاف اکسانے اور جنگ کرنے کے لیے لکھی تھی۔ واصف باختری کی نظم جنگجویانہ احساسات سے پُر اور ظالم فرماں رواؤں سے ٹکر لینے کے جذبات سے بھرپور ہے اور ساتھ ہی شاعر اپنی قوت تخیل، موضوع، کلمات اور دلچسپ اصطلاحات کا مظاہرہ بہ خوبی کرتا ہے۔ وہ اپنی قوت ارادی اور صمیمیت کے ساتھ وطن کے سچے دفاع کرنے والے جاں بازوں کا ذکر کرتا ہے اور (ناخدائی پیر) کی صدا سے اپنے ہمرزموں کو یاد دلاتا ہے کہ کس طرح اس نے اس سب کو جنگ کرنے کی حوصلہ افزائی کی ہے اور آخر کار دشمن کی فوجوں کو شکست دینے بادشاہ کے بیٹے کی موت اور راہ آزادی کے جانبازوں کی کامیابی کی حکایت بیان کی ہے :-

خشم دریا دریای از خشم

شبانگاہان
کہ توفاں چون پلنگی درمیان بیشہ ہای آب می غرید
زبام قیرگون موجہا فریاد برمی خواست
چہ فریادی کہ پژواکش ز آنسوی افقہا بال دربال غریو باد برمی خاست
صدای ناخدای پیر
ہماں سالار دریا چشم، دریا خشم، دریا گیر
الایا ہمگنان من
ایا زنجیریاں بے گناہ پادشاہ ترک
الا ای خشمتان چونان حریق جنگل زنہارخواہاں سپاہ ترک
"گریبان شکیبائی دریدن" ننگ و رسوائیست .....
بسوی ساحل زریں میہن باد بانہا را برافرازید

خدای با دلپشتیبان پارو های تون آگین تان یار

شتاب آذرخش ارزانی نیروی بازو های پولادین تان یار !

مبادا رهزن اندیشه های پاکتان ۔ ای دستان ای روحتان روئین

شبستانها و ایوانهای مرمرپوش

حریر سبز خواب و گرمی آغوش

حریم شادخواران بلند آبشخور و غوغای نوشانوش

اگر امشب روان سست پیمانان و نامردان

پریشان تر ز خواب جنگل انبوه در باد است

ولی در این شب غمناک و بی زنهار

روان ما بود از آتشین سیالهٔ امید ها سرشار

. . . .

شبانگاه بود و توفان چون پلنگی در میان بیشه های آب می غرید

فرا سو تر ز توفان تا و تندرها

زبام تیرگون موجها فریاد برمی خاست

سلام ای میهن من ای برافرازنده قامت ای شکوه پاک

سلام ای آسمان ای خاک

سلام ای مادر گیسو سپید ای کوه

سلام ای روشنان آسمان ای روزنان نور

سلام ای جنگل خورشید

سلام ای روشنای سرخ

سلام ای نخلهای بیشه پائیز

سلام ای پرچم های سرخ

. . . .

شبانگاه دگر دریا نور زدان سیاه ترک

سراپا سوگوار از مرگ سه صد ترک جنگاور

یکی ہم زآں میاں فرزند شاہ ترک
چہل نعش بہ خوں آغشتہ را در ساحل یونان
بہ گور نیلگوں آبہای سرد افگندند
د باراں خشمگیں از آسمان تیرہ پاییزی می بارید
صدای ناخدای پیر گوئی باز لال لحظہ ہای پاک جاری بود
واز ژرفای دریا گوییا فریاد برمی خاست
چہ فریادی کہ پژواکش زآنسوی افقہا بال در بال غریو باد برمی خاست
سلام ای میہن من ای برافرازندہ تامت ای شکوہ پاک ،
سلام ای شاخہ بار آور پیوند ہای دور ،
سلام ای خوب ای خوبی سلام ای زادگاہ نور ،
سلام ای آسماں ای خاک ، .... [1]

رازق رویین

رویئین ۱۳۲۹ھ۔ش/۱۹۵۰ء میں بلخ کے علاقہ کے مشہور شہر مزار شریف میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تحصیلات مزار شریف کے مدرسہ سلطان غیاث الدین میں کیں اور ثانوی تعلیم باختر مزار اور شیرشاہ سوری کابل میں حاصل کی اور اعلا تعلیم کابل یونیورسٹی کے زبان وادبیات کے کالج میں پائی فی الحال وزارت تعلیم و تربیت کے شعبہ تالیف و ترجمہ کے رکن ہیں اور جمہوریہ افغانستان کے ادیبوں اور مصنفین کی انجمن کے بھی ممبر ہیں۔.. [2]
کابل سے آئی ہوئی ایک ٹائپ شدہ تازہ ترین تحریر کے مطابق ان کی شاعری کے کچھ نمونے ایران اور تاجیکستان کے ادبی مجلوں میں بھی شائع ہو چکے ہیں اور وہاں کے نقادوں نے ان کے کلام کی مقبولیت کے بارے میں ناقدانہ اور اچھی رائے

---

[1] در کوچہ ہای سرخ شفق، گزینہ شعر امروز، کابل۔ ۱۳۶۰/۱۹۸۱ صفحہ ۷۶ ـــ ۷۷
[2] ؍؍ ؍؍ ؍؍ ؍؍ صفحہ ۱۱۳

دی ہے۔

(نمونہ ہای از شعر نو افغانستان) چاپ بنیاد فرہنگ ایران میں اُن کی شاعری کے نمونے شائع ہوئے ہیں اور تاجیکی استاد جناب علی یغاز کی جانب سے "اشعار شاعران افغانستان" کے مجموعہ میں بھی اُن کے منتخب اشعار چھپے ہیں۔

روہیں افغانستان اور ایران میں شاعر جدید کے نام سے جانے جاتے ہیں۔ وہ اپنے کلام میں مواد و موضوع کے لحاظ سے بھی اور شاعری میں فارم اور ہئیت کے لحاظ سے بھی جدید ہیں۔

اُن کے اشعار کو پڑھ کر بہت واضح اندازہ ہوتا ہے کہ وہ کلمات کے انتخاب میں کس قدر خوش سلیقہ ہیں اور کس عمدگی کے ساتھ افغانستان کی جدید شاعری کے کارواں کے ساتھ صف اول میں شانہ بشانہ گامزن ہیں۔ اُن کے اشعار کے کچھ منتشر نمونے جو آئندہ نقل ہوں گے اس قول کی کاملاً تائید کریں گے۔ اس کے کلام کا آغاز اُن کے دل کے غبار بعنوان" ملال" سے ہوتا ہے:۔

ملال

چرا امشب دلم تنگ ست
چرا لبهایم از جام شراب خنده بیرنگ است
چرا امشب جهان در چشم من زشت است
زیبا نیست
دلم را شور فردا نیست
دلم خواهد سراپا از سرشک گرم و آتش زا
چو شمعی تا سحر سوزم
وزین تلخی جان فرسا
چراغ دیده را در تیرگیهای خیال خود برافروزم
درینجا در میان کلبه ای نیست غیر از سایه من نقش لرزانی

دمی آویزم به زلف شب سنگینی پندار
سرودی تلخ اندوهی مرا آویزه گوشست
سرود تلخ اندوهیکه خاموشست

. . . .

درین تاریکی وحشت نواز شب
صدای نیست
صدای پر پر مرغ میان شاخساری نیست
گهی کانگشت باد شوخ شب آهسته می بنارد
برویم پله های کهنه دررا
من از بار گران وحشت و تنهائی و اندوه بی پایان
بسوی سایه خود خیره می مانم
چه می بینم
هزاران نقش ترس انگیز
هزاران یاد درد آمیز
بدوش خویش می گیرم نواز شهای دست یاد مادر را
کسی کو بود برشاخ بلند آستیم تنها
نشیمن گاه امیدی
کسی کو بود در حسرت سرای بی نشانیها
جهانی، پرتوی، دیدی

. .   . . .   .

ملال خاطرم دیگر بس افزونست
مگوئیدم شراب ساغر چشمان من چون است
کامشب بس دلم تنگ است
کامشب بس دلم خون است . . . . [1]

---

[1] مجلهٔ ژوندون، شماره، ۱۱ (۲۰ جون ۱۹۷۰ع) کابل صفحه ۴

اس شعری قطعہ میں شاعر اپنے رنج و غم، تنہائی اور زندگی کی ذاتی محرومیوں کو ایک تاریک و تنہا رات سے متعلق کر کے بطور حکایت بیان کرتا ہے۔ اپنے آپ کو ایک اکیلی کال کوٹھری میں محسوس کرتا ہے۔ اس کا دل چاہتا ہے کہ وہ ایک شمع کی مانند صبح تک جلتا رہے اور اپنے خیالوں کی تاریکی میں اپنے دیدہ کا چراغ روشن کرتا رہے۔

جس تاریکی میں "انگشت باد" "پلہ ہای کہنہ در را" اُس کے لیے بند کر دیتی ہے اور جس میں وہ ہزاروں "درد آمیز" نقوش کے علاوہ کوئی دوسری چیز نہیں دیکھتا ہے اور تاریکی کے اس ہجوم میں سوائے ماں کے شفقت آمیز ہاتھ کے اور کوئی دوسرا سہارا اُسے نظر نہیں آتا ہے۔ وہ ایسی رنج و غم سے بھری ہوئی رات میں اپنا درد بڑھتا ہی محسوس کرتا ہے اور اپنے آپ کو دلتنگ اور خون میں نہایا ہوا پاتا ہے۔

ملال کی مانند رہیں کی دوسری نظم "پرندہ" میں بھی اُس کا غم اور دل گرفتگی نمایاں ہے۔ کبھی تو وہ اپنے اس اندوہ اور کدورت خاطر کو اندیشہ و خیال کے روپ میں ظاہر کرتا ہے اور کبھی پرندہ کی زبان سے بیان کرتا ہے۔ بسا اوقات وہ اپنے اس درد کو رمز آمیز طریقہ پر مہمان خانہ دل میں اُسے دعوت دیتے ہیں، بلاتے ہیں اور دل کے غمزدہ تاروں کا تماشا دکھاتے ہیں۔ اگر پرندہ کا غم گذشتہ سال کی بہار کی فرقت میں ہے تو پھر شاعر کا یہ دکھ اور الم کس بے پایاں اور لامتناہی اندرونی غم کا مظہر ہے، ملاحظہ ہو "پرندہ":-

پرندہ

بھار آمدہ بود
چکاوک از سر پلوان سبزہ پرید
و دید،
زمانہ شادترین ہدیہ ہای رنگیں را

کبود و سرخ و سپید
به ره گذار جلیل بهار گسترده
و چشم سبز بهار
تلاش رویش گلناک خاک را میدید
که از سلالهٔ گلزارهای تازه نمود
هزار هودج پُر بار
هزار لالهٔ سرخ
به گل فشانی دامان دشتهار فتند
شکسته بال ترین مُرغ
غمین شد و خواند :
چو آمدی زرهٔ دورای تمامت سبز
نمی تواں به رهت گل هزار گونه بچید
ولی افسوس
درون خانهٔ من شاخه هاز گل خالیست
درون خانهٔ من ماتم جدایها ست
درون خانهٔ من سر بکش بیا و ببین
که تارهای غم پارتا کجا جاریست
درآں بلندی گل بوئی آفتابی رنگ
پرنده ها به تماشائی باغ می رفتند
و من
دلم چو لاله به داغ سیاه خویش گریست
پرنده وار سرودم
نوای لطافت سبز!
چو دل شکسته ترنیم
چو پر شکسته ترین مرغ

بہ تلخوارہ بہاری کہ ہست ۔ دل تنگم .... لے

روئیں نے اپنے غم کو بے پایاں اور بے مثال بتاتے ہوئے اس بات کا اظہار کیا ہے کہ وہ بے بال و پر پرندہ سے بھی زیادہ شکستہ اور غم زدہ ہے اور بہار کے خمار سے دل تنگ اور پریشان ہے۔

روئیں کا یہ انداز اُن کی دیگر نظموں میں نمایاں ہے۔ چنانچہ یاد بہاری کی تلخ نوائی کے اثرات خزاں اور زمستان میں بھی موجود ہیں۔ بہار کی رخصت پر باغ میں یہ خبر آتی ہے کہ اور سبزہ اور پتیاں ماتم کرتی ہوئی باغ سے مخاطب ہو کر کہتی ہیں کہ اگر باد نسیم تیرے خشک ڈنٹھلوں پر کلیوں کے نگینے جڑنا چاہے۔ اور غم گشتہ پرندہ لوٹ کر آجائے تو خدارا "ہم کو" ہمارے سبزہ اور شادابی کی خاطر، اس علاقہ سے رخصت مت کر اور پرندہ بھی اپنے "سبز آشیاں" سے درخت کی شاخوں پر بیٹھ کر دور دراز علاقہ میں پرواز کرنے کا گیت نہ گائے۔ کیوں کہ اس صورت میں تو بے چارہ اور تنہا رہ جائے گا اور جب تو اپنی زبان اپنے مدعا کو بیان کرنے کے لیے کھولے گا، تو وہ مخاطب صرف اور صرف زمیں ہوگی اور وہ بھی اپنی بے دست و پائی ہی کی بنا پر وہاں اکیلی رہ جائے گی اور پھر اے باغ تو اپنی عریانی کے ساتھ تنہا ہوگا اور اس بے چارگی اور بے دست و پائی میں دوست و آشنا ہمیشہ کی طرح دور ہو جائیں گے:

باغ

یک شب ہواز کوچ بہاراں بہ باغ گفت
نجوای غم سرشت ہزاراں گیاہ و برگ
در گوش باغ خواند
ای ماندہ در نہایت غربت
یک روز اگر پرندہ گمگشتہ ای باغ بازگشت

لے در کوچہ ہای سرخ شفق گزینہ شعر امروز۔ کابل، ۱۳۶۰ھ ش/ ۱۹۸۱ء ص ۱۳۰-۱۳۱

برشاخه‌ات نشست
یک روز اگر نسیم بهار شگوفه بار
بر پنجه‌های خشک تو بنشاند صد نگین
ما را بپاس سبزی هستی که داشتیم
از یاد خود مبر
با او بگوی قصه دوران درد را
ایام تلخ ناک غم اندوه سرد را
مرغی ز شاخه خواند
ای آشیان سبز
من نیز میروم به دیاران دوردست
گر باد هرزه گوی
دیروز از بهار دروغین خبر رساند
قلبم که از شگفتن یک گل
امروز مرده است

.. ..

اکنون چنانکه باد
تابوت برگهای خزان را
بر دوش می‌کشد
تابوت یادهای کهن را
بر دوش می‌کشم

.. ..

تا باغ لب کشود
تنها زمین به ماتم سردی نشسته بود

ا؎ مجلہ عرفان شمارہ ۱۱، ۱۲، ۱۳۵۲ ہجری/۱۹۷۴ء کابل صفحہ ۵۴-۵۵

آنگاه باغ ماند
وعریانی

. . . .

ذیل میں ایک منظومہ جدید اسلوب اور تازہ طرز میں نقل ہے۔ جسے شاعر نے کابل کی بات چیت کے لہجہ میں دو پتھر توڑنے والوں (شیر اور شریف) کی زبان سے بشکل شعر ادا کیا ہے اور اُن کی سخت پریشان کن زندگی اور اُن کی محرومیوں کا ذکر کیا ہے بہ جائیکہ وہ دوسروں کی آسائش اور آرام کے لیے عمارتیں تیار کرتے ہیں اور صاحب ثروت دن رات اس میں عیش و آرام کرتے ہیں۔ ان بے چاروں کو پیٹ بھر کر کھانا بھی میسر نہیں ہوتا ہے ان کے بال بچے غذا کی کمی اور دواؤں کی فراہمی کے بغیر ان کی آنکھوں کے سامنے جاں بحق ہو جاتے ہیں۔ یہ باتیں شاعر بہ حسن وخوبی واضح کرتا ہے: ۔

سنگ شکن

سالہا بود کہ "شیر"
زن وفرزند خودہ (خودرا) .....[1]
کت (با) یک پای چلاق (لنگ)
کت یک بیل و کلنگ
نان می داد

. . . .

سوبکی (صبحانہ) وخت (وقت) کہ ابرای (ابرہای) سفید
بہ سر خانہ او می آمد
سو بکی وخت کہ نیش افتو (آفتاب)
از سر کوہ نمایان می شد
غم ہر روزہ اوگل می کد (می کرد)

به غم یافتن نان می شد

.. ..

سنگ شکن بود
او به همرای "شریف" سنگ کش
همه روزای (روزهای) دراز
لنگ لنگک می رفت
از همون (همان)، پیچ وخم راه که راه دگراس (است)
سون (سوی) سنگای (سنگهای) کلان
کت یک بیل و جبل
کت یکدانهٔ نانی که زنش
بین دستمال گل سیب - سرش می بستیش.

.. ..

چشمش امروز تراس (است)
غمش امروز برنگ دگراس
وختی از خانه برآمد
نه کسی نانش داد
نه کسی گفت فلانی
شو (شب) که شد دیر نیایی که تنا (تنها) می مانم
پیش چشمش زن دل خواهش مرد

.. ..

نیمه روز پس از سنگ کنی
خسته شد، شیشت (نشست)
او به مانند دگه کم بغلا (بی بضاعت ها)
سون بدبختی و بیچارگیش
بحیرت بگردیش (بفکر افتاد).

ای عجب ملک خراب !
این چه هر سو که بینی درد اس (است)
اینا چه هر سو که بینی مرگ اس (است)
تا بکی بدبختی
تا بکی سبر
مرکه سالای (سالهای) دراز
سنگ تامیر (تعمیر) بزرگاره (بزرگ ها را) برای پای چلاق (با این پای لنگ)
کندم و کندم آخره
هی چه شد هیچ !
یک شوام (یک شب هم) طفلم و بیچاره زنم
به شکم سیر نشد
دست براوله (آبله) ده اینجه خوار اس (در اینجا خوار است)
هم از دیدن ما بیزار اس
اُف که نادان بودم
حالی می دانم که
بخت حاکم بخلا یک رنگ با است
روی او تا نی دگه (آنهای دگر)
همه از زردی، رخسارهٔ ما گلرنگ اس
خون، ما میره به یک جوی - وازونا (وازآن ها) به یک جوی
راست می گفت (شریف)
بین خانا (خان ها) و فقیرا (فقیرها) جنگ اس

.. ..

قامت "شیر"
از سر سنگ بلن (بلند) گشت

او به خورشید که مغرور و بزرگ
سوی او می خندید
خیره شد
خشم در چهرهٔ او می جوشید
به صدا گفت: شریف!
کوه ها گفت: شریف..... شریف..... شریف
وز آن سوی صدای برخاست
شیر
کوه ها گفت که شیر..... شیر..... شیر

دکتور اسداللہ حبیب

اسداللہ حبیب ۱۳۲۰ ہجری ش / ۱۹۴۱ء میں کابل میں پیدا ہوئے۔ شہر میمنہ کے مکتب میں ابتدائی تعلیمات حاصل کی اور ثانوی تعلیم دارالمعلمین کابل میں پائی اور بی۔اے زبان و ادبیات کے کالج متعلق بہ کابل یونیورسٹی سے کیا۔ پھر ماسکو یونیورسٹی کے مشرقی زبان کے انسٹی ٹیوٹ سے ڈاکٹری کی ڈگری حاصل کی۔

فی الحال وہ کابل یونیورسٹی میں ادبیات دری کے شعبہ میں پروفیسر ہیں اور ۱۳۶۰ھ، ۱۹۸۱ء افغانستان کی انجمن شعراء و مصنفین کی جمہوری انجمن کے صدر تھے۔ اسداللہ حبیب باوجودیکہ عاشقانہ شاعری بھی کرتے رہے ہیں لیکن مجموعی حیثیت سے جمہور اور عوام کے شاعر ہیں۔ سیاست اور انقلاب کے شاعر ہیں[1] وہ زیادہ تر جدید شاعری کرتے ہیں اور طرزِ جدید کے ممتاز شعرا کی صف اول میں شمار ہوتے ہیں۔

ان کی نظم "اعزا" کا ایک نمونہ درج کیا جاتا ہے۔ اس نظم میں شاعر اپنے حسین محبوب کو دیکھ کر اپنا ہوش و حواس کھو بیٹھا ہے اور یہ ارادہ کرتا ہے کہ اپنے محبوب کو جو صاحب اولاد ہے، اپنے قریب پائے، اس کے ساتھ رات گزارے اور بیابان

---

[1] درکوچہ ہای سرخ شفق، گزینہ شعر امروز، شورای فرہنگی پوہنتون کابل، ۱۳۶۰ ہجری ص ۱

یں اُگے ہوئے عشق پیچاں کی مانند اس کے سیراب اندام پاؤں سے پست کر اس کے بچے کے لیے افسانہ کہے۔ چنانچہ اس کا خیال ملاحظہ ہو:۔

افسانہ

من امشب ہمچو پیچک ہای محروم بیابان ہا
بدور ساقہ سیراب اندام تو می پیچم
و یا، ہمچون کلاغ تشنہ بیابم
زلال چشمہ سار بوسہ ات را با تمام شوق می نوشم
شب موئی ترا کہ آشیان عطرہای ناہماہنگ است
می بویم
من امشب با تو می مانم
و با تو
تا سپیدہ در تنور لذت گم کردہ می سوزم
من امشب با صدای مرد بیگانہ
بگوش طفل تو افسانہ میگویم
و چشماں ورا با خواب می بندم
نمیدانم کہ فردا باز این در را کہ خواہد کوفت
کہ فردا با صدای مرد بیگانہ...
بگوش طفل تو افسانہ خواہد گفت
کہ چشماں ورا با خواب خواہد بست
۔ و کہ روزی بہ گوش کودک تو بی حساب
افسانہ خواہد گفت
و این افسانہ ہا از یکدیگر بیگانہ نخواہد بود......[1]

اس نظم کا اچھوتا خیال کس قدر دلچسپ ہے معشوق اور محبوب کے "چشمہ سار" سے

---

[1] "زوندون"، شمارہ ۴۱۰ (۳۰ جنوری ۱۹۸۱) کابل ص ۲۶

"پیاسے کوّے کی مانند" "بوسے" لے کر اپنی پیاس بجھانا چاہتا ہے اور زلفوں کے عطر آگیں آشیانہ کو سونگھتا ہوا کھوئی ہوئی گم کردہ لذت کے تنور میں جلنا بھی چاہتا ہے کیوں کہ آنے والے کل کو کوئی اور اس در پہ آئے گا۔ اس سے ہم کنار ہوگا۔ اس کے بچے کے کان میں بہت ساری کہانیاں کہے گا اور وہ کہانیاں خود ایک دوسرے سے بیگانہ ہوں گی۔

ایک اور نظم (کوہ و آفتاب) میں اسد اللہ حبیب اپنی شاعرانہ اور لطیف زبان میں اور خوب صورت و زیبا الفاظ کے درمیان" برف ہائی سپید" کو" امید کی سپیدی" سے اور" لالہ کی رنگینی" کو" شفق کی سرخی" سے تشبیہہ دیتا ہے۔ ناکامی کو نفرت انگیز اور پرشکستہ شاہباز کو کبوتر کا" جیرہ خوار" کہتا ہے، انقلاب کی دعوت دی ہے تاکہ وہ اس بدبختی اور پسماندگی کے خلاف علم بلند کریں اور سورج کی مانند کامیابی کے کوہستانوں کی طرح نجات کے مقصود و محبوب سے ہم کنار ہوں:

کوہ و آفتاب

من از زبان قصہ ہای کہنہ
از زبان سالہای رفتہ
حرف تازہ ی شنیدہ ام
کہ زندگی تسلسل سپیدہ ہا است
سلام بر تو ای امید آہنین
ای امید آہنیں سربلند زیستن
میان راہ قلہ بلند۔ بر فگیر تو
منم کہ بر جبین این زمین پراندوہ بوسہ میدہم
کہ ریشہ ہای تشنہ حیات من
از آں عصارہ حیات می مکد
و بامداد پایگاہ، پا بہ نیمہ شب

چو پاسخ سفارش زمان
به پاک دامن سپید آن
ز رنگ سرخ خون خویش
نقش لاله می نهم ......
نگاه ناشکیب آهوان دره ها
ز ناشکیبی زمانه قصه می کند
نگاه کن که آب جائی مانده نفرت آور است
و شاهباز پر شکسته جیره خوارۀ کبوتر است
بریں زمیں که تو و من از آن
عصاره بهار را مکیده ایم
.. ..
بیا که همچو تیغه های کوهها
برغم هر که تیرگی و تیره پرور است
به شادمانی طلوع آفتاب سرکشیم
و آفتاب وش
برغم هر چه کهتری و بنده بارگیست
تیغ استواری و شکوه را برکشیم ......[1]

اس نظم کے استعارہ اور بامعنی کنایہ کی کامیاب پیش کش کے بعد حبیب انقلاب کے اعلانیہ اظہار پر آجاتے ہیں اور اس وقت منظوم کی ہے۔ جب کہ شام ہفت ثور ۱۳۵۷ش/۲۷ اپریل ۱۹۷۸ء) کو محمد داؤد خاں اور اُن کے ہمراہیوں کی سرکوبی جاری تھی۔ شاعر نے اپنے احساسات کو اس انقلاب کے بارہ میں واضح کیا ہے اور "غرش تفنگ" "غرلو سیاہ" "تهاجم" اور "مرغان آتشیں پر" کا ذکر چھیڑا ہے اور آیندہ والے دن کے لیے "لوائی علق" کے بلند ہونے کی خوشخبری سنائی ہے اور نجات کے دن نکلنے

---

[1] مجلہ ژوندون ۲۴ سرطان ۱۳۵۷ (۱۵ جولائی ۱۹۷۸) صفحہ ۱۷

والے سورج کو سلام کرتا ہے"

سلام بہ انقلاب

امشب کہ از فراسوی پر ہول صخرہ ہا
فریاد مرگ می جہد از میلہ تفنگ
در ہر ہجوم لشکر دہقان بہ قصر خان
چو آذرخش می پرد آتش ز پشت سنگ

.. ..

ہورای دست خیز ہزاران تفنگ دار
افگندہ ترس در دل کوہپایہ ہای دور
مانند بہ لوح مشکی شب از گلولہ ہا
در ہر شلیک حملہ ہزاراں کماں نور

.. ..

از غرش تفنگ و غریو سپاہ خلق
پیچیدہ است نالہ گرگان بہ غارہا
چون جرہ بازہای تہاجم شود فرو
مرغان آتشیں پر جت (1) بر حصارہا

در آسمان تیرہ وامیدوار شہر
جز بوشش داغ مرمی ورقص شرارہ نیست
ہنگام واپسیں یورش اژدہای تانک (2)

---

1. مطلب جٹ طیاروں سے ہے۔
2. جنگی ٹینکوں سے مراد ہے۔

اُردوی ظلم را بجز از مرگ چاره نیست

فرداسلام میدہد از مشرق آفتاب
گاه طلوع گرم به گلگون لوای خلق
جاوید باد قدرت پیروز توده ها
در شهر وده به گوش رسد هورای خلق

.. ..

فرداکه بر خرابهٔ قصر ستم شود
در اهتزاز رایت خونین انقلاب
ای آفتاب روز رهائی به تو سلام
بر داد گاه رنجبران گرم تر بتاب .....[1]

.. ..

پھر بھی حبیب اپنے شہر کابل کی تعریف و توصیف سے باز نہیں آتے۔ اُس شہر، اُس کے لوگوں، مردوں، عورتوں، پہاڑوں، علاقوں، درختوں پرندوں اور انقلاب پرور سرزمین جس نے اُن کو پیدا کیا ہے اور اُس کے دو مشہور پہاڑوں آسمائی و شیر دروازہ کے مفصل ذکر کے ساتھ اس کے پیدا کردہ بچے کی بلند بینی اور بلند پروازی کی ستائش کی ہے۔ حبیب نے کابل کے کامگاروں کی بھی مدح کی ہے۔ جو نئی زندگی اور نئے زمانہ کے انتظار میں ہیں اور آخر آخر میں کابل شہر کو اپنی امیدوں کا آشیانہ قرار دیا ہے ملاحظہ ہو:۔

کابل

کابل!
ای فسانه شهر، شهره بافسانه مردها
با حماسه آفرین زنان

---

[1] دریچه هائ سرخ شفق، گزیده شعر امروز۔ شورای فرهنگی پوهنتون کابل ۔ ۳۶۰/۱۹۸۱ء ص ۹۰

کوه و بارهٔ قدیمی ات
پهلوان تیغ آخته به دوش
صخره تو شاعر نشسته
بالبان بسته دل پُر از خروش
بر درخت
سبزجامه عاشقی ستاده
پنجه هاش تا ستاره ها گشاده
زلف ها به باد داده
با ترانه های عشق در گلو
هر پرنده ات فرشته یی که از رهائی اش سرودها
به لب

این زمین درد دیده
انقلاب تابناک ثور زاد
ثور پر فروغ
ثور نامدار
جاودانه شیر دروازه ات .....[1]
کنام شیر سرخ آفتاب باد!
آفتاب کامیابی و برابری و عدل
آسمایی ....[2] ات آشیانهٔ عقاب های انقلاب
کابل!
ای همه بلندی

---

[1] دروازہ کابل شہر کے درمیان بنا ہے۔
[2] کابل کے ایک پہاڑ کا نام

ای پر غرور
کودک تو از نخست روز
چشم بر فراز دوخته است
پر به سوی قله ها کشاده است
وز پرنده هم پرنده تر
دل به آبی اوجها نهاده است
کابل!
در میان دستهات
زرگران ز زر و لاجورد
حلقه ها به گوش آفتاب کرده اند
حلقه ها به گوش ماه
حلقه ها به گوش هر یک از ستاره ها
و آهنگران تو
پتک ها بلند و
کوره ها و سینه ها همیشه گرم
عصر تازه، زندگی تازه را عقیده مند
کابل!
ای تو شهر شهرها
شهر انقلاب
شهر کار
آشیانه امیدهای من ......[1]

شاعر کی انقلابی اور قہرمانانہ خصلت اسے ہمیشہ اُس کے معاشرہ کے افلاس
فخر، غم اور خوشی کی جانب متوجہ رکھتی ہے اور وہ ہر اُس موضوع کو جسے وہ اپنی

---

[1] در کوچه های سرخ شفق، گزینه شعر امروز، شورای فرهنگی، پوهنتون کابل، ص ۲-۳

شاعری کے لیے منتخب کرتا ہے اُسے اپنے سماج کے حالات و کیفیات اور احساس و اظہار سے جدا نہیں کر سکتا ہے۔

حبیب اسی قبیل کے شاعر اور ادیب ہیں۔ وہ نثر و نظم دونوں کے مالک ہیں اور اُن کی کچھ کہانیاں روسی زبان میں ترجمہ ہو کر شائع ہو چکی ہیں۔

کابل یونیورسٹی میں فارسی دری کے پروفیسر جناب نکہت سعیدی اسداللہ حبیب کی نثر و نظم دونوں کے بارہ میں اس طرح لکھتے ہیں:-

"از سالہای ۱۹۶۰م بدینسو۔ پیش رفتہائی از راہگذر کیفیت۔ در نثر ہنری رخ دادہ و نویسندگان جدید ظہور کردہ انداز جملہ آنان نویسندۂ جوان اسداللہ حبیب مقام مہمی را احراز کردہ است داستانہای کوتاہ او مخصوصاً ناول "سپید اندام" بہ سطح بلندی رسیدہ ......

مقدار نوشتہ ہای حبیب نیز نسبتاً زیادہ است کارہای ادبیش را با شعر آغاز کرد۔ شعرہایش در مجلہ ہا چاپ شد و یک مجموعہ چاپ ناشدہ اشعارش ہم ہست۔ شعر او بعنوان "حماسہ انسان" جالب دقت میباشد سپید اندام در آخر سال ۱۳۴۸۔ ش در کابل انتشار یافت۔ موصوف ضمن برشمردن داستان ہای افغانی کہ بزبان روسی ترجمہ شدہ اند چنین ادامہ می دہد..... در ہمہ این مجموعہ ہا جمعاً سی و پنج داستان دری (بہ شمول پانزدہ داستان اسداللہ حبیب) شصت و یک داستان پشتو ترجمہ شدہ اند[1]

در سال ۱۹۷۴ مجموعۂ از آثار اسداللہ حبیب بہ ترجمہ روسی آں در مسکو چاپ شد کہ ل۔ ن۔ گیسیلوا مترجم قسمتی از آن کتاب مقدمۂ بر آں نوشتہ بود۔ ایں نخستین مجموعہ یک نویسندۂ افغانی بود کہ بہ روسی چاپ می شد۔ بہ عقیدۂ گیسیلوا در آثار اسداللہ حبیب موضوع وہ مقام بر اندازۂ ئی را اشغال می کند...... [2]

---

[1] مقالۂ نکہت سعیدی۔ نثر جوان و جدید افغان در زبان دری۔ مجلۂ عرفان شمارہ ۳-۴-۱۳۵۹ صفحہ ۱۴-۱۹

[2] دکتور خدای نظر سرفان، دلو، حوت ۱۳۵۸ (۱۹۷۹م) کابل صفحہ ۶۷

بہر حال حبیب کے اشعار کے بارہ میں کہا جا سکتا ہے کہ وہ پُر فکر و انقلاب انگیز ہیں اور زیادہ تر عوام کے اصل چہرہ کا عکس پیش کرتے ہیں اور ان کی زندگی کی محرومیوں، نا برابری اور بے حاصلی کے مختلف پہلوؤں کو آشکارا کرتے ہیں۔ حبیب ایسے شاعر ہیں جو عوام سے متعلق ہیں اور نئے اور جدید طرز میں شاعری کرتے ہیں اور اسی لیے انھیں افغانستان کی جدید شاعری کا نمایندہ کہا جاتا ہے۔

آئینہ

یوسف "آئینہ" یعقوب معمار کے لڑکے ہیں اور اُن کی پیدائش ۱۲۹۸ (۱۹۱۹م) میں ہوئی۔ کابل کے مکتب عالی میں تعلیم حاصل کی ۱۷۔۱۸ ۱۳ شمسی سال میں ایک کمپنی میں بحیثیت ترجمان کے کام کیا اور پھر چند سال تک "آژانس رادیو" اور "انیس" جیسے مختلف رسائل میں کام کرتے رہے اور پھر وزارت اقتصاد ملّی میں رہے اور ۱۳۲۷ ش (۱۹۴۸م) وزارت اقتصادیات کے سالانہ مطبوعہ کے مدیر عمومی کی عہدہ پر فائز رہے۔ پھر مجلّہ "برگ سبز" کے مدیر عمومی بنے اور علاوہ ازیں وزارت زراعت کی کتاب خانہ اور میوزیم کے عام نشریات کے مدیر عمومی بھی رہے ہیں ....[1]

آئینہ شعر نو کے شیدائیوں میں سے ہیں اور اس میدان میں اپنے آپ کو صاحب طرز لوگوں میں شمار کرتے ہیں اور اب تک وہ کئی شعری انعامات حاصل کر چکے ہیں۔ تازہ اور نئی تشبیہات استعمال کرنے میں اُن کی کوشش قابل توجہ ہے اور وہ اپنی شاعری میں فطری مناظر کو دیگر تمام چیزوں سے زیادہ جگہ دیتے ہیں۔

ایک زمانہ ہوگیا ہے کہ وہ "تار" نامی کتاب پر جو ادبی تحریکات اور تحولات کو تاریخی حادثات، سماجی عوامل اور وقت اور ماحول کے عمل کے نتائج پر مبنی

[1] خستہ معاصرین سخنور سال ۱۳۳۹۔ش ۱۹۶۰۔م۔ کابل ص۵
[2] خستہ معاصر افغانستان، انتخاب محمد سرور مولائی، انتشارات رز تہران، ۱۳۵۰۔ش ص۱۷

ہے، کام کر رہے ہیں۔ وہ جدید اور قدیم دونوں طرز میں شعر کہتے ہیں اور "معاصرین سخنور" کے مرتبین نے اُن کے دو غیر مطبوعہ کلیات "بستان، صنعت اور "نوای عزت" کا ذکر کیا ہے۔[1]

اب ہم ان کے دونوں طرز میں کہے گئے اشعار کے نمونے ذیل میں پیش کریں گے۔ جس سے آئینہ کے کلام کے معیار کا اندازہ ہو جائے گا۔ پہلے طرز قدیم میں ایک غزل ملاحظہ ہو:۔

بشوق طرز خرامت غزال صحرا مست — ہر آن قدر کہ بلند است سرو پیشت پست
ملامتم چہ کند مدعی بر ستۂ خود — ز دام زلف گرہ گیر یار مرغ نرست (نرست)
بپای سیم بران چون دل شکستہ من — نگشتہ ہیچ متاع خراب دست بدست
پئ ربودن دل فتنۂ دگر دارد — کرشمہ ہای توای خودنما بروی دست
زبسکہ دیدہ فریبست چشم فتانش — تمام مردم شہرند محض چشم پرست
بدان طریق کہ برخاستگی قیامت خاست — بدین نظر از نشستی کہ آفتاب نشست
بسان شبنم گریان در آفتاب نمود — سحر بردیتو آئینہ تا فتاد شکست

جیسا کہ غزل کے پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اسے ہم شاعر کے کلام کی ایک معیاری غزل نہیں کہہ سکتے کیوں کہ نہ تو اس میں کوئی شعری صنف اچھی ہے۔ اور نہ ہی اس میں کوئی تازہ استعارہ، کنایہ یا ترکیب تازہ اپنی طرف متوجہ کرتی ہے۔ پھر کہیں کہیں نا مانوس اور مبہم کلمات بھی نظر آتے ہیں جیسے رستہ، دوسرے شعر میں اور اسی طرح آخری شعر میں "شبنم گریاں"۔ جو صرف قافیہ کی رعایت قایم رکھنے کے لیے زبردستی استعمال ہوا ہے اور ساتھ ہی یہ بھی کہ پڑھنے والا اس سے کوئی لطف حاصل نہیں کر سکتا ہے۔

آئینہ شعر نو میں زیادہ ماہر نظر آتے ہیں لیکن ان کی طویل نظمیں اپنا اثر کھو دیتی ہیں۔ یہاں اُن کے شعر نو کے کلام کے وہ نمونے پیش خدمت ہیں جس میں پہلا اس طرح ہے:۔

---

[1] خستہ معاصرین سخنور، ۱۳۴۱ ش (۱۹۶۰ء - کابل) صفحہ

با مستی نهفته بشرم از کنار خود
لرزان و ترسناک
دورم نمود و گفت : که دیوانه نیستی
آن پنجه های نرم
وین چشم پر عتاب
هر دو ستیزه کار
آوخ که در رواج محبت کتاب عشق
حق را گرفت و داد به خوبان روزگار
امشب مرا به بخش گلی از بهار خود
این آرزوست پاک
ای شمع هشدار پروانه نیستی
با حرف های گرم دل را بگو جواب
مژگان بهم فشار
ما از کتاب عشق گزیدیم باب عشق
این شعرهای نغز بماند یادگار
از ما نشان شور محبت درین ورق .... [1]

دل فروش

زلفها روی شانه می لغزد
رنگ شب بر بلور ریزانست
سیم ورز خمشه اوج میگیرد
وز نواهای گرم لرزانست

---

[1] محمد سرور مولائی - برگزیده شعر معاصر افغانستان - انتشارات رز تهران، ۱۳۵۰/۱۹۷۰ء ص۱۱

بانگ مرغان چو رنگہای سحر
می رساند نوای بیداری
نیم خواب آن دو چشم افسون گر
بازدنبال دل شتابانست

شستم از اشک دست و پایش را
زخم ہا نغمہ برون می داد
عشق و مستی و شور پر کردہ
از زمین تا بسقف ایوانست

بوسہ ہای نیازمندانہ
بر لب و چشم نازنین دادم
چشم خود بست و گفت آئینہ
دل فروشی نہ کار آسانست.....[1]

مندرجہ بالا نظم دل فروش میں شاعر نے کوشش کی ہے کہ وزن اور قافیہ کے ساتھ ساتھ اُسے ایک نیا انداز بھی دے۔ پہلے چار مصرعوں میں پھر دوسرے اور چوتھے میں قافیہ یکساں ہے۔ لیکن بعد کے مصرعوں میں سارے چار بندوں کا چوتھا مصرعہ اور اوپر بیان کیا ہوا مصرعہ ہی ہم قافیہ ہے پھر بھی الفاظ کا انتخاب اور اُن کا آہنگ خوب ہے۔

اس میں سلاست اور روانی بھی ہے اور بہ ظاہر کسی تشریح کی ضرورت نہیں ہے لیکن دو حروف وضاحت طلب ہیں جو غیر افغانی قارئین کے لیے مناسب ہے اور وہ چوتھے مصرعہ میں "سیم" اور پانچویں میں "رنگ ہا" ہیں۔

یہاں سیم بہ معنی تار جو آلات موسیقی مانند ستار رباب وغیرہ میں ڈالا

---

[1] محمد سرور مولائی ۔۔ برگزیدہ شعر معاصر افغانستان ۔ ۱۳۵۷ ش صـ۲۶ ـ ۲۷

جاتا ہے۔ ستار وغیرہ کے مانند موسیقی کا ایک آلہ ہے اور زنگ ہا جو ہاسٹلوں (لیلیہ)، وقشلہ (بیرکوں) وغیرہ میں طالب علموں اور فوجیوں کو حاضر کرنے کے لیے لکڑی کی مونگری سے دھات کے ٹکڑے پر ضرب مار کر بجایا جاتا ہے۔ (ہندستان) میں اسے گھنٹہ کہتے ہیں۔

جیسا کہ ہم نے کہا کہ شاعر آئینہ اپنے عوام کے احساسات، اتفاقات اور حادثات کے آئینہ دار ہیں اور ہر تحریک اور تبدیلی کو شاعر اپنی روح اور کلام میں سمونے اور پیش کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ جس وقت ۱۹۷۳ء میں افغانستان میں پہلی بار سردار محمد داؤد خاں کے ذریعہ شاہی نظام کا تختہ پلٹا گیا اور وہ خود بہ حیثیت رئیس جمہور امام حکومت اپنے ہاتھ میں لے بیٹھے تو پھر شعرا اور مصنفین نے اپنی اپنی جگہ اشعار اور مضامین لکھے۔ اُن تمام میں آئینہ نے اس انقلاب سے قبل کے حالات اور اپنی توقعات جو نئے نظام سے باندھی تھیں کو اس طرح منظوم کیا تھا:

رستاخیز ما

زندہ شد خاک وطن باز زنیروی جوان — گرچہ دادند زکف آب وطن بے وطنان[1]۔
دیو بگریزد از آں قوم کہ قرآن خوانند — سحر باطل شود از آیۂ پاک قرآن
نتواند کہ برد انیسوئی کہسار عقاب — نتواند کہ درین بیشہ جہد شیر ژیان
زآنکہ مردان وطن عاشق قربان گاہ‌ہند — نہ کند مرد وطن دار دریغ از سر و جان

---

[1] یہ تلمیح افغانستان اور ایران کے درمیان افغانی شہر نیم روز جہاں کہ دریائے ہیرمند دونوں مملکتوں کی سرحدیں متعین کرتا ہے، کے پانی کی تقسیم کے معاہدہ کے سلسلہ میں ہے۔ یہ قرارداد محمد ظاہر شاہ کی حکومت کے آخری سالوں میں صدر اعظم محمد موسیٰ شفیق کے ذریعہ طے اور انجام پائی اور افغانستان کے بیشتر لوگ یہ یقین کرتے تھے کہ یہ قرارداد امیروں کے حق میں ہے اور دریائے ہیرمند کا پانی فروخت کر دیا گیا ہے۔

هر کجا اهل دلی بود خراب آفتاده — دست ها سوی خدا بهر دوا و درمان

تا درین فرصت ها یک زشت دروں — ناگهان جست یکی شعله بسی نور فشاں

باز شد صفحهٔ نو زینت تاریخ وطن — زاں که تاریخ جهاں ساخته مردان جهاں

قهرمان خیز بود کشور افغاں مرداں — بوی مردی دمد از خشت سرای ویراں

اهل دیواں که برشوت شده در شهر مثل — بعد ازیں حکم نراند، مردر زنداں

نه کسی زور بگوید نه کسی زور کشد — خلق آسوده بمانند ز زور آزاراں

نیست جز عدل بعالم ثمر جمهوری — از ره راست ندیده است کسی هیچ زیاں

سرنوشت تو بدست تو و خود حاکم خود — ایں نظامیت سزاوار برای انساں

همت رهبر آگاه و جواناں وطن — کشتی غرقه ما را برهاند از طوفاں[1]

آئینہ کا اپنا عقیدہ شاہ کے دوران حکومت میں عوام کے حال و احوال سے متعلق یہ تھا کہ یہ چیز قابل برداشت نہیں تھی اور " دست ہا " سوی خدا..... کا مطلب یہی تھا کہ لوگ عاجز آکر دست بدعا تھے اور افغانستان کے لوگوں کا قرآن سے عقیدہ بھی ظاہر کیا ہے۔ جمہوری نظام کو " راہِ راست " کہا ہے اور آئینہ کے بقول اس " رہبر آگاہ " سے اُسے یہ توقع ہے کہ وہ افغانستانی عوام کی ڈوبتی ہوئی کشتی کو اس طوفان سے صحیح و سالم نکال کر کنارے پر لے آئے گا۔

ازہر

احمد شاہ ازہر فیض یار غزنی قدیم شہر میں ماہ جدی ۱۳۲۶ ہجری ۱۹۴۷ء میں پیدا ہوئے اپنی ثانوی تعلیم کابل میں لیسہ نادریہ میں مکمل کی اور پھر کالج میں ادبیات کی تعلیم میں مشغول ہو گئے۔ وہاں سے فارغ ہونے کے بعد وقت گزاری کے لیے فوجی بن گئے اور وہاں کی تربیت حاصل کرنے کے بعد سرطان کے موذی مرض کا شکار ہو گئے

---

[1] مجلہ میرمن (زن)، شمارہ (۵) سال ۱۳۵۲ (۱۹۷۳ م) کابل صفحہ ۲۱

اور ۲۱ سرطان (۱۱ر جولائی ۱۹۷۵ء) کو عالم بقا کو سدھارے۔

انھوں نے تقریباً ایک ہزار شعری یادگاریں چھوڑی ہیں جو قدیم اور جدید طرز اور انداز میں منظوم کی گئی ہیں۔ وہ ترانہ لکھنے میں ایک جدید طرز کے موجد تھے اور تخصیص رکھتے تھے اور اُن کے بہت سارے گیت مقبول خاص و عام ہو چکے ہیں۔ اُن کی شاعری کئی عالی انعامات کے تحفے حاصل کر چکی ہے۔۔۔۔[1]

ازہر نے بیشمار ترانے اور گیت لکھے ہیں اور جو افغانستان ریڈیو کے موسیقاروں کے گلے کے ذریعہ لاکھوں افغان باشندوں کو وجد میں لا چکی ہے

---

[1] مجلہ عرفان شمارہ ۵ ۔ ۸ سال ۵۴ ۱۳۵ھ ۔ ش (۱۹۷۵) کابل ص ۱۲۳

یادداشت: اس نامراد اور جنگ جو جوان کی موت جو کہ اس ناچیز کے قریبی دوستوں میں تھا اور تقریباً دو سال کے عرصہ تک (۱۳۵۰، ۱۳۵۱) کابل یونیورسٹی (لیلیہ پوہنتوں) میں ہم نے ایک ہی کمرے میں زندگی گزاری تھی اور اکثر ہم لوگ مل کر ریڈیو افغانستان جایا کرتے تھے (میں بلوچی خبروں کے لیے اور ازہر اپنی دھنوں اور گیتوں کے لیے موسیقاروں کے پاس جاتے تھے. ازہر مجھ سے خاص عقیدت رکھتے تھے اور مجھے شعر و شاعری (مخصوصاً بلوچی زبان) میں شوق دلایا کرتے تھے اور پھر دوسری جانب اس خاکسار کو استاد بھی کہا کرتے تھے جو کہ تقریباً اُن کا تکیہ کلام بن گیا تھا۔ اگر میری یادداشت صحیح ہے تو غالباً یہ ماہ ثور ۱۳۵۱ کا سال تھا کہ انھوں نے ماں کی تعریف میں ایک گیت لکھا تھا اور چاہتے تھے کہ اُسے روز مادر (ماؤں کا دن) منائے جانے والے دن انعامی نظم قرار دینے کے بھیجیں اور یہ ذمہ داری میرے سپرد کی اور میں نے بھی اسے اچھی جان کر انتخاب کیا جو کہ اسی سال شائع ہونے والے انعام کی مستحق قرار دی گئی۔ خوش اخلاق اور مخلص دوست اظہر اپنے دوستوں کے لیے نا قابل فراموش ہے۔ ثور (افغان کلینڈر کا دوسرا مہینہ)

لیکن انھیں ترانوں کے ساتھ ازہر نے با معنی اور گہرے اشعار بھی لکھے ہیں۔

ایک منظومہ جسے انھوں نے جدید اسلوب میں لکھا ہے جس کا عنوان (توای اختر اسیر استی) ہے۔ انسان اور لوگوں کو ستاروں کے استعارہ میں بیان کیا ہے اور اُسے اُس کی طاقت اور توانائی کی طرف متوجہ کرتا ہے اور پھر اس کے احساس ناتوانی پر آنسو بہاتا ہے، افسوس کرتا ہے اور کہتا ہے (ترا نیر دست چرخ افگن) "چون بہمن" اور اگر جنبش، حرکت میں آئے تو ساری دنیا کو ہلا کر رکھ سکتا ہے:

توای اختر اسیر استی
توای اختر اسیر استی و می گریی به حال خویشتن شبہا
و لبس افسوس می بارد شہاب شعلہ خور بر تو
تو پنداری کہ بی نیرو دستی
ترا نیرو دست چوں بہمن
ولی بر خود چناں لرزی کہ اشک آید مرا بر تو
تو گر جنبی فلک جنبد، زمیں جنبد، زماں جنبد
تو کوچک نیستی
بہ مہر گی تو بزرگی او مہ و خورشید
ولی انساں بدور افتادہ ای از دامن امید
کہ چوں یک قطرہ ناچیز می مانی
چو برگ کہربائی چہرہ پائیز می مانی
توای اختر اسیر استی

اسیر استی ... [1]

شاعر اپنے ایک مصرعہ میں اپنی شاعری کے بارہ میں اس طرح کہتا ہے۔

---

[1] عرفان، شمارہ ۵، ۸ - سال ۱۳۵۲ھ ش ص ۱۲۵ - ۱۲۶

بزرگ اشعار شرر خیز شکوہ تم۔ فریاد زماں خفتہ ...[1] وہ بر با عزم جواں کے ساتھ اور حرکت کا محرک ہے۔ اس دور میں یاس اور ناامیدی نوجوانوں کے واسطے خود کو مثال بناتا ہے۔ اور لوگوں کے ذریعہ مسلط کی ہوئی (متزلزل) حکومت سے ڈر اور خوف کو شرم اور عیب سمجھتے ہوئے یہ کہتا ہے:

برمن کہ دریں عصرم و پُر شور و جوانم | مرگ است ز دل تار پوسیدہ کشیدن
ننگ است ازیں ہیبت پوشالی دیوان | در وادی خاموش سراسیمہ دویدن[1]

اسی طرح ذیل کے اشعار میں جو رنگ، احساس اور حوصلہ ہے اُن میں اقبال کے اشعار کا انداز نظر آتا ہے۔ طوفان کی موج ہے جو ساحل کے رخساروں پر تھپیڑے مارتی ہوئی کہتی ہے اور بڑی امیدوں اور ارادوں کے ساتھ خود کو ساحل تک پہنچاتی ہے اور شاید کچھ دیر تک آسمانوں میں بھی پرواز کرتی ہے تاکہ خشمگیں شہاب کے مانند سورج کو غروب و غرق کر دے۔

ان اشعار میں بڑے گہرے معانی بھی پوشیدہ ہیں اور شاعر عزم کرتا ہے کہ وہ علم و دانش کے نور کے دشمنوں کے ساتھ جنگ کرے اور ان گندی طاقتوں کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دے:۔

میروم چوں موج توفان آفریں | مُشت بر رخسار ساحل میزنم
میروم با قلب جوشان از اُمید | راہ ناہموار ساحل میزنم
میروم تا چوں شہاب خشمگین | در سپہر تیرگی عصیان کنم
میروم تا از سریر خودسری | دشمن خورشید را پایان کنم[2]

اس ہمت اور حوصلہ کو جو ازہر نے اپنے مندرجہ بالا اشعار میں نمایاں کیا ہے وہ علامہ اقبال کے ذیل کے اشعار کی تصدیق کرتا ہے:۔

ملت آوارہ کوہ و دمن | در رگ او خون شیران موجزن

---

[1] عرفان۔ شمارہ ۵ ۔ ۸ سال ۱۳۵۸ ھ ش ص ۱۲۵-۱۲۶

[2] ؍؍ ؍؍ ؍؍ ؍؍ ؍؍

[3] ؍؍ ؍؍ ؍؍ ؍؍

زیرک در دوئیں تن و روشن جبین   چشم او چوں جرہ بازاں تیز بین[1]

فکرت

فضل حق فکرت ۱۳۲۳ ھجری شمسی / ۱۹۶۴ء میں کابل کے ایک اَن پڑھ خاندان میں پیدا ہوئے۔ کابل کے لیسہ حبیبیہ میں نویں جماعت تک ابتدائی اور ثانوی تعلیم حاصل کی اور ۱۳۴۲ ھجری شمسی میں فوج کے ایک تربیتی کالج میں داخل ہو گئے اور وہاں سے ڈگری پانے کے بعد وزارت دفاع افغانستان اور قضائیہ قندھار کے محکمہ میں چند سال تک کام کرتے رہے۔ بعد میں وہ فوج کے مطبوعات کے متعدد مجلوں کے مہتمم کی حیثیت سے کام کرتے رہے اور پھر کلچر و ہنر کے جریدہ " حقیقت سرباز" کے مدیر کی خدمات انجام دیتے رہے۔

فضل حق فطرت ۱۳۵۹ کے آخری سالوں (۱۹۸۰) میں مسلح افواج کے نشریات کے شعبہ کی صدارتی انجمن کے رکن کی حیثیت سے کام کرتے رہے ہیں اور اب تک اسی فریضہ کی انجام دہی میں پورے انہماک سے مصروف ہیں۔

ان کے انقلابی اجتماعی اور عاشقانہ اشعار کا ایک مجموعہ بنام "درسنگر و در دفتر" مطبوعات کی دنیا میں "ستائی انعام" کا دوسرا انعام پانے کا مستحق قرار دیا گیا ہے[2]

اگرچہ فکرت کا دیوان اور بیشتر کلام دستیاب نہیں تھا لیکن اس بات کی کوشش کی گئی کہ مختلف مجلوں اور جریدوں سے اُن کے اشعار تلاش کر کے بطور نمونہ پیش کیے جائیں۔ چنانچہ فکرت کے وطن پرستانہ اشعار کا ایک نمونہ :

---

[1] پختو نہا از نظر علامہ اقبال۔ عبداللہ بختانی۔ کابل۔ سال ۱۳۳۵ھ ش ۱۹۵۶ م ص ۲۱

[2] ح بیژن۔ روزنامہ هیواد ۲۷-۱-۸۲ (۷-۱۱-۱۳۶۰ ھجری شمسی)

ای میهنم

ای میهنم! ای میهنم!
ای عشق بی همتائی من
ای گوهر یکتائی من
یاد اتمدایت بجان و تن
ای رونق فردائی من
گر با تو باشم میرسد
تا کهکشان پرواز من
گر بیتو باشم وای من

. . . .

ای میهنم! ای میهنم!
ای چل چراغ آرزو
وی مایه تابندگی
ای قبلهٔ آمال من
وی افتخار حال واستقبال من
یا بد ز تو جان و تنم
تابندگی، تابندگی
ای مامنم - ای گلشنم
شد سالها
کز دست نامردان دون
در خاک وخون اندر شدی

له مجلهٔ آواز شماره دوم، ۱۵، سرطان - ۱۳۵۷ - ۱۹۷۸ء - کابل ص ۲۸ - ۵۱

در دست این صیادها
با ناله و فریادها
یک عمر زندانی شدی
بی بال و بی شهپر شدی

. . . . . .

با خنجر اهریمنان
ببریده شد بازوی تو
خشکیده بانگت در گلو
در بند شد نیروی تو
غوغای تو فریاد تو
اندر گلو بشکست و مرد
نیروی فرزندان تو
در بازوان شان فسرد
اما ندانستند هیچ
کاین برج و بازوی ستم
با دست خلق رنج بر
بازو زسرباز دلیر
یک روز گردد سرنگون.
اما ندانستند هیچ
کاین بیستون سهمگین
با عشق شیرین وطن
با تیشه فرهادیان
یک روز می پاشد ز هم
یک روز می گردد زبون

. . . .

ای میہنم! ای میہنم!
دیدی ہوا خواہاں تو
این افسراں این عسکراں
این خلق این استم کشاں
یک بارہ شد آتش فشاں
ویرانہ کرد افسانوی کاخ ستم
افسانہ اندوہ وغم۔

. . . .

ای میہنم! ای میہنم!
دیگر نباشد ہستیت
در بند نیرنگ وفسوں
دیگر نباشد پیکرت
زنجیری آن مشت دون
رستی تو از دام ستم
شد دیو ظلمت سرنگوں
باشید زین پس سربلند
ای ہیرمند۔ ای ہندوکش
ای دشت و ہاموں وطن
ای آسمان نیلگون

شاعر نے اس طویل منظومہ میں جو کہ قدیم اور جدید کا آمیختہ ہے۔ اپنے وطن سے اپنے سرشار عشق کا تعلق ظاہر کرتے ہوئے گفتگو کی ہے اور اس کے ماضی کا ذکر کرتا ہے کہ وہ آج کمینہ لوگوں کے ہاتھوں خاک وخون میں لتھڑا ہوا پڑا ہے اور "خنجر اہرمن" کو "دیو رند" کے لیے استعارتاً استعمال کیا ہے جو پاکستان اور افغانستان کے درمیان اختلاف کا باعث بنا ہے اور حکومت افغانستان اسے کوئی اہمیت نہیں

دیتی ہے۔ اسی طرح افغانستان کے جنوب مشرقی خطّے (پشتونستان) کو انگریزوں کی وجہ سے الگ ہو جانے کو ایک بار جدا ہو جانے سے تشبیہ دی ہے۔ اس کے بعد اس کا اشارہ "کاخ ستم" کو "واژگوں" کرنے کا مطلب خلق اور فوجی افسروں کے ذریعہ (داؤد خاں کی حکومت) کو ختم کرنے سے ہے۔ اور وطن کے دشت و دمن کو مخاطب کرتا ہوا کہتا ہے کہ ان سب نے "دامن ستم" سے نجات پالی ہے اور اس کے بعد اُن کے لیے سربلندی اور فخر کرنے کا مقام ہے۔

فکرت کے انقلابی اور سماجی اشعار نے بیرون ملک بھی شہرت پائی ہے۔ ان تمام اشعار اور کلام میں سے جو کہ "ندائی بلوچستان" نامی ماہنامہ میں شائع ہوئے ہیں۔ (یہ ماہنامہ جو کہ خود ابھی اپنی جگہ آزاد بلوچستان کھو دیا ہے زیادہ تر دری میں بھی چھپتا ہے) اس نظم میں افغانی عوام سے اتحاد اور ملک کی سالمیت کے لیے "غول آدم خوار" دشمن سے نبرد آزما ہونے کی دعوت دی گئی ہے۔

ہمبستگی

(۱)

ای قہرمانان وطن!
ای رہرواں زندگی!
ای پیرو برنا مرد و زن!
یکجا شویم
چوں جسم در یک پیرہن
باہم رویم
با عشق ہم:
اندر مسیر زندگی
یکجا بسوی روشنی
یکجا بسوی بیغمی

(۲)

دریا شویم
توفان کنیم
سازیم دشمن را زبوں
ویراں کنیم
آں دیو استثمار را
آں غول آدم خوار را۔

یکجا شویم
باہم رویم
با عشق ہم:

...

یک مشت یک باز دشویم ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ اندر مسیر زندگی
با اتحاد آہنین ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ یکجا بسوی روشنی
در چمبر این تنگ درخت ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ یکجا بسوی بیغمی ...[1]
با وحدت و ہمبستگی
با عشق ہم با خون ہم
آبش دہیم
تا بار ور گردد سراسر این نہال زندگی۔

چونکہ شاعر خود ایک سرباز سپاہی ہے اس لیے وہ ہمیشہ ملک اور اس کے تاریخی زعما اور بہادروں کا ذکر کرتا ہے اور اپنی نظم "سرود میہن" افغان کے تاریخی ناموروں کا ذکر کیا ہے اور ان میں سے ابو مسلم خراسانی ما (میر محمد غلام غبار مولف کتاب "افغانستان در مسیر تاریخ" ابو مسلم عبدالرحمان ۷۲۰ء میں سفیدنج یا سپید دز یعنی شمالی افغانستان میں آج کے "سرپل" کہے جانے والے مقام پر پیدا ہوا) اکبر (وزیر محمد اکبر خاں غازی جنھوں نے انگریزوں کے خلاف بغاوت کی اور وحید کشمیری نے اس کی شان میں اکبر نامہ تصنیف کیا) اور اس کے علاوہ دوسروں کی شان میں اس نظم میں ذکر کیا ہے وہ لوگ کس قدر بلند و مایہ ناز شخصیت تھے) وہ اپنے ملک کی کامیابی کا خواہش مند ہے :-

طویل نظم کے چند بند نیچے نقل کیے جارہے ہیں:-

سرود میہن[2]

توای میہن۔ توای میہن۔
عزیز و با شکوہ ہستی

---

[1] ماہنامہ ندای بلوچستان، جون ۱۹۹۰ء، لندن ص۱
[2] شمارہ فوق العادہ روزنامہ "ہیواد"، ۱۶ اگست ۱۹۸۴ء ص۱

تو در چشم بہارہ ہستی
چہ گویم من
چناں ہستی چنیں ہستی
کہ تو آن قہرماں سازی کہ تو مرد آفریں ہستی
بہ قلب آسیا زیبا نگیں ہستی
زباں ناتواں مدح و ثنایت کی تواں میہن

.. ... ،، ..

ابو مسلم ......
اگر آن مرد دوران ہا
کہ در دریای توفاں زای عشقت دست و پای زد
براہ عشق تو جاں داد
اگر یعقوب .....[۱]
آں عیار سکزی آں تہمتن مرد
بہ مہرت در تمام عمر پیماں داد
پی آزادیت بود ای عزیز و مہرباں میہن

.. ..

بیاد آور تو از مرداں جان بازت
کہ در جولانگہ میوند .....[۲]

---

۱ یعقوب لیث صفار افغانستان میں صفاری حکومت کا بانی تھا۔

۲ میوند : قندہار میں ایک دشت ہے جہاں جولائی ۱۸۸۰ء میں انگریزی فوجوں اور افغانستان کے لوگوں کے درمیان محمد ایوب خاں کی سرکردگی میں جنگ ہوئی اور انگریزوں کو شکست فاش ہوئی۔ اور "افغانستان در مسیر تاریخ" کے مصنف کے بقول ۱۲ ہزار انگریز فوجی افسروں میں سے صرف ۲۵ آدمی زندہ بچے۔ افغان کی جوان بیٹی ملالی کی اس جنگ میں بہادری کے قصے زبان زد خاص و عام ہو چکے ہیں۔

چراغ آرزوئ شوم دشمن شد از دم خاموش
بیاد آور تو از "اکبر"
کہ بہر عشق تو صارسیز بی دشمن درید از خشم
کہ بہر سر فرازیہات، ای جولانگہ شاہیں
بجان دشمنات افتاد
کہ باشی سر بلند و سرخ رو، ہمچوں عقاب آسمان میہن

. .   . .

چہ گویم من چنیں ہستی، چناں ہستی
تو جسمستی، تو جانستی
بہشتستی، بہارستی
امید جاودانستی
بمانی ای امید جاوداں، تا جاوداں میہن

لیلا کاویان

لیلا کاویان ۱۳۲۹ھ ش (۱۹۵۰ء) میں کابل میں متولد ہوئیں۔ ابتدائی اور ثانوی تعلیم مدرسہ رابعہ بلخی میں تحصیل کی اور اپنی اعلیٰ تعلیم دارالمعلمین کابل میں پایہ تکمیل کو پہنچائی فی الحال وہ لیسہ ملالی اور افغانستان کی ڈیماکریٹک جمہوری شعرا اور مصنفین کی پارٹی کی ممبر ہیں۔[1]

اگر اس جوان شاعرہ کے کلام کا مطالعہ کیا جائے تو اُن کے فکر و خیال کے اندر وطن کا غم اور درد اور اُس کے عوام کا دکھ اور رنج بہت واضح طور پر دیکھا اور پایا جا سکتا ہے۔ وہ نئے طرز اور جدید اسلوب میں شعر کہتی ہیں لیکن عام فہم

---

[1] درکوچہ ہای سرخ شفق۔ گنجینہ شعر امروز۔ شورای فرہنگی پوہنتون کابل، ۱۳۶۰ء صفحہ ۱۲۲

اور عمدہ۔ بہر حال افغانستان کی سوسائٹی اور سماج میں جہاں سالوں تک عورتیں علم و دانش سے دور رکھی گئی ہیں موصوفہ جیسی حساس شاعرہ کا وجود بہت غنیمت اور قابل قدر ہے۔

وطن دوستی اور وطن پرستی سے متعلق لیلا کاویان کی ذیل کی نظم ملاحظہ ہو:۔

میہن

بتو می نازم ای میہن !
بتو ای قہرماں میہن !
بتو و آں قلہ ہای سربلند برف پوش تو
بتو و آں چشمہ ہای روشن جوشاں جاویدیت
بہ دریا ہای مست پرخروش تو
بہ سرسبزی ہر دشتت۔
بہ پربار ی ہر باغت ۔
بہ گلزارت
بتو می نازم ای میہن
بہ ذرہ ذرہ خاکت
بہ صخرہ صخرہ سنگت
بہ صبح روح بخش تپہ ہایت
بہ شام دلفریب درہ ہایت
بتو می نازم ای میہن !
بہ سادہ مردم پاکت
بہ ایں زحمت کشاں ایں سالہا بردہ بہ شانہ جبر ہر دوراں
بہ سربازاں تو مرداں بیباکت
بہ فرزنداں تو ایں خلق نیرومند

به این زنجیر گسل زندان شکن این موج توفان را
به این چون صخره پا برجا
به این چون موج بی پروا
بتو می نازم ای میهن!
اگر آتش بجان مردمت زد دست دژخیمان
اگر خون دل خلق ترا نوشیده استمگر
اگر صدها هزاران سال گشتی پایمال از خون خواران
بنازم من به این غیرت به این مردی
به این جنبش به این ایمان
به این رزمندگی نازم
به این بالندگی نازم
به این سازندگی - ای پرتوان میهن!
بتو ای قهرمان میهن!
بتو نازیده بودم سالها من
بتو نازم ای میهن! . . . . [1]

مندرجہ بالا شعر میں لیلا نے اپنے وطن اور اُس کے تمام جغرافیائی اور طبعی موجودات اور اس کے پاک لوگ اور جواں مرد بیٹوں کے وجود پر فخر کیا ہے اور وطن کے جانباز سرفروشوں کو "زنجیر گسل زنداں شکن" باغیرت اور "رزمندہ" قرار دیتے ہوئے یہ بتانا چاہا ہے کہ خود اُس کے بقول ان سب کی جد و جہد اسی انقلاب ثور کے لیے ہی رہی ہے۔

لیکن وہ منظومہ جواب ذیل میں نقل ہوگا۔ شاعر نے بارہ زبردست اور جاندار اشعار نظم کیے ہیں اور کل آج کے شاعر کے درمیان محکم قدیم اور تازہ کے بیچ ایک حد فاصل کھینچ دی ہے اور کہتی ہے کہ بنا اندیشہ پرانے قافیہ کے

---

[1] در کوچہ ہای سرخ شفق۔ گزینہ شعر امروز، شعرای فرہنگی پوہنتون کابل ص ۱۲۵ — ۱۲۷

قالب میں ڈھالا جائے تو وہ سود مند نہیں ہوسکتا ہے اور وہ "خسرو شیریں" کا ہر قدیم افسانہ آج کی شاعری کے موضوع "کار و تلاش" سے کوئی ربط و ضبط نہیں رکھتا ہے۔ بہر حال نظم انتہائی دلچسپ، موثر ہے اور پڑھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ آئیے مل کر پڑھیں :-

مضمون

گفتند چرا نغمہ گر نالہ خلقی
لبخند چرا مردہ بہ لبہای سرودت
گویا ہمہ شعر تو غم و درد و سرشک است
خنداریدم و گفتم :
ہان ! تا نفر یبد سخن از بلبل و گل ذوق کلامت
چشمی بکشا باز ترا از شاعر دیروز
کہ امروز
اندیشہ نورا نتواں
در قالب ہر قافیہ کہنہ بیاں کرد
مضمون زماں من و تو کار و تلاش است
افسانۂ ہر خسرو و شیریں نتواں گفت
روزیست کہ بایست
ہنگام زماں بود
با درد و نوای دل مردم
ہم فکر و زباں بود
روزیست کہ جز این نتواں گفت ... [1]

---

[1] در کوچہای سرخ شفق، گزینہ شعر امروز، سورای فرہنگی پوہنتون کابل ۱۳۶۰ ص ۱۲۲

اسی طرح اپنے ایک دوسرے منظومے "دختر خلق" میں لیلا نے افغانی خاندانوں کی لڑکیوں کی ایک ملاقات میں اُن کے اصل میں، شکل اور فکر کو بر ملا بیان کیا ہے اور اپنے والدین کے خلاف اپنی جراَت اور جنگ کو مثال بنا کر پرانے نظام کے خلاف لڑائی لڑنے میں پارٹیوں میں شریک ہونے کی علی الاعلان دعوت دی ہے اور یہاں تک کہ اس معاملہ میں ان سے جدا ہو جانے تک کا مجادلہ اختیار کرتی ہے۔ اور اپنے آپ کو "فرزند پیکار" سمجھتی ہوئی کہتی ہے کہ دشمن کی "زنداں و زنجیر" سے نہ ڈرو اور "فردای آزادی" میں اپنے فکر اور ایمان کو کامیاب جانتی ہے۔

دختر خلق

مکن خاموش مادر !
مکن خاموش، با دل سوزیت این شعله را مادر !
مزن با اشک خود آبی بر دی اخگر شوقم !
نگه در دیده ام کم دوز و کمتر کن ملامت را
مگو: "دختر ز دست ات روز من تار است"
مگو: رو حم: نیش طعنہ ہای تلخ بیمار است
مگو: ای دختر عاصی !
پدر دیگر ترا با نام فرزندش نمی خواند
برادر از تو رو گرداں
و تو اہر، ہمچوں من حیراں !
و این بالا ترین ننگ است ای دختر !
..... ولی مادر نمی دانی
کہ با دل سوزیت ہرگز نگردد شعلہ امید من خاموش
نمی دانی کہ روزت از نظام زور روند تار است
و جنگیدن برغم این نظام کہنہ تنہا کار مرداں نیست !

اگر کو بید با مشت و لگد با قہر و با خشم پدر۔ مادر !
برادر گر ز من شد رو یگرداں (روی گرداں)
در توی حیراں۔
من از راہی کہ رفتم پس نمی گردم !
ز من چشم تمنا دور دار اکنوں
مشو دیگر مشوش بہر بخت و سر نوشت من
کہ عشق تو دہ ہا خوں من شد در سرشت من !
برو مادر مجو دیگر نشاں دخترت از من
کہ من فرزند پیکارم
نمیترسم ز دشمن نی ز زور خنجر و تیرش
نمی ترسم ز زنداں و ز زنجیرش
کہ پیروز است در فردای آزادی انسان فکر و ایمانم
من از دختر خلقم ..... [1]

لیلا کاویان فکر تازہ اور تلاش نو کی شاعرہ ہیں۔ عصیاں گر اور ہمت شکن عوامی شاعری، نئے افکار، باغیانہ خیالات ان کے مضامین کا بیشتر حصہ ہیں جو حقیقتاً شاعر کے گہرے احساسات اور بہادرانہ خیالات کا آئینہ دار ہیں۔

ایران کے روایت شکن اور تجدد طلب شاعرات کی فہرست میں پروین اعتصامی اور (مرضیہ احمدی اسکوئی ..... [2] وغیرہ نے اپنے انقلابی افکار سے مسلح جنگ لڑی ہے اور مدد کی ہے اور ان انقلابی شاعری سے ایک مزید انقلاب برپا کیا ہے۔ یہاں مرضیہ کی ایک نظم موازنہ اور مطابقت کے طور پر پیش ہے:۔

---

[1] در کوچہ ہائی سرخ شفق، گزینہ شعر امروز، شورائی فرہنگی پوہنتون کابل، ۱۳۶۰ ہجری ص ۱۲۹-۱۳۰

[2] مرضیہ اسکوئی ۱۳۲۴/۱۹۴۵ء سریز کے نزدیک اس کو میں پیدا ہو کر ۱۳۵۳/۱۹۷۴ء میں ایران کے گوریلا دستوں کے دوش بدوش مسلحانہ جنگ کرتی ہوئی تہران میں شہید ہو گئی۔ د مرضیہ احمدی اسکوئی خاطرات یک رفیق، انتشارات نگاہ۔ تہران ص ۴-۹

گوش کن !
صدائی ضربہ ہائی قلب کارخانہ است
کہ خون رفیق کارگر
حتی بگاہ شب
در تسمہ ہائی چرخ
رگ ہائی خشک آن ۔
در جستجوئی نان
باشتاب می درد ۔
تا "فاتحان" نابکار قصر
ہمولدہ" قصرہا" بپا کنند..... (۳)

....

مرضیہ کے انقلابی احساسات مزدوروں اور کامگاروں کے درد اور رنج سے بھرپور ہیں اور انھوں نے طاقت وروں کے ظلم کو افشا کیا ہے اور اُن کی مذمت کی ہے اور عوام کو اُن کے خلاف جنگ اور بغاوت پر آمادہ کیا اور ہمت دلائی ہے :۔

بہار می رسد از راہ
ہاں ۔ ای شکستہ دیوار سست نہاد!
دور نیست روزی کہ در جای
ازیں ویرانت کنیم
اکنوں ای مشت ہای گرہ کردہ
ہنگام فرد کوفتن است

۱؎ مرضیہ اسکوئی ۲۲؍۵؍۱۹۴۸ء سر۔تز کے نزدیک اسکو میں پیدا ہو کر ۱۳؍۴؍۱۹۷۳ء میں ایران کے گوریلا دستوں کے دوش بدوش مسلحانہ جنگ کرتی ہوئی تہران میں شہید ہوگئی۔ (مرضیہ احمدی اسکوئی، خاطرات یک رفیق، انتشارات نگاہ، تہران ص۳-۹

ہاں ای خلق ستم کش !
ای رنج بردہ در سالیان دراز۔
ای جوشش کینہ ہائی کہنہ
ای نہایت دردہائی نہفتہ
ای طنین سہمناک فریادہائی فرد خوردہ
قیام کن۔
زمان برخاستن است
بپاخیز
گاہِ پیکاراست
روز نیست روزیکہ علفہائی ہرزہ
این باغہائی گل را
با عفونت ریشہ ہائی شان
در زیر گام ہائی پُر قدرت خویش لگد کوب کینم ..... [1]

. . . . . .

مرضیہ نے اپنی ایک طویل نظم بعنوان (افتخار) میں اپنی باغیانہ طبیعت کی تشریح اس طرح کی ہے :

من یک زنم
زنی کہ مرادف مفہومش،
در ہیچ جای فرہنگ ننگ آلود شما وجود ندارد۔
زنی کہ در سینہ اش دلی۔
آگندہ از زخم ہائی چرکین
خشم است
زنی کہ در چشمانش

---

[1] خاطرات یک رفیق۔ مرضیہ احمدی اسکوئی، انتشارات نگاہ تہران، ص ۱۶۲ — ۱۶۴

انعکاس گل رنگ گلولہ ہائی آزادی
موج می زند
زنی کہ دستانش را کار
برائ گرفتن سلاح پرورده است .... [1]

باب ۶

ارزیابی و نتیجہ گیری

اس آخری حصہ میں اس سے قبل کہ میں اصل بات بیان کروں میں نے یہ لازمی جانا کہ میں چند منتشر سطریں اُن مشکلات کے بارہ میں لکھ دوں جو اس کتاب کی تکمیل میں درپیش تھیں۔

تقریباً چھ سال کی طویل مدت میرے اس مقالہ کے مکمل کرنے میں صرف ہوئی اور سرفہرست مسئلہ یہ تھا کہ یہاں اس موضوع پر کافی مواد حاصل نہیں تھا۔ اگر میں یہ کہوں کہ دہلی یا ہندستان میں معاصر دری شاعری سے متعلق مآخذ اور حوالے نہ ہونے کی حد تک تھے اور اگر مزید وضاحت کروں تو مبالغہ نہ ہوگا کہ اس سلسلہ کی کوئی کتاب دستیاب نہیں تھی ضروری مواد کا حصول انفرادی طور پر وقت اور حوصلہ دونوں کا متقاضی تھا اور حقیقت تو یہی ہے کہ غیر معمولی تاخیر کا سبب یہی تھا۔

اس مقالہ کی تیاری کے لیے صدہا کتابیں، اخبارات اور رسائل مطالعہ میں آئے اور استفادہ کے لیے تقریباً ستر (۷۰) کتابیں استعمال اور مطالعہ کا مرکز بنیں۔ یہ بحث جب کہ شروع میں صرف افغانستان میں دری شاعری کے بارے میں تھی، بعد میں میرے نگراں ڈاکٹر شعیب اعظمی کے مشورہ کے مطابق زیادہ تر اور بوقت ضرورت ایران کے معاصر شعرا کے کلام سے موازنہ کا بھی باعث بنی اور میرا خیال ہے کہ

---

[1] خاطرات یک رفیق، مرضیہ احمدی اسکوئی، انتشارات نگاہ تہران، صفحہ ۱۶۶-۱۶۴

اس بنا پر اس میں اہم، دلچسپ اور کارآمد اضافے ہوئے ہیں اور قارئین کے لیے یہ موقع فراہم ہو سکا ہے کہ دونوں ممالک افغانستان اور ایران کے شعرا کے کلام کی مطابقت اور توارد و تطابق سے ان کے سماجی احساسات اور مشترک تصورات سے آشنائی حاصل کی جا سکتی ہے۔

اس کتاب کے موضوع کی وسعت خود اپنی جگہ بعض خرابیوں اور کوتاہیوں کا باعث بنی ہے۔ باوجودیکہ تین چار سو صفحات کے قریب افغانستان کی معاصر دری شاعری سے متعلق سیاہ ہوئے ہیں لیکن اپنے کام کی ضخامت اور کمیت کے لحاظ سے، میں اپنے اس کام کو اطمینان بخش تصور کروں اور یہ کہ کتنے ہی معروف نکتہ سنج اور شاعروں کے کارناموں اور کلام کے بارے میں، کتاب کے صفحات میں کچھ لکھا نہیں جا سکا ہوگا۔ تقریباً شرمندہ ہوں۔

ادیب پیشاوری نے جو کہ "نگاہی بادبیات معاصر افغانستان نے، افغانستان کے تمام معاصر شعرا کے کلام کو محفوظ کر لیا ہے (کیوں کہ اُن کی پیدائش پشاور میں ہوئی ہے اور اُن کی تعلیم افغانستان کے دوسرے شہروں کابل، غزنہ اور ہرات میں ہوئی ہے پھر وہ مشہد اور تہران گئے ہیں) اور ایران کے سارے معاصر مصنفوں میں جناب دکتر ایرج افشار بھی (تہران سے شائع ہونے والے مجلہ گوہر شمارہ ۶۳ ص۱۹۷) اس طرح رقمطراز ہیں:۔

"در نظر نگارندہ باز اگر رجال سیاسی و ادبی بودہ اند کہ دریکی از دو کشور ما بعرصۂ وجود گذاشتہ ولی در کشور دیگر نشو و نما داشتہ، مانند سید جمال افغان و ادیب پیشاوری، بہر دو کشور تعلق دارند"

اور اس طرح ان کے افغانی ہونے میں کسی قسم کا شبہ نہیں ہے اور متاسفانہ اس کتاب میں اُن کے کلام کے بارے میں کوئی ذکر نہیں ہو سکا ہے۔

بہر حال شاعر کے کلام کا تعارف اس سے قبل ایرانی اور ہندستانی مصنفین کے ذریعہ ایرانی شعرا اور ان کے کلام کے ذکر کے سلسلہ میں مفصلاً ہو چکا ہے اور یہاں مقصد صرف ہندستان کے قارئین کو افغانستان کی معاصر دری شاعری کے تاریک گوشوں کو روشن کرنے کے بعد، واقف کرانا تھا کیونکہ متاسفانہ اس بات کا اعتراف

کرنا پڑے گا کہ اب تک ان ادب نواز دوستوں کی نظر میں یہ چیز روشن نہ ہو سکی تھی۔

دوسرے معروف شاعر جیسے پریشان داوی، لسمل، شایق آفندی، شایق ہروی، غواص، خادم۔ پیر ہرات، محمد عثمان صدقی، دستگیر پنج شیری عبداللہ بختانی، آصف فکرت، لطیف ناظمی، ناصر طہوری اور دسیوں لوگ ان تمام میں سے ہیں دوسرا سبب ہیں کیوں کہ ان کے حالات زندگی اور تصنیفات کے عدم حصول کی بنا پر ان صفحات کی زینت نہیں بن سکے اور ان سب سے معافی اور معذرت طلب کرنے کا مقام ہے۔ (۳، ۴، ۵)

کتاب کے تیسرے باب میں شعرا کی فہرست، صف بندی اور ترتیب میں بھی ان کی تصنیفات اور کلام کے حصول میں رکاوٹ بھی بڑی قابل ذکر پریشانیوں کا باعث بنی ہے اور اُن کے ناموں کو کسی قسم کے تقدم و تاخر کو بھی اُن کے شاعرانہ مرتبہ کے مطابق متعین نہیں کیا جا سکا ہے۔ اور اس بارے میں ایک حد تک اُن کی زندگی کے ایام و سال اور کارنامے ہی سند قرار پائے ہیں اور نہ کہ کوئی دوسرا عنصر۔

البتہ اس بات میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہے کہ کہیں کہیں شاعر کے کلام اور ابیات کا انتخاب اور ایک دوسرے کے کلام سے ان کا موازنہ، تردد کا باعث ہی نہیں بلکہ اشکال اور عدم تفہیم کا سبب بھی ہوا ہے۔ مثال کے طور پر مندرجہ ذیل شعرا کے درمیان ان کے برتر ہونے، مرتبہ قایم کرنے اور درجہ بندی کے سلسلہ میں بڑی دشواری پیش آئے گی خصوصاً اگر شاعر بقید حیات ہو تو یہ درجہ بندی زیادہ ہو جائے گی اور یہ بھی ممکن ہے کہ کوئی ایک شاعر دوسرے کی بہ نسبت زیادہ شہرت اور مقبولیت کا حامل ہو۔ ایسے شعرا میں ملک الشعرا قاری، مستغنی، محمود طرزی، بیتاب، خلیلی اور شایق جمال وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔ جو اپنی مہارت اور شاعرانہ صلاحیت کی بنا پر بھی اپنی اپنی جگہ ایک ناقابل تسلیم حقیقت کے مطابق اپنا اپنا مرتبہ اور مقام رکھتے ہیں۔

اشعار کی تعداد اور تحریر شدہ صفحات کی زیادتی کا فاصلہ بھی کسی شاعر کے مقام و مرتبہ کے تعین میں حائل نہیں ہے۔ اس سلسلہ میں شاعر کے پسندیدہ منتخب اشعار کی کمی اور زیادتی بھی ایک آخری نقش اور عمدہ اثر کی نشاندہی کرتی ہے۔

اس بے تناسبی کی اچھی مثال خلیلی ہیں۔ کیونکہ سالہا سال تک اچھے اشعار لکھتے

رہے ہیں۔ حکومت کی حمایت بھی حاصل رہی ہے اور اس سے مادی اور مالی منفعت دونوں ہی حاصل کرتے رہے ہیں (یعنی آرام سے پیٹھ لگا کر بیٹھے ہیں) اور اگر ہم حقیقت کی طرف سے آنکھیں نہ موند لیں تو وہ واقعتاً ایسے جلیل القدر شاعر ہیں کہ تقریباً تمام اصناف سخن اور انواع شعر پر طبع آزمائی کی ہے اور اپنی کوششوں کو خود یا دوستوں کے وسیلہ سے یا معتقدین کی اعانت سے چھپوایا ہے اور شاعری کی دنیا میں انتہائی پر ارزش اور گرانقدر منابع اور ماخذ دوسرے محققین کے لیے بکثرت فراہم کیے ہیں اور اُن کی شاعری بھی ایسی پسندیدہ اور دلچسپ ہے کہ اس کے انتخاب کی طرف سے آنکھیں بند نہیں کی جا سکتی ہیں۔ اور یہی سبب تھا کہ کتاب ہذا میں اُن کی شاعری پر زیادہ صفحات صرف ہوئے ہیں)۔

اسی طرح بالکل نئے اور تازہ شعرا کے کلام سے گفتگو کے سلسلہ میں اکثر اوقات بہت اچھے منظومے، جس میں اعلا اور عمیق معانی اور مفاہیم پنہاں ہیں، اُن کے حالات زندگی اور ادبی اور علمی کارناموں کو نظر انداز کیا گیا ہے۔ شاعرات (محبوبہ اور حاذقہ) کے بارہ میں تیسرے باب میں اُن کے آثار کے حصول کے بارے میں، اور اس لیے کہ شاعرات کے حق کا بھی قایل ہونا چاہیئے، تاکہ وہ اپنی صنف کے لوگوں کی نمایندگی کر سکیں، صرف ایک ایک غزل پر ہی اکتفا کی گئی ہے اور یہ صرف اس ضرب المثل کے مصداق ہے جسے ہم "مشتے از خروار" کہتے ہیں۔

بہر حال ہمارے عصری شاعر کا احساس اس کے ماحول کے مختلف حالات اور کیفیات کا سرچشمہ ہوتا ہے اور وہیں سے وہ کیف و رنگ لیتا ہے۔ جب وہ فارغ البالی اور خوشحالی سے سرشار ہوتا ہے تو خوشی اور نشاط کے نغمے الاپتا ہے اور معشوق و شراب اور چنگ و رباب کا ذکر چھیڑتا ہے:

کی لاف علم و دانش و فرہنگ میزنم — مستم سخن ز بادۂ گل رنگ میزنم (نوید)

اور یا پھر بہار کی طرب زا ہوا سے مست ہو کر چمن کی طرف روانہ ہو جاتا ہے:-

بار دگر فصل بہاراں رسید — موسم سرو و گل و ریحاں رسید

غنچۂ من ای دلک تنگ من، باز شو

رو بچمن نالۂ بلبل شنو (صفا)

اور یا پھر اپنے عشق کا اعتراف کرتا ہے :۔

عشق سرکش در ضمیر ما اگر ننهاده دام　　دل چرا در سینه خود را چو بسمل می زند

(دہقاں)

لیکن ایک وقت اس کا حوصلہ پست ہو جاتا ہے اور زندگی اس پر بوجھ بن جاتی ہے :۔

چرا امشب دلم تنگ است
چرا لب هایم از جام شراب خنده بیرنگ ست
چرا امشب جهان در چشم من زشت است زیبا نیست
دلم را شور فردا نیست ..... (روئیں)

اور جب اس پر محرومی کا احساس غالب آجاتا ہے:

من شاعرم ولی غزلم خفته در گلو
چون موج رود، رفته به اعماق رودبار
یا چون شراب کهنه، نهان مانده در سبو
دیوانه وار جوشم و بر خود زنم شرار .....

(الہام)

شاعر جس وقت اپنے عزیز وطن کی یاد کرتا ہے اور جب اسے امن وامان اور مرفہ الحالی کا دور دورہ نظر آتا ہے تو اس کی طرف اس طرح کرتا ہے :

وطنم ! ای وطن خوشگل و خوش آب و هوا
ای که هر چیز پسندیده ترا داده خدا
لاله و نسترن و سنبل و ریحان تو خوب
کوچه و برزن و صحرا و بیابان تو خوب

(شایق جمال)

اپنے وطن سے عشق کو یوں ظاہر کرتا ہے :۔

ای میهنم ! ای میهنم !

ای عشق بی ہمتائی من
ای گوہر یکتائی من
بادا فدایت جان و تن ...

(فضل حق فطرت)

اور جس وقت تاریخی عظمت اور فخر کی یاد آجاتی ہے تو گذشتہ نشانیوں پر حسرت کرتا ہے:۔

ای غزنہ، ای خرابۂ خاموش و بی صدا
ای کشتی شکستہ دریائی روزگار
آیا کجا شدند
آں جنگاوراں
آں ہائی و ہوگراں ....

(لایق)

اور جب وطن کو فلاکت اور بربادی سے دوچار پاتا ہے تو اس طرح فریاد کرتا ہے:۔

گردیدہ وطن غرق اندوہ و محن وائی ای وائی وطن وائی
پژمردہ شد این باغ و گل و سرو سمن وائی ای وائی وطن وائی ....

(خلیلی)

اسی طرح شاعر جب اپنے وطن کو پسماندہ دیکھتا ہے اور کوئی علاج اس کی سمجھ میں نہیں آتا ہے تو وہ درگاہ خداوندی میں اس طرح روتا اور گڑگڑاتا ہے:۔

بار خدایا ببیں حال ما وین گزر عمر مہ و سال ما
عمر بسی رفت و بخوابیم ما در بدر و خانہ خرابیم ما
قافلہ شد، واپسی ما ببیں
ای کس ما بی کسی ما ببیں

(قاری زادہ)

یا یہ کہ وطن کے نوجوانوں کی سماجی پسماندگی کا مشاہدہ کر کے نوجوانوں کو مخاطب کرتا ہے:۔

ای جوانان وطن فی وقت خواب وغفلت است
موسم بیداری و مردانگی وغیرت است
ماکہ افغانیم ما را ننگ افغانی سزد
زانکہ بی ننگی بہ افغان بی نہایت خجلت است
(محمود طرزی)

افغانی شاعر اپنی نفرت اور خشونت کو غیروں کے تسلط پر اس طرح ظاہر کرتا ہے:۔

از آں قصر گور کہن بہتر است — کہ در اختیار کس دیگر است
بزنداں تاریک .بردن بسر — بہ از شہر محکوم قوم دگر۔۔
(خلیل)

آخر کار خود اپنے اشعار میں انقلاب و تغیر کا خواہش مند ہوتا ہے اور وقت اور سماج کے تقاضوں کے مطابق شعر کہتا ہے:۔

حیف است وصف آں لب ہچوں شکر کنوں — حاصل ازیں نہال نگردد ثمر کنوں
راہی کہ سپر شدہ چندیں ہزار بار — راہ دگر بگیر وازاں درگزر کنوں
بگذشت و رفت قصہ ماضی دگر مگوئی — مستقبل است وحال زماں معتبر کنوں
(مستغنی)

مگو ز سبک خراساں و ہند و طرز عراق — مپیچ در پی تجنیس و صنعت ایہام
بمقتضی زماں شعر را دگر گوں ساز — مباش پیرو اشعار انوری و خیام
(مائل ہردی)

آخر میں مجھے عرض کرنا چاہیئے کہ اگرچہ جیسا کہ ہے بھی کہ کتاب میں کچھ نقائص بھی ہوں گے۔ جن کا سبب موضوع کی وسعت اور کافی مواد کا حاصل نہ ہونا ہے اور ضرورت کے مطابق مناسب چیزوں کا یکجا کر نہ سکنا ہے لیکن اس قسم کی خامیوں سے بیشتر مقالے دوچار ہوتے ہیں اور اگر قارئین کرام اس بات کو بھی مدِ نظر رکھتے ہیں تو یقیناً یہ ایک طبیعی امر ہے۔
بہر حال اس موقع کو غنیمت جانتے ہوئے میں ایک بار پھر اپنے

استادوں اور دوستوں کا، جنھوں نے مواد کی فراہمی میں راہنمائی اور مدد فرمائی ہے اور اس کی تکمیل میں ہمت افزائی اور بے تکلف اعانت کی ہے تہ دل سے بے حد سپاس گزار اور ممنون و مشکور ہوں۔

میں اس کتاب کے آخر میں اس کی تکمیل پر اپنا منظوم قطعہ تاریخ بھی ہدیۂ ناظرین کر رہا ہوں:

بعد شش سال رنج و محنت با تلاش و پشت کار
خواب و آسایش بر فتم تا شد انجام این مقال
چوں بنودی مرجع و منبع بہر کار من
زاں بطول افتاد و باشد پاسخی بر این سوال
خوشہ چیں خرمن اشعار معاصر شدم
زاں دری گویاں بیاوردم دُرِ ہا بی مثال
از دیار شاعراں نامدار افغانستان
زآنکہ بودش حنظلہ و فرخی ملا جلال
فخر امروزش خلیلی۔ بارق و لایق بوند
واصف و روئیں، حبیب و ہم خلیل با کمال
ہر چہ بر دستم رسید از گلستان شعر شان
انتخابش گشت مرقوم بی درنگ و بی ملال
جستمش تاریخ در پایاں و یافتم این چنیں
از صفر دوم، یک ہزار و چار صد و پنج بود سال

(دوم ماہ صفر المظفر ۱۴۰۵ ہجری قمری)

لعل زاد۔ نئی دہلی۔ ہندوستان

ہماری مطبوعات

کتاب	مصنف / مترجم	قیمت
آندھی میں چراغ (دوسری طباعت)	خواجہ غلام السیدین	73/=
ابوالکلام آزاد۔ شخصیت، سیاست اور پیغام	پروفیسر رشید الدین خاں	21/=
ابوالکلام آزاد۔ ایک ہمہ گیر شخصیت	پروفیسر رشید الدین خاں	58/=
اتر پردیش کے لوک گیت	اظہر علی فاروقی	120/=
ارتقاء کائنات اور انسان و دیگر مضامین	پروفیسر بی شیخ علی	94/=
اردو ادب کی تنقیدی تاریخ (دوسری طباعت)	احتشام حسین	70/=
اردو ادب کی سماجیاتی تاریخ	پروفیسر محمد حسن	98/=
اردو ڈراموں کا انتخاب	پروفیسر محمد حسن	156/=
اردو ریڈیو اور ٹیلی ویژن میں ترسیل و ابلاغ کی زبان	ڈاکٹر کمال احمد صدیقی	200/=
اردو کے ابتدائی ادبی معرکے (ابتدا سے عہد مرزا و میر تک)	ڈاکٹر محمد یعقوب عامر	22/=
اردو کے ادبی معرکے (انشاء سے غالب تک) ترمیم و اضافے کے ساتھ (دوسرا ایڈیشن)	ڈاکٹر محمد یعقوب عامر	30/=
اردو کی کہانی (دوسری طباعت)	احتشام حسین	21/=
اردو لغت نویسی کا تنقیدی جائزہ	ڈاکٹر مسعود ہاشمی	30/=
ارنیسٹ ہیمنگوے (حیات و فن کا تنقیدی مطالعہ) (دوسری طباعت)	ڈاکٹر سلامت اللہ خاں	8/40
امریکی ادب کا مختصر جائزہ (دوسری طباعت)	ڈاکٹر سلامت اللہ خاں	52/=

انتخاب غزلیات میر	ڈاکٹر حامدی کاشمیری	15/=
انتخاب کلام حسرت	ڈاکٹر فضل امام	9/=
انشاکاترکی روزنامچہ	سید محمد نعیم الدین	4/50
انیس کے سلام	علی جواد زیدی	60/=
انیس کے مرثیے اوّل (دوسری طباعت)	صالحہ عابد حسین	36/=
انیس کے مرثیے دوم (دوسری طباعت)	صالحہ عابد حسین	40/=
برنارڈ شا	عبدالمغنی	35/=
بہار میں اردو زبان و ادب کا ارتقاء	پروفیسر اختر اورینوی	18/=
بیسویں صدی میں اردو ناول	ڈاکٹر یوسف سرمست	58/=
پشکن (دوسری طباعت)	ظ۔انصاری	60/=
پھول بن (دوسری طباعت)	ابن نشاطی	52/=
تاریخ ادب اردو (جلد اوّل)	پروفیسر سیدہ جعفر، پروفیسر گیان چند جین	170/=
تاریخ ادب اردو (جلد دوم)	// // // //	170/=
تاریخ ادب اردو (جلد سوم)	// // // //	170/=
تاریخ ادب اردو (جلد چہارم)	// // // //	170/=
تاریخ ادب اردو (جلد پنجم)	// // // //	170/=
تذکرہ علمائے بلخ	صفی الدین واعظ / پروفیسر نذیر احمد	12/=
تالستائے (دوسری طباعت)	ڈاکٹر محمد یٰسین	46/=
تامل ناڈو میں اردو	علیم صبا نویدی	135/=
جنت سنگار	پروفیسر سیدہ جعفر	180/=
جوش ملیح آبادی شخصیت اور فن (دوسری طباعت)	ظفر محمود	38/=
چکبست	رام لال نابھوی	18/=

بے خف (دوسری طباعت)	ظ۔انصاری	10/=
حیات جاوید (چوتھی طباعت)	الطاف حسین حالی	167/=
حیدرآباد کے اردو روزناموں کی ادبی خدمات	سید ممتاز مہدی	92/=
خسرو شناسی (دوسری طباعت)	ظ۔انصاری / ابوالفیض سحر	24/=
دانتے	زیڈ۔اے۔عثمانی	8/25
دستنبو	غالب / پروفیسر خواجہ احمد فاروقی	12/=
درس بلاغت (تیسری طباعت)	قومی اردو کونسل	47/=
قدیم اردو نظم (حصہ اول)	ڈاکٹر فہمیدہ بیگم	40/=
دکن میں اردو	پروفیسر نصیر الدین ہاشمی	42/=
دکنی ہندی اور اردو	پروفیسر نصیر الدین ہاشمی	15/50
دکنی نثر کا انتخاب	پروفیسر سیدہ جعفر	45/=
دکن میں مرثیہ اور اعزاداری	ڈاکٹر رشید موسوی	17/=
دیوان آبرو	پروفیسر محمد حسن	25/=
دیوان حسرت عظیم آبادی (دوسری طباعت)	ڈاکٹر اسماء سعیدی	100/=
ڈاکٹر ذبیح اللہ صفا حیات اور کارنامے	ڈاکٹر کبیر احمد جائسی	12/=
ڈاکٹر ذاکر حسین شخصیت اور معمار	مرتبہ: ڈاکٹر فہمیدہ بیگم	70/=
ذوق و جستجو	پروفیسر خواجہ احمد فاروقی	34/=
رہبر اخبار نویسی	سید اقبال قادری	62/=
رباعیات انیس	مرتبہ: علی جواد زیدی	85/=
زندگانی بے نظیر	سید محمد عبدالغفور شہباز / سید محمد حسنین	19/=
سب رس کے حروف (صرفی مطالعہ)	آصفہ بیگم	9/50
سخنوران گجرات	سید ظہیر الدین مدنی	17/=
سیر کہسار (جلد اوّل)	پنڈت رتن ناتھ سرشار	167/=